ڈاکٹر امرت لعل عشرت

سلسلۂ مصحفی کے

سخنورانِ بنارس

ترتیب و پیش کش: ڈاکٹر عبدالسلام

© جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ

نام کتاب : سلسلۂ مصحفی کے سخنورانِ بنارس
مصنف : ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ
ترتیب و پیش کش : ڈاکٹر عبدالسلام
سال اشاعت : ۲۰۱۵ء
ناشر : دیپک مدھوک
چیئرمین، سنبیم اسکول، بھگوان پور، وارانسی
قیمت : 600/- روپے

Dr. Amrit Lal Ishrat

(1930-1989)

Deesh Ishrat Madhok

(1933-2003)

Mr. Deepak Madhok & Mrs. Bharti Madhok

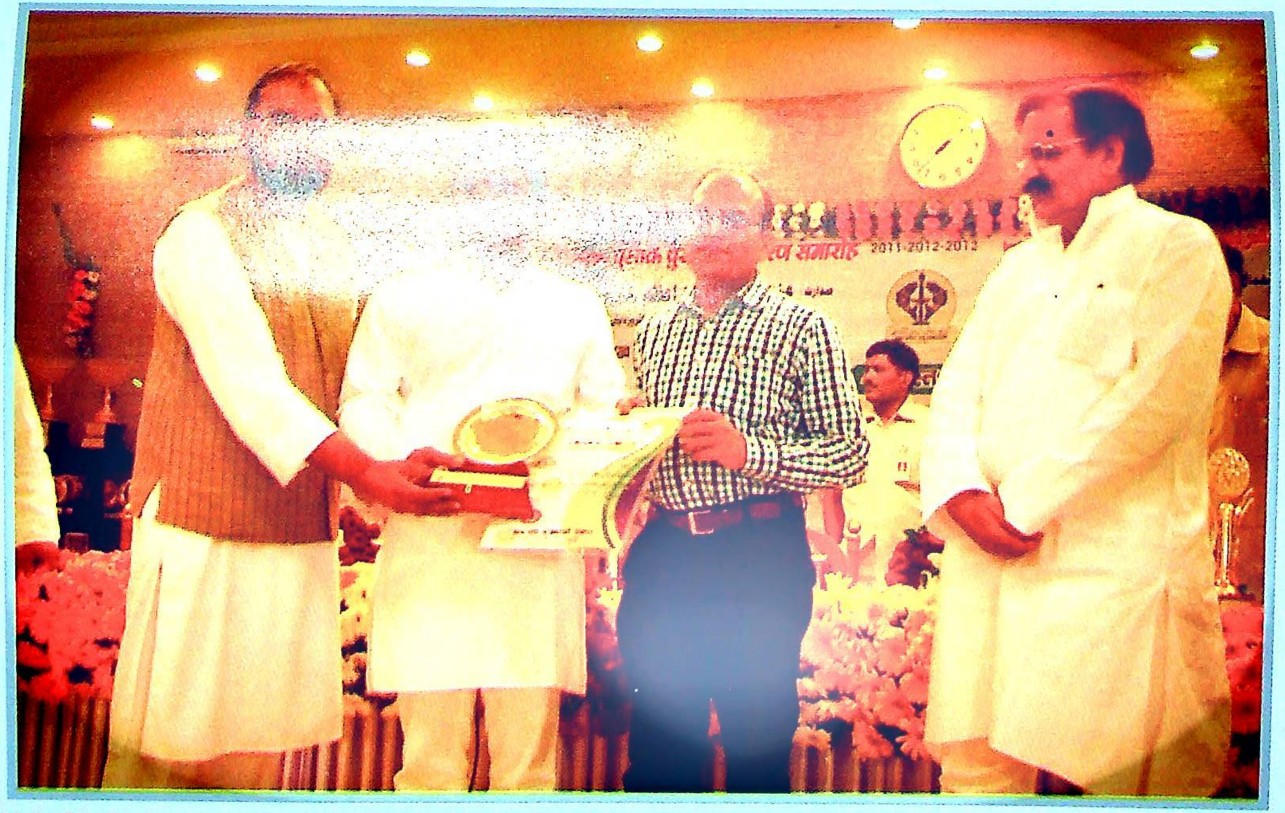

Mr. Akhilesh Yadav, Hon'ble Chief Minister, Uttar Pradesh giving Urdu Academy Award - 2013 to
Dr. Abdus Salam on his book **"Prof. Amrit Lal Ishrat : Ahwal-o-Aasar"**,
Left : **Dr. Nawaz Deobandi**, Chairman, Uttar Pradesh Urdu Academy,
Right : **Mr. Mahboob Ali**, Cabinet Minister of Secondary Education, Uttar Pradesh.

MESSAGE

Dr. Amrit Lal Ishrat was an elite poet of Urdu and eminent scholar of Urdu and Persian literatures. He was also a good scholar of History. His predecessors had much interest in Urdu Sher-o-Shairi and music. His father, Govardhan Lal Madhok, was an advocate of the Lahore High Court. He had interest in music and stage events. He used to perform stage programmes and concerts and thus gained popularity. He settled with his family in Simla after partition of India.

Dr. Ishrat spent his childhood in Lahore. He had interest in music and culture from the beginning. He had the talent of playing many musical instruments. He always left the audience spell bound with his sweet and soft voice. He was enterprising, daring and realistic. He was a lover of humanity untouched by the distinctions of religion and caste. He himself was an epitome of the famous "Ganga-Jamuni" culture of Kashi. He had immense love with nature. He lived in a beautiful valley of Nalagarh (Himachal Pradesh). He also lived at Kandaghat in Simla where the view of Chail Valley was very charming. He spent many hours there in discussions about literature and "Sher-o-Shairi". Mahfils of "Sher-o-Shairi" were often held in his house. He migrated to Varanasi, the capital of knowledge and wisdom and worked as Professor and Head of the Department of Persian in the Banaras Hindu University.

He composed Urdu poems and Ghazals. His Ghazals are filled with romance and colourful enjoyment of Jam-o-Meena but it possesses piousness and reality of life. His poems describe the beauty of nature. His language of poem is simple and easy to understand. Dr. Abdus Salam compiled his Ghazals and poems in the book entitled "Yadgar-E-Ishrat" in Urdu, which was also transcripted in Hindi.

Dr. Ishrat authored, compiled and edited many books in Urdu. The books "Iran Sadiyon Ke Aine Mein", "Sukhanwaran-E-Banaras", "Urdu Shairi Aur Punjab", "Mirza Ghalib" etc. are the famous one. He presented also a number of articles, papers, essays and lectures. Dr. Abdus Salam played an inevitable role in their compilation under the book entitled "Maqalat-e-Ishrat".

Besides above Dr. Ishrat laid down the foundation of Sunbeam English School in Varanasi which has now become a revolution in education sector for the Eastern Uttar Pradesh. The literary and educational vision of this poet of harmony has now been realized by the Sunbeam Group of Institutions with 25000 students, 4000 staff members and 21 Sunbeam Schools in Uttar Pradesh.

Dr. Salam completed his research work which is centered around Dr. Ishrat's Life and literary work. In this connection he authored a book entitled "Professor Amrit Lal Ishrat: Ahwal-O-Aasar" which received prestigious award of Uttar Pradesh Urdu Academy in 2014. This is a beautiful outcome of Dr. Salam's devoted research relentless efforts.

"Sukhanwaran-E-Banaras" is a unique book of Dr. Amrit Lal Ishrat that describes the life style and fame of the shayars of Banaras. Dr. Salam also beautifully transcipted it in Hindi along with glossary which was published in 2003 under the title of "Kashi ke Shayar". The Urdu book "Sukhanwaran-E-Banaras" has become now a rare available book. The Urdu knowing persons are keenly demanding it and, as such, we decided to publish its second edition. I have indeed a proud privilege to be the son such an eminent scholar of Urdu and Persian. I had been very dear to him till his last breath. I feel proud of this book "Sukhanwaran-E-Banaras" and dedicate it to my beloved father.

It is very interesting to state here that a part of his legacy as a poet and writer has been passed on to his grandson, Karan Madhok, who has a love for writing.

I am thankful to Dr. Abdus Salam for his unconditional efforts and support in editing this book. It has no doubt that this book will be accepted by the Urdu world particularly in reference to Banaras.

Deepak Madhok

15.10.2015

فہرست

۱۔ مقدمہ ڈاکٹر عبدالسلام ۱ - ۲۴
۲۔ تعارف علیم مسرورؔ ۲۵ - ۳۰
۳۔ عرض حال ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ ۳۱ - ۳۲
۴۔ ذاکرؔ بنارسی ۳۳ - ۴۷
۵۔ فائزؔ بنارسی ۴۸ - ۹۱
۶۔ محشرؔ بنارسی ۹۲ - ۱۲۲
۷۔ غنیؔ بنارسی ۱۲۳ - ۱۵۳
۸۔ بیتابؔ بنارسی ۱۵۴ - ۱۸۲
۹۔ فرخؔ بنارسی ۱۸۳ - ۲۰۸
۱۰۔ آفاقؔ بنارسی ۲۰۹ - ۲۲۴
۱۱۔ ریاضؔ بنارسی ۲۲۵ - ۲۳۴
۱۲۔ اسدؔ بنارسی ۲۳۵ - ۲۴۱
۱۳۔ طاہر بخش طاہرؔ ۲۴۲ - ۲۴۶
۱۴۔ نذیرؔ بنارسی ۲۴۷ - ۲۹۱

۱۵- حفیظ بنارسی ۲۹۲ - ۳۱۱
۱۶- ''بھولے بسرے لوگ'' ۳۱۲
۱۷- کلیم بنارسی ۳۱۲ - ۳۱۳
۱۸- سعید بنارسی ۳۱۳ - ۳۱۵
۱۹- خلیل الدین حسن طاہر بنارسی ۳۱۵ - ۳۲۱
۲۰- شوق بنارسی ۳۲۱ - ۳۲۴
۲۱- ناصر بنارسی ۳۲۵ - ۳۲۸
۲۲- ساجد بنارسی ۳۲۸ - ۳۳۱
۲۳- جمیل بنارسی ۳۳۱ - ۳۳۲
۲۴- افسوں بنارسی ۳۳۲ - ۳۳۴
۲۵- قضا بنارسی ۳۳۴ - ۳۳۵
۲۶- کامل بنارسی ۳۳۵ - ۳۳۶
۲۷- کوکب بنارسی ۳۳۶ - ۳۳۸
۲۸- اقبال بنارسی ۳۳۹ - ۳۴۰
۲۹- علیم مسرور ۳۴۱ - ۳۶۹
۳۰- مسلم الحریری ۳۷۰ - ۳۷۸
۳۱- جوہر صدیقی ۳۷۹ - ۳۹۸

مقدمہ

بنارس کا ادبی ماحول ہمیشہ سے خوشگوار رہا ہے۔ یہاں پر ایک سے بڑھ کر ایک شاعر و ادیب پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے ادب کے چمنستان کو گلزار کیا ہے۔ اس کا شمار دنیا کے قدیم ترین شہروں میں کیا جاتا ہے۔ یہ ہلالی شکل میں گنگا ندی کے کنارے بسا ہوا ہے۔ دو مقامی ندیوں برنا اور اسّی کے درمیان آباد ہونے کی وجہ سے اس کا نام وارانسی پڑا۔ رگ وید میں اسے کاسی یا کاشی (یعنی درخشاں یا روشن) کہا گیا ہے۔ یہ علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ ہندوؤں کی مقدس تیرتھ گاہ ہے۔ یہاں مرنے پر ان کو "موکچھ" یعنی نجات حاصل ہوتی ہے اور ان کے سبھی گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ مہاتما بدھ نے بنارس میں اپنے مذہب کی پہلی تعلیم بہم پہنچائی چنانچہ بودھوں کے لیے یہ شہر بہت متبرک ہے۔ جین مذہب کے لیے بھی یہ شہر مقدس مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ شہر عہد قدیم میں سنسکرت اور ویدک علوم کا مرکز رہا ہے۔ بدھ، شنکر، جین تیرتھنکر اور سنتوں کے علاوہ مختلف رشیوں، منیوں اور صوفیوں نے اس شہر کا نام روشن کیا ہے۔ کبیر، تلسی، روی داس، بھارتیندو ہریش چندر، منشی پریم چند، جے شنکر پرساد، ہزاری پرساد دویدی، پنڈت روی شنکر، گرجا دیوی، بسم اللہ خاں جیسی باکمال شخصیتیں اسی شہر سے وابستہ ہیں۔ علم جراحی کے بانی سوسرت کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے۔ شاہجہاں کے بڑے بیٹے داراشکوہ نے یہاں کئی برس تک پنڈتوں سے علم حاصل کیا اور سب سے پہلے ہندوؤں کی مذہبی کتاب اُپنشد کا فارسی ترجمہ ‘سرِ اکبر’ کے نام سے کیا۔ بنارس کو سبھی علوم کی راجدھانی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ بنارس عربی، فارسی، اردو اور اسلامی علوم میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا ہے۔ یہاں

اس سلسلہ کے مختلف معیاری تعلیمی ادارے موجود ہیں۔ دہلی کے چند شاہزادگان خصوصاً شہزادہ جواں بخت، جہاں دار شاہ لکھنؤ ہوتے ہوئے بنارس پہنچے اور لکھنؤ کے نواب سعادت علی خاں نے کچھ عرصہ تک اس شہر میں قیام کیا چنانچہ دہلی و لکھنؤ کے نامور شعرا بنارس میں مقیم ہو گئے اور شعر و سخن کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں۔ ۱۷۸۱ء میں نواب ابراہیم خان بنارس کے حاکم عدالت دیوانی مقرر ہوئے۔ انھوں نے اردو شعرا کا ایک تذکرہ ''گلزار ابراہیم'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ جس میں بنارس کے متعدد شعرا کا ذکر ہے۔ ذوالفقار علی مستؔ نے ''تذکرہ ریاض الوفاق'' مرتب کیا۔ اس تذکرہ میں بنارس کے علاوہ کلکتہ کے شعرا کے حالات بھی درج ہیں۔ نواب علی ابراہیم کے پوتے نواب عنایت حسین خاں مجہورؔ بنارسی نے ''مداح الشعرا'' کی تصنیف کی۔ اس تذکرہ میں ان شعرا کے حالات جمع کیے گئے ہیں جو بنارس کے قدیم باشندے تھے یا ان کا تعلق بنارس سے تھا۔ مجہورؔ بنارسی اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ رام جس محیطؔ سے ان کا تلمذ تھا۔ بنارس کے تعلق سے اردو و فارسی کے شاعروں اور ادیبوں کی ایک لمبی فہرست موجود ہے۔ منشی پریم چند، آغا حشرؔ کاشمیری، ذاکرؔ بنارسی، فائزؔ بنارسی، محشرؔ بنارسی، امرت لعل عشرتؔ، نذیرؔ بنارسی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

بنارس میں کچھ ایسی کشش ہے کہ جو یہاں آیا وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا اور اگر واپس گیا تو دوبارہ آنے کی چاہت لے کر گیا۔ نادر شاہی حملوں سے تنگ آ کر بہت سے لوگ ایران سے ہندوستان بھاگ آئے۔ شیخ علی حزیںؔ اصفہانی بھی ایران سے چل کر ملتان، لاہور وغیرہ ہوتے ہوئے ۱۷۳۴ء میں بنارس آئے اور اسی مقام پر آخری قیام کیا۔ یہ شہر انھیں اتنا پسند آیا کہ وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان سے منسوب یہ شعر ہر خاص و عام کی زبان پر ہے:۔

از بنارس نروم معبد عام است این جا
ہر برہمن پسر لچھمن و رام است این جا

حزیںؔ نے بنارس کی خوبیوں کا بیان کچھ اس طرح کیا ہے۔

پری رخان بنارس ہزار رنگا رنگ
پئے پرستش مہدیو چوں کنند آہنگ
بہ گنگ غسل کنند و بہ سنگ پا مالند
زہے شرافت سنگ و زہے لطافت گنگ

حامدؔ مَراغہ اِی آزربائیجانی نے بنارس اور شیخ علی حزیںؔ کی تعریف میں ۲۳؍اشعار پر مشتمل فارسی میں ایک نظم لکھی ہے۔ یہ نظم کلیات حامدؔ سے اخذ کی گئی ہے جو بنارس ہندو یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری میں موجود ہے۔ اس کے اشعار ذیل میں نقل کیے جارہے ہیں:-

سوادِ اعظمِ شہرِ بنارس گشت نورانی
چو در ہندوستان از مصر آمد ماہِ کنعانی
بجا باشد اگر اہلِ عجم برذات تو زند
کہ فخرِ اہلِ شیرازی و رشکِ اہلِ ایرانی
نداری چون نظیرِ خویشتن در خَلق و در خِلقت
ازیں باعث بہ عالم، گشتہ ای محسودِ اقرانی
مدیحِ ذاتِ تو تا از سرِ اخلاصِ بنگارد
قلم زین رُو گذارد، برورق ہر لحظہ پیشانی
نظیرت نیست ممکن ہیچ گہ در عالمِ امکان
گمر در آئینہ پیدا شود شخصِ تُرا ثانی
بلاغت را تویی جامع، صناعت را تویی صانع
سخن سنجی، سخن فہمی، سخن گویی، سخندانی

بِدانسان کرده ای بر صفحۂ کاغذ گہر ریزی
کہ گشتہ منفعل از رشحِ کِلکت ابر نیسانی
نہ اشعارِ بلندِ تو اگر بر تُربتش خوانند
عجب نبود کہ احسنت بگوید روحِ قاآنی
چو از راہ محبت کردہ حامد مدحِ اوصافت
شدی محمودِ حامد ہم شدی ممدوحِ انسانی
محبت ہای قلبی را بیان کردن عبث باشد
خدا می داند و من دانم و تو نیز می دانی
کجا جمیعتِ خاطر کو در فکرِ سخن باشم
سر و کارم فتادہ ہمچو گیسو با پریشانی
نگردد منقطع تا روزِ محشر رشتۂ الفت
کہ دارم با تو از روزِ ازل پیوندِ روحانی
صفا کن خانۂ دل راز تسویلات شیطانی
کہ تا منزل گہ جانان شود آن گہ بآسانی
بہ نور شمع ایماں، خانۂ دل را منور کن
نہ این کہ تیرہ سازی از ریا چون شامِ ظلمانی
توانی داغ بر دل نہِ اگر جنت طمع داری
چرا بیہودہ داغی می نہی زاہد بہ پیشانی
نہ تقلیدِ عرب از خدعہ خلق خویش می درّی
نمی داری مگر ترس از خدا شرم از مُسلمانی
بہ این زہد و ریا اینقدر مغرور نتوان شد
چو شیطان در قیامت می بَری آخر پشیمانی
چو سازی در عبادت مردمان را با خدا انباز
شوی کافر ترا باقی نہ دین ماند نہ ایمانی
اگر اللہ می گویی پی فسق از چہ می پویی
مگر اللہ را در ہر کجا حاضر نمی دانی
پی تہذیبِ اخلاق است نازل گشتنِ قرآن
تعمق گر کنی یابی ز مرموز است فُرقانی

بظاہر می نمایی خویش را چونِ میش قربانی   بہ باطن ہمچو گرگی از پی مالِ کسان خُوردن
شوی انسان اگر نوشی دو ساغر راح روحانی   نداری آدمیت زاہد! خود را مخوان آدم

بہ رندی شہرہ بودن از ریا خوشتر بُود حامدؔ
کہ این زہد ریایی را بہ زاہد دار، ارزانی

ملاّ محمد سابقؔ بنارسی (۱۷۲۰-۱۸۱۰ء) شیخ علی حزیںؔ کے اچھے دوست تھے۔ وہ ۱۷۵۵ء کے آس پاس بنارس کے کتوا پورہ محلّہ میں آباد ہوئے۔ فارسی کے شاعر اور عالم تھے۔ انھوں نے فارسی میں ایک مثنوی ''تاثیرِ عشق'' کے نام سے لکھی ہے۔ بنارس کی توصیف میں لکھے گئے۔ اس کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:-

چہ شہر آں کہ از حسن سر انجام   ز لطفِ حق بنارس یافتہ نام
چہ شہر انتخاب ہفت کشور   ز روم و مصر بردہ رونق و فر
ہوایش قوتِ روح و مایۂ جاں   خریدارش بجاں حرانس و جاں
چو از آبِ لطیفش آگہی یافت   خضر از آب حیواں روئے برتافت
بہ شہر سویش چو جنت باغ دلکش   کہ داد از خرمی غم دیدہ را بخش
بہ ہر سویش بسی گلہائے الوان   ندیدہ مثلش اندر خواب رضوان
اگر چہ مائل روئے زمیں است   بہ معنی بہ از فردوسِ بریں است
بہ وصفِ قصرہائے سربلندش   سخن را نا رسا گردد کمندش

منشی متھن لال آفریںؔ الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ مہاراجہ بلونت سنگھ کے علاقہ میں منشی کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے بیٹے کاشی پرساد کی موت جوانی میں ہوگئی۔ جس کا گہرا اثر ان پر پڑا۔ وہ بنارس چلے آئے اور یہاں لالہ دیوی پرساد ساکن محلّہ کبیر چورا کے ساتھ رہنے لگے۔ دونوں میں بہت دوستی ہوگئی۔ کتاب ''کاشی استوتی'' انھوں نے اپنے بیٹے کی یاد میں لکھی

ہے۔ یہ اس کا تاریخی نام بھی ہے۔ یہ ۱۱۹۲ھ فصلی میں مکمل ہوئی۔ بنارس کی توصیف میں لکھے گئے چند اشعار کچھ اس طرح ہیں:۔

نہ دید استی اگر شہر بنارس   بہ سیر ایں چنیں رنگیں بنارس
برِ اہل ہنر زین وصف کاشی   گہر ہا سفتہ ام از خوش تلاشی

یہ مثنوی آج سے تقریباً دوسو برس پہلے کے بنارس کے حالات سے ہمیں واقف کراتی ہے۔ اس طرح یہ بنارس کا ایک تاریخی دستاویز ہے۔ بنارس تنگ گلیوں کا شہر ہے۔ ذیل کے شعر میں دیکھیے اسے کس طرح بیان کیا گیا ہے۔

بود از خویشتن آسان گذشتن   ولی از کوچہ اش نتوان گذشتن

یعنی اپنے آپ سے گزر جانا آسان ہے لیکن اس کی گلیوں سے گزرنا ممکن نہیں۔

رام جس محیطؔ کے آباؤ اجداد کا وطن لاہور تھا۔ ان کے والد لالہ گنگا بشن عاجز روزگار کی تلاش میں دلی آئے۔ یہاں رام جس پیدا ہوے۔ ان کو روزگار کی فکر ستانے لگی۔ یہ دور ۱۱۸۰-۱۱۷۰ھ کا تھا۔ رام جس لکھنؤ گئے اور بعد میں بنارس آ گئے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی دور کی شاعری میں اپنا تخلص مغمومؔ رکھا۔ وہ صاحب دیوان شاعر تھے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے گائکواڑ لائبریری کے لالہ سری رام کلیکشن میں ان کا دیوان غیر مرتب حالت میں محفوظ ہے۔ اس میں ان کی غزلیں، رباعیات اور واسوخت موجود ہیں۔ انھوں نے حبّ المحیط کے عنوان سے ۶۶/اشعار کی ایک نظم غزل کی شکل میں لکھی ہے جس کا تعلق بنارس سے ہے۔ اس کی ردیف بھی ''بنارس'' ہے۔ ذیل میں اس نظم کے کچھ اشعار لکھے جا رہے ہیں:۔

ہیں جتنے اب سخن دانِ بنارس   وہ دل سے ہیں ثنا خوان بنارس
نہ ہوں کیوں کر میں حیرانِ بنارس   کہ حیرت دہ ہیں خوبان بنارس
نہیں گلزار دنیا میں بجز اس کے   کوئی ایسا گلستان بنارس

ہجوم گل رخوں سے رشک جنت سراسر ہے بیابان بنارس
بہ میدان فلک پر گوئے سبقت غرض لے جائے میدانِ بنارس
اڑاوے دم میں بوے نافۂ چیں یہ خاک عنبر افشان بنارس
بحسن و خوبی و با دلربائی ہیں یکتا خوبرویان بنارس

اردو کے عظیم شاعر مرزا غالبؔ نے ۲۸؍برس کی عمر میں اپنی پنشن کی عرض داشت کے سلسلے میں دلی سے کلکتہ کا سفر کیا۔ وہ لکھنؤ، کان پور، باندہ، موڑھ، چلا تارا اور الہ آباد کا سفر کرتے ہوے ۲۷؍نومبر ۱۸۲۷ء کو کشتی کے ذریعہ الہ آباد پہنچے۔ وہ ۲۸؍نومبر کو صبح بنارس کے لیے چل پڑے اور شاید یکم دسمبر ۱۸۲۷ء کو بنارس پہنچے۔ یہ شہر انھیں اتنا پسند آیا کہ اگر چہ انھیں یہاں محض دو ایک دن رہنا تھا تاہم وہ یہاں تقریباً ایک ماہ تک رہ گئے۔ انھیں پنشن کے کام سے ۲۹؍دسمبر ۱۸۲۷ء کو بنارس سے کلکتہ کے لیے مجبوراً روانہ ہونا پڑا۔ انھیں دوبارہ بنارس دیکھنے کی تمنا زندگی بھر تڑپاتی رہی۔ بنارس کی توصیف میں انھوں نے ایک بہترین فارسی مثنوی ''چراغ دیر'' لکھ کر اپنے احساس کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ غالبؔ کی نظر میں بنارس ہندوستان کا کعبہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

عبادت خانۂ ناقوسیان است ہمانا کعبۂ ہندوستان است

بنارس کی تعریف کرتے ہوے لکھتے ہیں:-

کہ می آید بہ دعویٰ گاہے لافش جہاں آباد از بحر طوافش
سخن را نازشِ مینو قماشی زگل بانگِ ستایش ہائے کاشی
تعالیٰ اللہ بنارس چشم بد دور بہشت خرم و فردوس معمور

مندرجہ بالا مثنوی ۱۰۸؍اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کا اردو میں بھی منظوم ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ اس سلسلہ میں مسلم الحریریؔ بنارسی اور پروفیسر حنیف نقوی کے نام قابل ذکر

ہیں۔ نثری ترجمہ نگاروں میں ظ۔ انصاری، کالی داس گپتا رضاؔ اور علی سردار جعفری خاص ہیں۔

ثابتؔ نے ''مثنوی سیر بنارس'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے جس میں شاعر نے بنارس کی گلیوں اور بازاروں کی رونق اور اس کے باشندوں کی تعریف کی ہے۔ راجا ادت نرائن (۱۲۴۶-۱۲۱۰ھ) کی مجلس عیش و طرب کا بیان کر کے مثنوی کا اختتام کیا گیا ہے۔ ذیل میں چند اشعار نقل کیے جا رہے ہیں:-

جو ہے شہر میں خورّم و شاد ہے
غرض خوب وہ شہر آباد ہے

☆..........☆

اسی شہر میں دل مرا لگ گیا
مگر دل کو اک راہ زن ٹھگ گیا

(مخطوطات انجمن ترقی اردو (پاکستان)، جلد پنجم، مرتبہ افسر صدیقی امروہوی، صفحہ-۲۶۵)

شاہ علیم اللہ بیتاب الہ آبادی فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ بنارس کے بارے میں ایک شعر میں دیکھیے کیا کہا ہے:-

دل چھین لیا میرا بنارس کے بتوں نے
اس وقت میں تو، اے مرے اللہ کہاں ہے

(تذکرۂ میر حسن صفحہ ۱۳۱، دہلی ۱۹۴۰ء)

اردو کے قدیم شاعر میاں ہدایت اللہ ہدایتؔ سبودھ رائے یکدلؔ نامی شاعر کے ساتھ بنارس آئے۔ انھوں نے بنارس کی تعریف میں ایک مثنوی کہی ہے۔ میر حسن نے لکھا ہے کہ ''در تعریف بنارس مثنوی خوبی گفت۔'' افسوس کہ پوری مثنوی ابھی دستیاب نہیں ہوئی۔ چند اشعار ذیل میں نقل کیے جا رہے ہیں:-

بنارس بھی دیکھا عجب شہر ہے
کہ ہر ناگری یہاں کوئی قہر ہے
نزاکت میں ہر ایک جیوں پدمنی
کہوں ناگری اس کو یا پدمنی

کریں کیوں نہ عشاق ، جی کو فدا   ہے معشوق ہر ایک کافر ادا
کہاں پاوے یہ روپ حسن فرنگ   کہ کنچن سا ہر اک کا دمکے ہے رنگ
پر از زیور و زر ہے ہر مرد و زن   کہ سونے میں لپ سب رہا ہے بدن
کوئی حسن کا گر خریدار ہے   تو اس جنس کا گرم بازار ہے
پر از در ہے وہ اس کی کیا بات ہے   نہیں مانگ، تاروں بھری رات ہے
غرض ان کی گر مانگ دیکھے کوئی   دل اپنے کو پھر مانگ دیکھے کوئی

گنگا کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

وہ گنگا کہ آب اس کا شفاف ہے   مثال آئینہ کہ نپٹ صاف ہے
جب آوے ہے برسات میں باڑھ پر   دمِ تیغ سے پھر ہے وہ تیز تر

مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ ۱۸۱۴-۱۸۷۹ء شاگرد ناسخؔ نے بھی بنارس کی تعریف میں دو غزلیں کہی ہیں۔ ان کی ردیف ہی ''بنارس'' اور ''بنارس کے'' ہیں۔

پتلی کے عوض ہو بتِ رعنائے بنارس   اللہ پھر آنکھوں کو دکھلائے بنارس
روتا ہوں بنارس کے تصور میں شب و روز   اے ہندوو دیکھو، یہ ہے دریائے بنارس
ہے کعبۂ مقصود فقط کوچۂ دلدار   کافر ہوں جو مجھ کو ہو تمنائے بنارس
جب سے مجھے قسمت نے بنارس سے چھڑایا   رہتا ہے زباں پر میری بس ہائے بنارس
اے مہرؔ توارد ہوں جو مضموں تو بجا ہے   میں اور حزیںؔ دونوں ہیں شیدائے بنارس

☆……☆

نہیں واقف ہے اے ہم دم گلوں سے تو بنارس کے   گلے کا ہار ہوتے ہیں میرے گل رو بنارس کے
نہ دیکھا ہم نے کوئی شہر، ہم پہلو بنارس کے   ہمیں جنت میں یاد آئیں گے یہ گل رو بنارس کے

کہاں رونے سے فرصت ہجر میں پائی کہ میں ہنستا   بھلا کیا لکھنؤ میں پونچھتا آنسو بنارس کے
جدائی اس صنم سے اور مجھ سے ہو نہ یا اللہ   رہیں معشوق اپنے زینتِ پہلو بنارس کے
حزیںؔ تعریف اس کی کرتے آئے مہرؔ ایراں سے   فقط ہم نے ہی لکھے شعر کیا اردو بنارس کے

بنارس کے اردو و فارسی کے عالم منشی وشیشور پرساد منورؔ نے ۱۸۷۳ء میں ایک کتاب اردو میں ''تحفتہ الاحبابِ بنارس'' کے نام سے شایع کی ہے۔ یہ کتاب کم یاب ہے۔ اس میں بنارس کے کچھ احوال بھی لکھے گئے ہیں۔ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:-

(۱) بیانِ حالِ کاشی عرف بنارس

''............(بنارس) نجات کا مکان ہے۔ معروف بہ بنارس رسون کی کھان ہے یعنی فرشتوں کی آرزو ہے کہ اس شہر میں رہیں۔ حوروں کی تمنا ہے کہ جنت کو چھوڑیں۔ جو یہاں رہتے ہیں صاحبِ نصیب ہیں۔ حضرت سبحانی کے محبوب ہیں، حبیب ہیں۔ بہشتیوں کی خواہش ہے کہ ان کے قدم بوس ہوجیے۔ فرشتوں کے سر میں سودا ہے کہ جبا سائی کیجیے۔............''

(۲) بیانِ عمارت ساحلِ گنگ

(۳) باغ کا بیان

(۴) حال درون شہر

سنسکرت کے عالموں کا بیان بڑا ہی دلچسپ ہے۔ لکھتے ہیں:-

''............ یہ شہر (بنارس) سنسکرت کا دار العلوم ہے۔ یہاں کا بیوقوف اور جگہ جاوے پنڈت کہلاوے، اور جگہ کا الو یہاں آوے پنڈت بن کر چلا جاوے۔............''

اس طرح اس کتاب کے پڑھنے سے انیسویں صدی کے بنارس کے بارے میں بہت ہی دلچسپ اور اچھی جانکاری ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا کے علاوہ اودھ کے نواب واجد علی شاہ اختر کلکتہ جاتے ہوئے ۱۸۵۶ء میں تقریباً ۱۴ دن بنارس میں ٹھہرے تھے۔ انھوں نے اپنی مثنوی ''حزن اختر'' میں بنارس کی مہمان نوازی کو اس طرح یاد کیا ہے۔

بنارس میں آ کر رہے چودہ روز   وہ راجا کی کوٹھی میں ہم سینا سوز
بہت پیش آیا اطاعت کے ساتھ   اتارا تجھے کوٹھی میں ہاتھوں ہاتھ
وہ مصروف خاطر ہوا اس قدر   فرشتہ بنا کہنے کو تھا بشر

سید علی نقی صفیؔ لکھنوی ۱۸۶۲-۱۹۵۰ء نے صبح بنارس پر اپنی ایک نظم لکھی ہے جس میں بنارس کی خوبصورتی کی عکاسی کچھ اس طرح کی ہے:-

ہے لبِ دریائے گنگ اب کی بہار آئی ہوئی   کوثر آشاموں کی ہر سو چھاؤنی چھائی ہوئی
ہر طبیعت حسن کے منظر پر لہرائی ہوئی   لب پہ ایک موج تبسم، آنکھ شرمائی ہوئی
ڈوب کر کیوں کر نکلتے ہیں ستارے دیکھ لو
یہ تماشا آؤ گنگا کے کنارے دیکھ لو

روئے جس پر کاشی خوشنما تعمیر ہے   خط کوسی میں سرِ جدول یہی تحریر ہے
پل ہلالِ عید گنگا صاف جوئے شیر ہے   یا بتوں کے ابرو پیوستہ کی تصویر ہے
آسماں تھا فتنہ باری میں جو مشہور جہاں
سرزمینِ حسن نے کھینچی ہے غمزے کی کماں

ہے حصار عافیت کی کشتیاں اس پل کی نیو   سینا تانے یا ہے مست خوابِ راحت کوئی دیو
پیکرِ گنگا پہ ہے کیا خوشنما آڑا جنیو   ہے کہیں ہر ہر لبِ ساحل، کہیں پر شیو شیو
سنیاسی، سانڈا، رانڈیں، گھاٹ پر کی سیڑھیاں
آفتِ جاں، دشمنِ دیں ہیں یہی سب الاماں

ہے ہلالی خط میں آبادی بنارس کی تمام   گھاٹ، مندر سب لبِ دریا بحسن انتظام
ناؤ پر چڑھ کر انھیں دیکھو جو نامی ہیں مقام   ماہ رویوں کا ملے گا ہر جگہ پر اژدہام
صدقے اتنی گل زمیں پر سو گلستاں کی بہار
آگ پانی میں لگاتی ہے چراغاں کی بہار
چشم بد دور اُف بنارس کیا ہی بانکا شہر ہے   ہر ادا مہوش حسینوں کی یہاں کی قہر ہے
غیرتِ کشمیر ہے یہ انتخاب دہر ہے   ہر گلی کوچے میں جاری حسن کی ایک نہر ہے
صاف ہیں، شفاف ہیں کتنے یہاں کے بت کدے
رہتے ہیں ہردم دولہن کی طرح پھولوں میں لدے
وہ دھندلکا صبح کا، وہ دور تک گنگا کا پاٹ   وہ کگاروں سے نمایاں جا بجا پانی کی کاٹ
وہ پری زادوں کے جم گھٹ سے پرستاں راج گھاٹ   دل بہل جائے جو انساں کی طبیعت ہو اچاٹ
اتری پانی میں گجر دم روز کا معمول ہے
ہر حسیں نازک بدن گویا کنول کا پھول ہے
دیکھ لو آب رواں میں حسن دلکش کی بہار   صاف سینوں سے جوانی کی امنگیں آشکار
جال پھیلائے ہوئے پانی پہ زلفِ تابدار   بال کا باندھا چلا آتا ہے جس میں خود شکار
جھوم کر اٹھی جہاں گھنگھور متوالی گھٹا
دیکھنا برسائے گی موتی یہی کالی گھٹا
حسن کا شیوہ اسی پردہ میں ٹھنڈی گرمیاں   کوندتی ہیں ابر کے اندر ہی اندر بجلیاں
ضوفشاں سورج سے لیکن ہٹ گیا بادل جہاں   خود کہے گی طاقت نظارہ دے کر امتحاں
جامہ زیبی سے دوبالا شانِ محبوبی ہوئی
ساریاں، قوسِ قزح کے رنگ میں ڈوبی ہوئی

دل سے نازک تر لیے ہاتھوں میں اک گنگا جلی
زعفرانی ہے کسی ماتھے پر ٹیکا صندلی
دل جہاں پھسلا لب توبہ سے نکلا یا علی
لب پہ یوں موج تبسم جیسے کھلتی ہو کلی
جب لڑے باہم نگاہیں کافر و دیندار کی
کان میں آئی صدا ناقوسِ استغفار کی

محسن کاکوروی نے اپنے مشہور قصیدے میں بنارس کی تعریف بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کی ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا، گنگا جل

بنارس میں بڑھوا منگل میلے کا اہتمام کاشی کی روایت کا ایک حصہ ہے۔ جس کی شروعات بنارس کے حاکم اعلیٰ میر رستم علی نے کی تھی۔ بڑھوا منگل پر محسن کاکوروی کا ایک شعر پیشِ خدمت ہے:-

ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے بڑھوا منگل

منیر شکوہ آبادی (وفات ۱۸۸۱ء) بڑھوا منگل سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اس کا ذکر منظوم شکل میں کر ڈالا۔ ان کے چند اشعار ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:-

کنارے آب انبوہِ حسیناں
ہر اک جانب ہجوم مہ جبیناں
سنہری تھالیوں، چومک سے روشن
بتاسے، دوب، تلسی، دھوپ، چندن
مٹھائی، ناریل، پھول اور چاول
گلوری، کالے تل، سیندور، گوکل
چڑھانے میں، نہانے میں لب آب
جہاں دیکھو وہاں پوجا کا اسباب
بھجن گاتے ہوئے پنڈے کسی جا
کہیں یگیہ ہے، کہیں ہے ہون پوجا

اردو کے شاعر قاضی محمد اسلم نے دھرہرا کی میناروں کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:-

دھرہرے کی مسجد کے مینار دونوں
زمیں پر ہیں بوجھ آسماں کا اٹھائے

پنڈت مدن موہن مالویہ جی نے بنارس ہندو یونیورسٹی کا قیام ۱۹۱۶ء میں کیا۔ انھوں نے فائزؔ بنارسی کو اردو و فارسی کا پہلا استاد مقرر کیا۔ اس یونیورسٹی کے اردو کے استاد مولوی مہیش پرساد نے مرزا غالبؔ کے خطوط کو سب سے پہلے مرتب کر کے ایک بڑا کام انجام دیا ہے جو ناقابل فراموش ہے۔ شعبہ اردو کے پروفیسر مسیح الزماں، پروفیسر حکم چند نیر، پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر قمر جہاں، پروفیسر نسیم احمد اور پروفیسر ظفر احمد صدیقی (اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہیں) کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے اردو ادب کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ شعبۂ فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ اردو و فارسی کے اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ اسی یونیورسٹی کے پروفیسر بدر الحسن عابدی (شعبہ عربی)، پروفیسر سید سلیمان عباس رضوی، ڈاکٹر عادل جعفری، پروفیسر شمیم اختر، پروفیسر حسن عباس اور پروفیسر عمر کمال الدین (اب لکھنؤ یونیورسٹی میں ہیں) وغیرہ نے بھی فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کی خدمت انجام دی ہے۔ اس طرح سے اس یونیورسٹی نے اردو و فارسی ادب کی ترقی میں جو تعاون عطا کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔

نظرؔ سوہانوی نے اپنی نظم میں بنارس اور بنارس ہندو یونیورسٹی کی تعریف اور خوبیوں کا بیان انوکھے انداز میں کچھ اس طرح کیا ہے:-

اے نشان عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں اے بنارس شہر تقدیس کی روحِ رواں
ذرہ ذرہ تیری مٹی کا نہ ہو کیوں جلوہ پاش دفن ہیں تجھ میں ہزاروں طور والی بجلیاں
سرستی نے پرورش پائی ہے تیری گود میں علم کا مرکز رہا ہے تو ازل سے بے گماں
وشو ودیالیہ جو تجھ میں ہے نہیں فردوس میں اے بنارس اس لیے فردوس سے بڑھ کر ہے تو

جوشؔ ملیح آبادی بنارس کے گھاٹوں اور مندروں کی خوبصورتی اور گنگا کی پاکیزگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ شاعر کی تعظیم میں کسی حسینہ نے انھیں سلام کر دیا تو اسے انھوں نے

منظوم انداز میں یوں بیان کیا ہے:-

آنکھوں میں غنچہ ہائے نوازش نچوڑ کر میرے دل شکستہ کو نرمی سے جوڑ کر
ہونٹوں پہ نیم سوزِ تبسم کو توڑ کر میری طرف خفیف سی گردن کو موڑ کر
کل صبح راستے میں سہانی حیا کے ساتھ اس نے مجھے سلام کیا کس ادا کے ساتھ

ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ کو بنارس اور یہاں کے لوگوں سے بے پناہ محبت اور لگاؤ تھا۔ بنارس کی خوبصورتی پر فریفتہ تھے۔

عشرتؔ فریفتہ ہوں بنارس کے حسن پر
یہ بت کدہ میرے لیے جنت سے کم نہیں

بنارس کے شعرا کی فہرست بہت طویل ہے۔ بنارس میں سلسلۂ مصحفیؔ کے شعرا کی ایک بڑی تعداد نے اردو شاعری کو تقویت بخشی ہے۔ بنارس متعدد ہستیوں کو اپنی کشش کا سامان بناتا چلا آرہا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی بدستور جاری ہے۔ موجودہ زمانے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جنھوں نے ترک وطن کر کے بنارس کو اپنا مستقل مسکن بنایا ہے۔ اردو کے مایہ ناز ادیب وشاعر امرت لعل عشرتؔ کو بھی بنارس کے حسن نے اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے سلسلۂ مصحفیؔ سے تعلق رکھنے والے متعدد شعرا کا ایک تذکرہ ''سخنورانِ بنارس'' کے نام سے شایع کیا۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اب تقریباً نایاب ہے۔

مصنف کا شرحِ حال و آثار

عشرتؔ صاحب کا پورا نام امرت لعل مدھوک اور عشرتؔ تخلص تھا۔ ان کی پیدائش لاہور کے محلہ دیوان اسٹریٹ میں ۲ر نومبر ۱۹۳۰ء کو ہوئی۔ ان کے آباواجداد کو شعروشاعری اور

نغمہ وموسیقی سے خاصا لگاؤ تھا۔ ان کے والد گوردھن لعل مدھوک لاہور ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے انھیں نغمہ وموسیقی اور اسٹیج پروگرام کرنے کا بے حد شوق تھا۔ تقسیم ہند کے بعد عشرتؔ صاحب کا خاندان شملہ میں آکر بس گیا۔

عشرتؔ صاحب کو شعروشاعری کا شوق اور نغمہ وموسیقی کا ذوق بچپن ہی سے تھا۔ ہر طرح کے ساز کو بخوبی بجاتے تھے۔ ان کا ترنم شیریں اور دلکش تھا انھوں نے فارسی، اردو اور تاریخ تینوں مضامین میں ایم.اے. کیا تھا۔ حکومت ہند کی طرف سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انھیں ایران جانے کا موقع بھی ملا۔ جہاں انھوں نے تہران یونیورسٹی سے ’’شعر فارسی درہنداز میانۂ قرن پنجم تا آغاز قرن ہشتم‘‘ کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر فارسی میں ڈی.لٹ. کی ڈگری حاصل کی۔ بنارس ہندو یونیورسٹی نے ان کے مقالے ’’پنجاب میں اردو شاعری کا ارتقا (۱۹۴۷ء تک)‘‘ پر اردو میں پی.ایچ.ڈی. کی ڈگری عطا کی۔

ایران سے لوٹنے کے بعد انھوں نے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور فارسی واردو کے استاد کی حیثیت سے مختلف تعلیمی اداروں میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۴ء میں وہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں اردو، فارسی وعربی کے مشترکہ شعبہ میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ شعبوں کی علیحدگی ہونے پر انھوں نے شعبۂ فارسی میں جانے کا فیصلہ کیا۔ بعد میں وہ شعبۂ فارسی کے پروفیسر اور صدر شعبہ کے عہدے پر فائز ہوئے اور دوران ملازمت ۱۹۸۹ء میں انتقال فرمایا۔

عشرتؔ صاحب بیک وقت محقق، ناقد، مصنف، مؤلف، شاعر، مورخ اور موسیقار تھے۔ عشرتؔ صاحب گوناگوں خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کا اخلاق بلند اور کردار اعلیٰ تھا۔ وہ پاکیزگی کا دامن ہاتھ سے کبھی جانے نہیں دیتے۔ وہ انسان دوست ہونے کے ساتھ ساتھ وطن دوست بھی تھے۔ وہ مذہبی عصبیت سے پاک تھے۔ ان کے دوستوں میں ہندو بھی تھے

اور مسلمان بھی۔ وہ سبھی مذاہب کا احترام کرتے تھے لیکن دقیانوسی رسم ورواج کے قائل نہ تھے۔

عشرتؔ صاحب اردو زبان سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ اردو زبان پر یہ الزام ہے کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے لیکن اس زبان کو متعدد غیر مسلم شعرا وادبا نے جس طرح اپنایا ہے اس سے مذکورہ بالا الزام خود بہ خود مسترد ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس ضمن میں عشرتؔ صاحب کے تعلق سے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ عشرت صاحب غیر مسلم شعرا وادبا کی فہرست میں ایک نمائندہ شخصیت کے حامل ہیں جنھوں نے اردو کے پر آشوب دور میں نہ صرف یہ کہ محبان اردو کی آواز سے آواز ملائی بلکہ بہ بانگ دہل یہ اعلان کر دیا کہ چاہے سارا ہندوستان اس زبان کو ٹھکرا دے لیکن وہ اسے نہیں چھوڑیں گے:

غالبؔ و میرؔ کی میراث ہے اردو عشرتؔ
ہند ٹھکرائے اسے، ہم اسے اپنائیں گے

عشرتؔ صاحب نے اپنی کتاب ''اردو شاعری اور پنجاب'' میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے شعرا کا نہ صرف یہ کہ تحقیقی اور تنقیدی پیرائے میں جائزہ لیا ہے بلکہ اردو بان وادب کے ارتقا کی عہد بہ عہد تاریخ کو نئے تناظر میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ معروف محقق محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' اپنے موضوع پر ایک جامع تصنیف ہے لیکن اس کتاب میں انھوں نے پنجاب کے جدید اردو شعرا و ادبا کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ عشرتؔ صاحب نے پنجاب کے جدید اردو شعرا کے ذکر کے ساتھ پنجاب میں ۱۹۴۷ء تک کے اردو شاعری کے ارتقائی مراحل کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ عشرتؔ صاحب نے اپنی کتاب میں متعدد ایسے قدیم شعرا کا بھی ذکر کیا ہے جن کا ''پنجاب میں اردو'' میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے بھی عشرتؔ صاحب کی یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

''ایران صدیوں کے آئینے میں'' اپنے موضوع پر ایک عمدہ اور کارآمد تصنیف ہے۔

اس سے پہلے ایرانیات پر اتنی جامع اور مفید کتاب اردو زبان میں نہیں لکھی گئی۔ عشرتؔ صاحب اس کتاب میں محقق اور ناقد کے ساتھ ساتھ ایک صاحب نظر مورخ، ماہر ادبیات فارسی اور دیدہ ور ایران شناس نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب ایران کی قدیم و جدید تاریخ اور تہذیب و تمدن نیز ایرانی ادبیات کا مرقع ہے۔

عشرتؔ صاحب نے کئی کتابیں تالیف بھی کی ہیں جن میں ''مرزا غالبؔ'' ''بہار اردو'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد موضوعات پر مقالات و مضامین اور دوسروں کی کتابوں کے لیے پیش لفظ اور تقریظ و مقدمے وغیرہ لکھے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا چکا ہے کہ عشرتؔ صاحب ایک خوش ذوق شاعر بھی تھے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ اس کے علاوہ بعض انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے بھی کیے ہیں لیکن انھوں نے اپنے شعری سرمائے کو اپنی زندگی میں محفوظ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ایسا یا تو اس لیے ہوا کہ انھوں نے اپنی شعری کاوشوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا یا ان کی افتاد طبع ہی ایسی تھی کہ وہ اس سرمائے کی حفاظت نہ کر سکے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کا حافظہ بہت غضب کا تھا اور اپنا بیشتر کلام انھیں از بر تھا۔ اس لیے انھوں نے اسے تحریری طور پر محفوظ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ عشرتؔ صاحب کے شعری سرمایہ کو راقم نے اردو اور ہندی رسم خط میں ''یادگار عشرت'' کے نام سے مرتب کر کے شایع کیا ہے۔

عشرتؔ صاحب کو صنف غزل سے بہت دلچسپی تھی۔ ان کی غزلوں میں تغزل کی چاشنی پائی جاتی ہے اور رومان کی مٹھاس بھی۔ ان کی غزلوں کا مزاج کلاسیکی ہے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ ان میں ذاتی تجربات و مشاہدات کا عکس بھی ہے اور تخلیل کی آمیزش بھی۔ ان کی شعری کی بڑی خوبی نغمگی اور ترنم ہے۔

اگرچہ ان کی شاعری حسن عشق کا جادو بکھیرتی ہے اور رومان پرور فضاؤں سے جلا پاتی

ہے تاہم وہ شائستگی اور پاکیزگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

مری تسبیح کے دانے ہیں یہ سارے حسیں چہرے
نگاہیں اٹھتی جاتی ہیں عبادت ہوتی جاتی ہے

شاعر غم کو اپنا دوست اور ہر نئے الم کو اپنا مہمان سمجھتا ہے۔ وہ اس کی ضیافت کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے اور اس کے ساتھ ایسا کوئی سلوک پسند نہیں کرتا جس سے اس کی دل آزاری ہو:

مرا دل ہر نئے غم کے لیے آنکھیں بچھاتا ہے
کہ گھر آئے ہوئے مہماں کو لوٹایا نہیں کرتے

عشرتؔ صاحب غم کی گھڑیوں کو بھی ہنس ہنس کر گزارنے کے قائل ہیں:

وقت کا روپ کچھ اس طرح نکھارا جائے
غم کی گھڑیوں کو بھی ہنس ہنس کے گزارا جائے

عشرتؔ صاحب دوستوں کے لیے بے پایاں ایثار و محبت کے قایل تھے۔ انھیں دوستوں کی خاطر دشمنوں سے بھی صلح و پیار میں کوئی عار نہیں:

ہم نے اپنے دوست کی خاطر دشمن سے بھی پیار کیا
اپنا مسلک پھول سے پہلے کانٹوں کی رکھوالی ہے

عشرتؔ صاحب مذہب کی تنگ نظریوں پر تیر و نشتر چلانے سے بھی باز نہیں آتے:

دیر و کعبہ کے طلب گار! کبھی دل کو بھی دیکھ
یہ وہ بستی ہے جو محبوب کا گھر ہوتی ہے

ان کے یہاں کہیں کہیں ناصحانہ رنگ بھی جھلکتا ہے:

دوستو! فرصت ہستی کو غنیمت جانو
بات کی بات میں اک عمر بسر ہوتی ہے

عشرتؔ صاحب سیکولرزم کے سب سے بڑے حامی تھے۔ وہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، سب کے ساتھ برابری کا سلوک کرتے تھے۔ مذہبی عصبیت ان کے دل میں بالکل نہ تھی۔ وہ ہندو و مسلم میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے:

جب ہندو و مسلم میں کوئی فرق نہیں ہے
مذہب کی یہ دیوار گرا کیوں نہیں دیتے؟

بدقسمتی سے آزادی کے بعد ہندوستان میں ایک ایسا دور آیا جب اردو کے حق میں بولنے والوں کی زبانوں پر تالے پڑ گئے اور چند لوگ ہی ایسے تھے جنھوں نے اردو کی بقا کے لیے آواز اٹھائی۔ ایسے مشکل حالات میں عشرتؔ صاحب نے نہ صرف یہ کہ محبان اردو کی آواز سے آواز ملائی بلکہ بہ آواز بلند یہ اعلان کردیا کہ چاہے سارا ہندوستان اس زبان کو ٹھکرا دے لیکن وہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں:

غالبؔ و میرؔ کی میراث ہے اردو عشرتؔ
ہند ٹھکرائے اسے ہم اسے اپنائیں گے

شاعر کو لسان الغیب کہا جاتا ہے کیوں کہ اس کی زبان پر آنے والے واقعات از خود جاری ہو جاتے ہیں۔ عشرتؔ صاحب نے بھی یہ پیشن گوئی کردی تھی کہ ان کی رحلت کے بعد ان کے چاہنے والے انھیں یاد کریں گے۔ ہم اس باب کو اسی شعر پر ختم کرتے ہیں:

ہمارے بعد اس محفل میں افسانے بیاں ہوں گے
بہاریں ہم کو ڈھونڈیں گی نہ جانے ہم کہاں ہوں گے

عشرتؔ صاحب کی حیات و خدمات پر ایک مفصل کتاب ''پروفیسر امرت لعل عشرتؔ: احوال و آثار'' کے نام سے راقم حروف نے لکھی ہے۔ اس کتاب پر اتر پردیش اردو اکیڈمی کے

ذریعہ ۲۰۱۴ء میں نیشنل ایوارڈ عطا کیا گیا ہے۔

عشرتؔ صاحب کا ایک بڑا کارنامہ ان کی کتاب ''سلسلۂ مصحفیؔ کے سخنوران بنارس'' ہے۔ یہ ان کی زبردست محنت و کاوش کا نتیجہ ہے۔ بنارس کے شعرا کے احوال و آثار اور انتخاب کلام پر کوئی مستقل کتاب آج تک منظر عام پر نہ آسکی۔ چنانچہ اس کتاب کی اہمیت اور انفرادیت پہلے بھی تھی اور آج بھی قائم ہے۔ راقم حروف نے حال ہی میں اس کتاب کا ہندی زبان میں ترجمہ ''کاشی کے شاعر'' کے نام سے مع اضافہ فرہنگ شایع کیا ہے جسے قبولیت کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔

سخنوران بنارس کی اشاعت سے پہلے ایسی کوئی کتاب منظر عام پر نہ آئی تھی جس سے بنارس کے گمنامی میں پڑے ہوئے شعرا کے حالات اور کلام تک رسائی ہوسکتی۔ اس سے قبل محشرؔ بنارسی نے بنارس کے شعرا کا ایک تذکرہ ''تذکرۂ شعرائے بنارس'' کے نام سے لکھا تھا لیکن یہ اب بھی غیر مطبوعہ بلکہ مفقود ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو جس وقت عشرتؔ صاحب نے زیر نظر کتاب کو مرتب کرنے کا کام شروع کیا اس وقت بھی یہ میدان خالی تھا اور آج بھی خالی ہے چنانچہ ان کے اس کام کی اہمیت اس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے اور مستقبل میں بھی رہے گی۔

سرزمین بنارس اردو ادب کا گہوارہ رہی ہے لیکن آزادی کے بعد اردو زبان کی زبوں حالی کا اثر ملک کے دوسرے حصوں کی طرح بنارس پر بھی پڑنا کوئی غیر فطری امر نہ تھا چنانچہ یہاں بھی اردو زبان و ادب سے دوری اور بے حسی کی ایک عام روش پیدا ہوگئی اور اہل بنارس کی کثیر آبادی اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کو بھول چکی تھی یا بھول رہی تھی۔ ایسے میں عشرتؔ صاحب نے اس مردم خیز خطہ کے ماضی اور حال کی یاد تازہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ یہ کام بہت دشوار طلب تھا۔

اس کتاب میں جو مواد فراہم کیا گیا ہے اسے حاصل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے لیے مصنف کو بڑی محنت اور تگ و دو کرنی پڑی ہوگی اور انھیں بنارس کی گلیوں کی خاک چھاننی پڑی ہوگی ہر وہ شخص جس سے انھیں کچھ بھی امید فیض رہی ہوگی اس سے رابطہ قائم کرنا پڑا ہوگا۔ ظاہر ہے یہ کام بڑی محنت، دردسری اور دیدہ ریزی کا ہے۔

عشرؔت صاحب نے بنارس کے جن قدیم شعرا کے حالات اور کلام یکجا کیے ہیں وہ اس وقت مختلف اشخاص کی یادداشت میں تھے یا بوسیدہ بیاضوں اور کرم خوردہ کاغذ کے پرزوں میں دبے پڑے تھے۔ ان اشخاص میں بیشتر اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اور اگر عشرؔت صاحب ان یادداشتوں سے فراہم کردہ مواد کو اکٹھا کر کے اسے کتابی شکل نہ دیتے تو وہ اشخاص اپنے ساتھ اپنی یادداشتوں اور نادر معلومات کو اس دنیا سے لے کر چلے جاتے۔ اس لحاظ سے عشرؔت صاحب کا یہ کام بڑی اہمیت کا حامل ہے اور خاص طور پر اہل بنارس پر ان کا احسان ہے۔

عشرؔت صاحب کے اس کام کی اہمیت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ یہ کتاب بہت زیادہ مرتب اور منظّم نہیں ہے۔ شروع میں کل ۱۲ شعرا کے تذکرے دیے گئے ہیں ان میں ۱۰ شعرا قدیم اور ۲ شعرا جدید دور کے ہیں۔ ان ۱۲ شعرا کے ذکر کے بعد ''بھولے بسرے لوگ'' کے عنوان سے مزید ۱۵ شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں آخری تین جدید دور کے ہیں باقی قدیم۔ ''بھولے بسرے لوگ'' میں جن تین جدید شعرا کا ذکر کیا گیا ہے وہ معروف شعرا کا درجہ رکھتے ہیں انھیں ''بھولے بسرے لوگ'' کی فہرست میں کیوں رکھا گیا ہے یہ واضح نہیں ہے۔

یہ کتاب شہر بنارس کی شعری و ادبی سرگرمیوں کے متعلق لکھی گئی ہے مگر اس میں بنارس کی شعری و ادبی روایت کی کوئی تاریخ اور اس کے پس منظر پر کوئی گفتگو نہیں کی گئی ہے۔ کتاب

شعرا کے تذکرے کے انداز میں شروع ہو جاتی ہے اور اس کی کوئی باقاعدہ ترتیب نہیں ہے۔ مصنف نے الگ الگ شاعروں پر اپنی معلومات جمع کی ہیں، ان کے حالات بیان کیے ہیں، کلام کے نمونے پیش کیے ہیں، جابجا لطیفوں اور چشمک آرائیوں کا ذکر بھی کیا ہے اور ہر شاعر کے متعلق جو اطلاعات فراہم ہو سکی ہیں سب کی سب پیش کر دی ہیں۔

اس کتاب کی دوسری کمی یہ ہے کہ اس میں بنارس کے عام شاعروں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ بنارس کے ان خاص شعرا کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے جن کا تعلق سلسلۂ مصحفیؔ سے ہے۔ اس طرح یہ کتاب بنارس کی علمی تاریخ، شعری روایت اور ادبی ورثہ کی مکمل نشاندہی نہیں کرتی، چنانچہ خود مصنف کو بھی اس کمی کا احساس رہا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس کمی کو دور کرنے کے لیے اس کتاب کا دوسرا حصہ شایع کرنے کا اعلان کر دیا لیکن وہ اس کام کو تاحیات پورا نہیں کر سکے۔ اس کتاب میں ترتیب و تنظیم کی کمی کے دو خاص اسباب معلوم ہوتے ہیں اول ان کا عجلت پسندی سے کام لینا اور دوم اس موضوع پر کسی دوسری باقاعدہ کتاب کا موجود نہ ہونا۔ دراصل عشرتؔ صاحب یہ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد یہ کتاب منظر عام پر آ جائے۔ کم سے کم وقت میں زیادہ کام کرنے کی خواہش نے انھیں یہ موقع نہیں دیا کہ وہ اس کتاب کو بہتر طریقے سے مرتب کرتے۔

کتاب کے عنوانات کی ترتیب و تنظیم عجلت پسندی کی نذر ہو جانے کے باوجود اس کی اہمیت و افادیت کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا یہ منفرد کام خاص طور سے بنارس کی اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئی جہت سے روشناس کراتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مصنف کی اس کتاب کے دوسرے حصے کو مرتب کرنے کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ایک ایسی کتاب لکھی جائے جو بنارس کے تمام شعرا کا ایک مفصل جائزہ ہو۔ بنارس علم و فن کا گہوارہ رہا ہے اور

اس کے ادبی ورثہ میں بڑے بڑے نامور شعرا و ادبا شامل ہیں لیکن کچھ ایسے بھی شاعر و ادیب ہیں جو گوشۂ گمنامی میں رہنے کی وجہ سے منظر عام پر نہ آ سکے۔ چنانچہ اردو والوں کی خاص طور سے اہل بنارس کی یہ بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ادبی ورثہ کی حفاظت کا اہتمام کریں۔

زیر نظر کتاب کی زبان سادہ اور سلیس، اسلوب نگارش عمدہ اور دلنشین ہے۔ عبارت میں ایسی روانی ہے کہ خشکی کا احساس نہیں ہوتا۔ طرز بیان مؤثر اور دلچسپ ہے۔ شاعروں کے حالات اور واقعات کچھ اس ڈھنگ سے بیان کیے گئے ہیں کہ بنارس کی ادبی تاریخ کا ایک خاکہ کھینچ جاتا ہے۔ شعر و ادب کے شائقین بالخصوص اہل بنارس کے لیے اپنی نادر معلومات اور دلچسپ انداز بیان کی بنا پر یہ کتاب ایک قیمتی تحفہ ہے۔

چوں کہ ''سخنورانِ بنارس'' کا پہلا ایڈیشن تقریباً نایاب تھا اس لیے اس دوسرے ایڈیشن کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ ان کے بڑے بیٹے دیپک مدھوک صاحب نے یہ ایڈیشن شایع کرا کر ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ ہم ان کے بے حد ممنون و مشکور ہیں۔ امید ہے کہ ارباب علم و ادب اس کتاب سے فیضیاب ہوں گے۔

ڈاکٹر عبدالسلام

242/2، شاہ موسیٰ کالونی، ککرمتہ
وارانسی

تعارف

علیم مسرورؔ

۲۳/جون ۶۸؁ء کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں جب میں ڈاکٹر عشرتؔ کے ڈرائنگ روم میں پناہ گزیں ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ ’’سخنورانِ بنارس‘‘ کی طباعت کا مسئلہ طے ہو گیا۔ پریس والوں سے بات چیت ہوگئی ہے اور دو تین ماہ میں کتاب منظرِ شہود پر آجائے گی۔ انھوں نے کتاب کی ضخامت اور سائز کے بارے میں یوں اظہار خیال فرمایا گویا ترتیب شدہ مسودہ تیار ہے۔ میں حیرت میں تھا کہ جو کچھ میں سُن رہا ہوں وہ قابل عمل بھی ہے یا نہیں کیوں کہ مجھے بخوبی معلوم تھا کہ وہ ابھی ابھی ’’ایران صدیوں کے آئینے میں‘‘ کی طباعت سے بہ ہزار وقت فارغ ہوئے ہیں اور ’’سخنوران بنارس‘‘ کے سلسلہ میں تحقیق و تصنیف کا کوئی کام ابھی نہیں ہوا ہے۔ اگر وہ کسی ناول کا ارادہ ظاہر فرماتے تو میں جانتا تھا کہ وہ عزیزی دارا سنگھ (ان کا عزیز کتا) سے ہنستے کھیلتے لکھ لیتے، لیکن یہ کیسے ممکن سمجھا جاسکتا تھا کہ اس قدر جلد وہ ان تمام صورتوں کی تصویر بنالیں گے جو خاک میں تو پنہاں ہیں لیکن لالہ و گل میں نمایاں نہیں ہیں۔

ایران میں تین سال مسلسل قیام کے دوران ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ نے تہران یونیورسٹی سے فارسی میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد گذشتہ چار سال سے بنارس

ہندو یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی سے بحیثیت لکچرر وابستہ ہونے کی وجہ سے بنارس میں مقیم ہیں۔ مجھے انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع پچھلے ایک سال سے ملا۔ میں ان کی فطرت ثانیہ سے واقف تھا۔ شعبہ کی تمام تر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے بعد عموماً شکار کا شوق انھیں دشت وعلف زار کی طرف کھینچتا ہے، وہ اپنی بندوق اٹھائے ہوئے اس اندیشے کے تحت روانہ ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ نہ پہنچے تو تمام شکار بے موت مر جائیں گے، وہ اپنی بندوق کی آواز کی اس نغمگی کو سننے کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں جو دشت وصحرا کی وسعت میں رقص کرتی ہوئی ان کی روح میں ایک سکون بخش باز گشت پیدا کرتی ہے۔ گھر میں رہتے ہوئے وہ دالان اور چھت پر سجائے ہوئے خوشنما گملوں میں کھلنے والے عطر بیز وطراوت بخش پودوں کی آبیاری سے اپنے ذوق جمال فطرت کی تسکین کرتے ہیں۔ شام ہوتی ہے تو دوستوں کی محبت کشاں کشاں انھیں شاہراہوں اور گلیوں کا طواف کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ساز وآواز سے والہانہ محبت۔ کسی بھی پسندیدہ مغنی کی بے لوث قصیدہ خوانی میں بے وقت محو کر دیتی ہے یا خود زخم زن ساز ہو کر فضا میں کلاسیکل نغمے بکھیرنے لگتے ہیں۔ مہمانوں کے استقبال میں دیدۂ و دل فرش راہ کرتے ہیں ان کے ساتھ بیٹھ کر اپنی مسرت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور خاطر وتواضع میں پر تکلف بے تکلفی سے باز نہیں آتے۔ رات گئے دیر تک مطالعہ اور مختصر وطویل تحقیقی مضامین پر کام کرتے رہتے ہیں اور شعر میں بھی کہتے ہیں۔

جن کے معمولات میں میں نے فرق آتے نہیں دیکھا ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ بنارس کی سنگلاخ زمین کی تہیں اتار کر زیر زمینی خزانوں کو نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ بات میرے قیاس سے بعید تھی۔ کیونکہ کبھی مجھے بھی اپنے بزرگوں کے حالات جاننے کا بہت شوق تھا۔ اس سلسلے میں میں نے معلومات فراہم کرنے کی کوششیں بھی کیں لیکن یا تو اہل بنارس کے

سینے ویران تھے یا وہ جذبۂ سخاوت سے عاری تھے، مجھے کچھ نہیں ملا۔ اگر کوئی داستان سنائی بھی گئی تو وہ گہری عقیدت سے تعلق رکھتی تھی یا منطقی استدلال پر پوری نہ اترتی تھی۔ اس طرح بڑے بڑے قعر گمنامی میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان حالات کے پیش نظر شاید اپنے نام کے ساتھ لفظ بنارس کی وابستگی منحوس سمجھی جانے لگی ہو ورنہ آغا حشر کے ساتھ کاشمیری کی نسبت اس قدر ضروری نہ تھی جس قدر بنارس کی تھی۔ آغا حشر کی اس نسبت روحانی نے اہل بنارس کو جو سب سے بڑا نقصان پہنچایا وہ یہ ہے کہ آغا حشر مرحوم کو لاہور یا امرتسر کا سمجھا گیا۔ ان کی تمام تر شعری اور ڈرامائی تخلیقات کو بنارس سے کوئی نسبت نہ دی گئی اور ہم لوگوں سے کوئی معقول تردید بھی نہ ہو سکی۔

اس سلسلے میں نذیرؔ بنارسی کا مرہون منت ہوں کہ انھوں نے بنارس کے باہر ہندوستان کے کسی بھی گوشے میں خارجی اور داخلی طور پر بنارس سے اس قدر والہانہ وابستگی کا اظہار کیا ہے کہ لفظ بنارس ان کے نام کا ایک لازمی جز ہو گیا ہے۔ اس کے بغیر عوام کو انھیں پہچاننے میں مشکل ہوتی ہے۔

قصہ مختصر ڈاکٹر امرت لعل عشرتؔ نے تمام معمولات کو قائم رکھتے ہوئے اس قدر کم وقت میں جو کچھ حاصل کیا اس کے پیچھے دردسری اور دیدہ ریزی کی ایک طویل داستان ہے جو اگر لکھی جائے تو اس کی ضخامت ''سخنوران بنارس'' سے کم نہ ہوگی۔ جنھیں قدرت نے ذوق سلیم عطا کیا ہے وہ اس کتاب کی تاریخی حیثیت اور اس کی گیرائی اور گہرائی کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ ۴۰۰ صفحات کو بے ربط تحریروں سے پر کرنا بھی اس سے زیادہ وقت چاہتا ہے۔ جتنے عرصہ میں یہ تحقیقی اور حتی المقدور مصدقہ حالات پر مبنی کتاب مکمل ہوئی ہے۔ کام کے معینہ جز و کو وقت مقررہ پر پورا کرنے کے جنون نے مؤلف کو کاتب کی ضرورت کو مدنظر رکھنے پر مجبور کیا۔ ایک طرف ڈاکٹر عشرتؔ لکھ رہے تھے دوسری طرف کاتب، اس طرح

جس ترتیب سے مضامین مکمل ہوتے گئے اس ترتیب سے کتاب میں موجود ہیں۔ ورنہ عنوان کی تقدیم وتاخیر کا دوسرا کوئی مقصد نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ قارئین کرام کی نظر میں عنوانات کی ترتیب قباحت کی حامل ہو لیکن حقائق کی روشنی میں یہ قباحت ایک حسن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر عشرت نے چند ماہ کی تگ ودو اور مطالعہ سے ہمارے بزرگوں کو جس قدر سمجھا ہے بنارس کے کسی فرد نے پوری عمر میں اس قدر سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں بھی نہیں جانتا تھا کہ میرے جد امجد مصحفی کے شاگرد رشید ذاکر دراصل کون تھے لیکن ڈاکٹر عشرت جانتے ہیں کہ وہ کہاں سوئے ہوئے ہیں اور ان کے خاندان کے لوگ بنارس کی کن گلیوں میں آباد ہیں۔ اسی طرح اس سلسلے کو لوگ فائز، غنی، بیتاب، فرخ، ریاض نے وراثتاً ہمارے لیے کیا خصوصیات چھوڑی ہیں۔ انھوں نے اہل بنارس سے زیادہ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت نذیر بنارسی اور حضرت مسلم الحریری اور دوسرے صاحبان نظر کی قیادت میں نوجوانان شعر وادب کا ایک کارواں ابھی سانسیں لے رہا ہے لیکن کسے خبر کہ کل ان میں سے بیشتر کے لئے ''بھولے بسرے لوگ'' کا عنوان زیادہ موزوں ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سلسلے کی تکمیل کے لئے اہل بنارس قدیم وجدید شعرا سے کہاں تک اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہیں۔

شملہ کی گھاٹیوں میں شکاروں کے پیچھے بھاگنے والے، پنجاب کی رومان پرور سرزمین سے تسکین دل وجان پانے والے، کشمیر کی دلفریب وادیوں میں نگار فطرت سے راز ونیاز کرنے والے اور ایران کے خیابانوں اور انجمنوں سے حسن تہذیب کا اکتساب کرنے والے کو جب صبح بنارس کی تجلیوں سے مسحور دیکھتا ہوں تو علی حزیں اصفہانی کے اس شعر کی صداقت اور واضح ہوتی ہے کہ:

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا
ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

عشرتؔ کا گھر، خانم عشرتؔ کی نفاست طبع اور ذوق شعر وادب کی بدولت عشرتؔ کدہ ہے۔ ڈاکٹر عشرتؔ کی کسی بھی تصنیف میں خانم عشرتؔ کے شعور سخن شناسی کو بڑا دخل ہے۔ اگر میں کہوں کہ خانم عشرتؔ ڈاکٹر عشرتؔ کی تمام تصنیفات وتالیفات کا بھی نصف بہتر ہیں تو شاید غلط نہ ہوگا۔ خانم عشرتؔ جدید فارسی کا علم اس قدر رکھتی ہیں کہ گھر میں وہ اسے مادری زبان کی جگہ استعمال کرتی ہیں۔ فارسی کا ایرانی لب ولہجہ اس قدر نغمگی کا حامل ہے کہ جب ڈاکٹر عشرتؔ اور خانم عشرتؔ محو کلام ہوتے ہیں تو سننے والے کو شک گزرنے لگتا ہے کہ وہ روندر کالونی کے کسی فلیٹ میں ہے یا حافظؔ وخیامؔ کے میخانے میں۔

''سخنوران بنارس'' ارباب ادب کے سامنے ہے۔ اس کتاب کے بارے میں نہ تو مجھے کسی دعویٰ یا دلیل میں الجھنا ہے نہ ہی مؤلف کی بے جا تعریف وتوصیف کا الزام اپنے سر لینا ہے۔ چند سطور جو میں نے حوالہ قلم کیے ہیں وہ کوئی روایتی پیش لفظ یا تقریظ بھی نہیں ہے، جو کتاب کے حسن میں اضافے کا سبب بن سکے۔ اول تو میں اس کا اہل نہیں، دوم میں خود مؤلف کے قلم کا مرہون منت ہوں۔ یہ بات نازیبا ہوگی اگر میری مختصر سی تحریر کو ان مقامات سے منسوب کیا جائے۔ ہاں میں نے مؤلف کا ایک ہلکا سا تعارف ایک احساس شکر گزاری اور پشیمانی کی ملی جلی کیفیت کے تحت پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔ خود مؤلف کا میرے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے لیکن میں ان حقائق کا اظہار کرنا چاہتا تھا، جن کا مجھے علم ہے اور اگر ان کے بارے میں کوئی ڈاکٹر عشرتؔ سے پوچھے گا تو وہ اس کا اظہار کر کے اپنے کمال خاکساری کو ٹھیس نہ لگنے دیں گے اور خاموشی پر اکتفا کریں گے۔

کیا یہ میرے لیے اور میری ہی طرح دوسرے اہل بنارس کے لیے باعث پشیمانی نہیں ہے کہ وہ قرض جو ایک مدت سے ہمارے ذمہ چلا آتا تھا اسے ہم نے ادا کرنے کی کوشش نہیں

کی۔ ہم نے اردو کے بقا کی خواہش کی۔ شعروادب کی محفلوں میں شمعیں روشن کیں۔ سخن گویوں کے ایک ایک لفظ پر داد تحسین کی بوچھار کی لیکن ان مزاروں پر نہ کبھی کوئی چراغ جلایا، نہ ہی فاتحہ خوانی کی جن کے دم سے آج بھی بنارس کی بزم سخن میں چراغاں ہے۔

عباس بیگ محشرؔ مرحوم ''تذکرۂ شعراء بنارس'' کے عنوان سے دوسروں کی حیات کو روشنی بخشنے کی تمنا لیے ہوئے ''حد عالم فانی'' کے اندھیروں میں کھو گئے اور ہم سب دیکھتے رہے۔ ڈاکٹر عشرتؔ صرف شاعروں کے تذکرے تک محدود نہیں رہے بلکہ انہوں نے گہرے مطالعہ اور استدلال سے ہر شاعر کے کلام کا مقام متعین کرنے کے لیے معزز قارئین کے لیے راہیں کھول دی ہیں۔ کوئی پشیمان ہو یا نہ ہو لیکن میں احساس ندامت سے جھکا جا رہا ہوں، کیونکہ وہ قرض ڈاکٹر عشرتؔ نے اپنے قلم و قرطاس اور اپنی جیب خاص سے ادا کیا، جس کا ثبوت ''سخنوران بنارس'' ہے۔ اس احساس ندامت میں ایک احساس شکر گزاری بھی شامل ہے کہ ڈاکٹر عشرتؔ نے اپنی کاوشوں سے تاریخ ادب اردو کے وہ گمشدہ اوراق یکجا کر دیے جن کے بغیر ہندوپاک کے بیشتر صاحبان ذوق ایک خلا سا محسوس کرتے تھے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور بنارس کی انجمن شعر و سخن میں بیداری کا سبب بنے گا۔

اسمٰعیل منزل، پانڈے حویلی
وارانسی
۱۸ ستمبر ۱۹۶۸ء

علیم مسرورؔ

عرض حال

”سخنورانِ بنارس“ کو یکجا کرنے کا خیال بہت سے لوگوں کو آیا اور انھوں نے اس سلسلے میں عملی کوشش بھی کی لیکن یہ ”قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند“ والی بات ہے میرے بڑے بھائی حضرت نذیرؔ بنارسی کو قدیم فارسی شعرا کا بہت سا منتخب کلام یاد ہے۔ یہ کتاب ان ہی کی حوصلہ افزائی اور مدد سے تکمیل کو پہنچی ہے اور ان ہی کی خواہش کے مطابق اسے اہل بنارس کے نام معنون کیا گیا ہے۔ نذیرؔ صاحب اپنے شہر سے اتنی والہانہ محبت رکھتے ہیں کہ میرے خیال میں اب وہ خود ایک چلتا پھرتا بنارس ہیں۔ میں اپنے ہمنشین کی خدمت میں بس یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ

یہ تیرا حسن کلام عشرتؔ جو اس ادا سے نکھر گیا ہے
نہیں ہے تیرا کمال اس میں جمال ہے تیرے ہم نشیں کا

اس کتاب کو پوشیدہ بیاضوں کرم خوردہ کاغذ کے پرزوں اور عقیدتمندوں کے حافظے کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے اس قسم کا کوئی نقش موجود نہیں تھا۔ جن لوگوں نے قدیم شعرا کے حالات اور کلام بہم پہنچانے میں میری مدد کی ہے ان کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے۔ اس تحریر کے ذریعہ میں انھیں اپنا دل کھول کے دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ ان کی نسبت تشکر کے جذبات سے کس قدر معمور ہے۔ عبدالرشید سونا والے دن بھر ریشمی کپڑوں کے تانے بانے میں الجھنا جانتے ہیں لیکن اس کتاب کا مواد جمع کرنے کے لئے انھوں نے چار مہینے اپنا کام ترک کر کے مختلف شعرا کے خاندانوں کی تلاش اور ان کے کلام کی فراہمی میں جو کارنامے انجام دیے

ہیں، ان کے طفیل یہ کتاب، کتاب نظر آنے لگی ہے۔ رشید صاحب کا خود اپنا خیال ہے کہ انھوں نے ان چار مہینوں میں جتنی تحریریں پڑھی ہیں عمر بھر میں نہ پڑھی ہوں گی۔ کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جو صرف رشید صاحب کی دوڑ دھوپ سے گوشۂ گمنامی سے نکلنے ہیں۔ کچھ ایسی غلط فہمیاں بھی تھیں جو صرف رشید صاحب نے دور کیں۔ ان تمام باتوں اور خلوص و محبت کے جذبات کے لیے میں نہیں جانتا کہ رشید صاحب کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ درج ذیل حضرات میرے خاص شکریے کے مستحق ہیں۔

پرنسپل اکبر علی خاں لودھی فرزند معنوی مرزا فائزؔ بنارسی (حضرت فائز کے غیر مطبوعہ کلام اور مصدقہ حالات کے لیے) سید مصطفےٰ حسین (نبیرۂ حضرت ذاکرؔ بنارسی) الٰہی بخش ناظمؔ (شاگرد حضرت سعیدؔ بنارسی) ڈاکٹر بدرالحسن عابدی (ریاضؔ بنارسی اور اسدؔ بنارسی کے حالات اور کلام کے لیے) جناب عباس حسین (داماد حضرت محشرؔ بنارسی، محشرؔ صاحب کا تمام تر ذخیرہ میری دسترس میں قرار دیکر انھوں نے جس دریا دلی اور دوست نوازی کا ثبوت دیا ہے اس کے لیے ہمیشہ سپاسگزار رہوں گا) شری گورو پرشاد (شاگرد رشید منشی بیتابؔ بنارسی) کچھ شاعر زیر نظر تالیف میں اس لیے شامل نہیں ہو سکے کہ وہ پوری طرح میری نظر میں نہیں تھے یا ان کے حالات اور کلام دیر سے موصول ہوے۔ آغا حشر ظفر الاسلام اور شوکت مجید کے نام بھی ان ہی شعرا میں ہیں۔ انشاء اللہ جلد دوم میں یہ سب لوگ پڑھنے والوں کے سامنے آ جائیں گے۔ میرے پیارے دوست اور مشہور مصور مدھر بنارسی نے اس کتاب کی آرایش میں مدد کی ہے "دستش وردنکند"۔

شعبۂ اردو و فارسی
بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس

امرت لعل عشرتؔ
۱۹ رستمبر ۱۹۶۸ء

ذاکر بنارسی

حضرت ذاکر بنارسی کو اگر سخنوران بنارس کا مورث اعلیٰ لکھ دیا جائے تو حقیقت سے بعید نہ ہوگا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بنارس میں گلستان شعروادب کی آبیاری کے لیے قدرت نے اپنے اہتمام خاص سے کام لے کر اس سرچشمۂ فیض کو وقفِ خاص و عام کر دیا تھا کہ تا کہ لکھنؤ اور رام پور کی طرح بنارس بھی گلزار اردو کے گلہائے ہزار رنگ سے لہکتا اور مہکتا نظر آئے۔ ذاکر بنارسی اس مرتبے کے شاگرد تھے کہ بقول اہل بنارس خودان کے استاد شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ نے بھی ان کے قول کو برحق تسلیم کیا ہے اور ان کے مصرعے پر مصرع لگایا ہے۔ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ اور مرزا سلامت علی دبیرؔ سے ان کی گہری دوستی تھی اور یہ دونوں بزرگ ذاکر کے کمالات کے معترف تھے۔ بنارس اور رام پور کے حکمراں ان کی سرپرستی میں پیش پیش تھے اور ان پر اور ان کے خاندان پر بڑی شفقت فرماتے تھے لیکن ذاکر فطرتاً قناعت پسند بزرگ تھے اس لیے روٴسا کی قصیدہ خوانی پر بہت کم آمادہ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مال و منال اور جاہ وحشمت کے لحاظ سے ان کے چھوٹے بھائی پناہ علی کو جو فارغ البالی اور عروج نصیب ہوا وہ ذاکر کے حصے میں نہیں آیا لیکن ادب کی قلمرو میں جس انداز سے وہ آج بھی سخنوران بنارس کے دل و دماغ میں فرمان فرمائی کر رہے ہیں وہ کسی بھی استاد کے لئے باعث رشک ہو سکتا ہے۔ ذاکر کے دادا کا نام طفیل علی تھا اور یہ خاندان شروع میں لکھنؤ سے آکر بنارس کے قریب نارائن پور قصبے میں مقیم ہوا تھا

جہاں ایک موروثی قبرستان میں ریلوے لائن کے قریب اس گھرانے کے بہت سے بزرگ محوِ خواب ہیں۔ ذاکر کے والد فضل علی بنارس میں راج گھاٹ کے قریب تلیانالہ میں سکونت پذیر تھے۔ یہیں ۱۸۰۲ء میں ذاکرؔ نے عرصہ گیتی میں قدم رکھا۔ مولوی فضل علی کے تین صاحبزادے تھے۔ ذاکر علی، پناہ علی اور عبداللہ۔ ان میں ذاکرؔ غالباً سب سے بڑے اور سب سے مشہور تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، ذہانت اور شاعری کی دور دور تک دھوم مچی تھی۔ دوسرے بھائی مولوی پناہ علی فارسی اور عربی کے جیّد علما میں شمار ہوتے تھے۔ تاریخ بنارس حصہ دوم میں ان کا ذکر موجود ہے۔ [1] ان کے علم وفضل کے پیش نظر ان کو مہاراجہ ایشری پرشاد نارائن سنگھ نے کنور آدت نارائن سنگھ کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ یہ مہاراجہ علم وادب کی سرپرستی کے لیے مشہور ہیں۔ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کو ۱۸۵۹ء میں انھوں نے بنارس بلاکر بہت قدردانی کا ثبوت دیا تھا اور سرورؔ نے حدائق العشاق کا ترجمہ "گلزار سرورؔ" کے نام سے انہی کی فرمائش سے مکمل کیا تھا۔ مہاراجہ ایشری پرشاد نارائن سنگھ مولوی پناہ علی کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس احترام کی یادگار مولوی صاحب موصوف کی وہ قلمی تصویر ہے جو اب بھی مہاراجہ بنارس کے قلعہ رام نگر میں نہایت عقیدتمندی سے محفوظ رکھی گئی ہے۔ مولوی پناہ علی شاعر نہیں تھے لیکن اردو فارسی اور عربی میں ان کی زباندانی مسلم تھی۔ اہل بنارس کسب علم کے لیے کثیر تعداد مین ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ بڑے احباب نواز تھے۔ ان کے ایک پڑوسی اور عزیز دوست منشی گھنو لعل مشرقی علوم والسنہ کے ماہر خیال کیے جاتے تھے۔ مولوی صاحب سے بڑا دوستانہ تھا۔ ۱۹۰۴ء میں بنارس شہر میں طاعون کی وبا میں سینکڑوں آدمی آناً فاناً مر گئے۔ انہی میں منشی گھنو لعل اور ان کے خاندان کے بعض افراد تھے۔ نفسی نفسی کا وہ عالم تھا کہ کوئی جنازہ اٹھانے والا نہیں ملتا تھا۔ مولوی پناہ علی دوست کی

---

[1] تاریخ بنارس حصہ دوم ص ۲۸۱

محبت میں بیتاب ہوکر خود پہنچے اور منشی جی اور ان کے گھر والوں کی لاشوں کو گنگا میں بہا کر گھر لوٹے۔ اسی وفاداری بشرط استواری میں انھوں نے بھی طاعون خرید لیا اور دوسرے ہی دن اپنے دوست کے پیچھے پیچھے ملک عدم کو روانہ ہوئے۔

ذاکرؔ علم و فضل میں اپنے بھائی کے دوش بدوش تھے لیکن ان کی شہرت کا سبب ان کی شاعری تھی۔ اس فن میں انھوں نے مصحفیؔ کی شاگردی کب اختیار کی، اس سلسلہ میں تاریخ اور سال کا تعین بہت مشکل ہے۔ مصحفیؔ کے تینوں تذکروں میں ذاکرؔ کا ذکر نہیں۔ ان کا آخری تذکرہ ریاض الفصحا'' ۱۸۲۰ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس وقت ذاکرؔ کی عمر تقریباً اٹھارہ سال کی تھی اور قوی احتمال یہ ہے کہ وہ اس وقت تک ممتاز شاعروں میں شمار نہ ہوتے ہوں گے کہ مصحفیؔ ان کو اپنے تذکرے میں شامل کرنے کے قابل سمجھتے۔ محشرؔ بنارسی مرحوم نے اپنے غیر مطبوعہ تذکرۂ شعراء بنارس میں لکھا ہے'' آخر عمر میں لکھنؤ جا کر مصحفیؔ کے شاگرد ہوئے۔ تین سال لکھنؤ میں مسلسل قیام کر کے مصحفیؔ سے فیض سخن حاصل کیا۔'' اس بیان کا پہلا حصہ محض سنی سنائی بات ہے۔ محشرؔ نے اس کی تحقیق کی زحمت نہیں کی۔ انھوں نے ذاکرؔ کا سال تولد ۱۲۱۷ھجری تسلیم کیا ہے۔ ادھر مصحفیؔ کے انتقال کا سال ۱۲۴۰ھجری لکھا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ استاد کے انتقال کے وقت شاگرد کی عمر بائیس تیئس سال سے زیادہ نہیں تھی چنانچہ آخر عمر میں لکھنؤ جا کر مصحفیؔ کا شاگرد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مولوی پناہ عملی کے نواسے جناب مولوی سید مصطفیٰ حسین کی عمر مبارک اس وقت پچاسی سال کے لگ بھگ ہے اور وہ اب بھی تلیانالے میں جوادیہ کالج اسٹریٹ کے دوسرے سرے پر اسی جگہ سکونت پذیر ہیں جہاں ان کے نانا مولوی پناہ علی اور ان کے بھائی حضرت ذاکرؔ بنارسی قیام پذیر تھے۔ مصطفیٰ صاحب کے بیان کے مطابق یہ خاندان لکھنؤ سے آیا تھا جہاں

نوابوں کے ابتدائی زمانے میں اس گھرانے کے افراد یکے بعد دیگرے قاضی کے عہدے پر سرفراز ہوتے آئے تھے۔ مولوی طفیل علی اور مولوی فضل علی بنارس میں رہتے تھے لیکن خاندان کے دوسرے لوگ لکھنؤ میں موجود تھے۔ اس لیے لکھنؤ میں ان لوگوں کی آمد و رفت بہت زیادہ رہتی تھی۔ فضل علی کے صاحبزادے ذاکر بنارس میں پیدا ہوئے لیکن اپنے والد کے ہمراہ وہ بھی اکثر لکھنؤ میں قیام پذیر ہوتے تھے۔

مصحفی کو انھوں نے اپنی کم سنی ہی سے ادبی محفلوں اور نشستوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور کم عمری ہی میں ان کی شاگردی اختیار کی ہوگی۔ یہ واقعہ غالباً ۱۸۲۰ء سے پہلے کا ہے ۱۸۲۰ء کے بعد اپنے انتقال ۱۸۲۴ء تک مصحفی کی جسمانی اور دماغی حالت اس قابل نہ رہی ہوگی کہ انھیں اپنے حلقہ تلمذ کو وسیع تر کرنے کی فکر رہتی۔

ذاکر بنارسی کو دیکھنے والے بزرگ بھی اب پیوند خاک ہو چکے ہیں۔ ان کے بھائی مولوی پناہ علی کے صاحبزادے سعید بنارسی بھی شاعر تھے۔ ان کے دو ایک شاگرد بنارس میں موجود ہیں جن سے ان کے استاد کے عم گرامی حضرت ذاکر کے حالات دریافت کیے جا سکتے ہیں لیکن ان لوگوں کی عقیدت اور احترام کا یہ عالم ہے کہ ذاکر ایک آسمانی چیز معلوم ہونے لگتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ذاکر بنارسی کے علم و فضل اور شاعرانہ عظمت کے پیش نظر بنارس دربار کی طرف سے انھیں ایک روپیہ یومیہ کے حساب سے وظیفہ ملتا تھا۔ ذاکر بہت سخی آدمی تھے۔ لباس اور خوراک کے معاملے میں بہت سادگی پسند تھے۔ اس ایک روپیہ میں سے دو ایک آنے اپنی ضروریات میں صرف کرتے تھے اور بقیہ پیسے آنے جانے والے سائلوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ الٰہی بخش ناظم شاگرد سعید بنارسی کے بیان کے مطابق ذاکر نے شادی نہیں کی اور تمام عمر تجرد میں بسر کی۔ محشر مرحوم نے تذکرہ شعرائے بنارس میں تحریر فرمایا ہے کہ

''آخر عمر میں جوان بیٹے کی موت نے دماغ پر گہرا اثر ڈالا اور اسی عالم میں کلام کا بہت سا حصہ تلف ہوگیا۔ ذاکر مرحوم کے خاندان کے ایک اہم فرد جناب سید مصطفےٰ حسین کا بیان مستند ہے۔ جس سے ان دونوں باتوں کی تکذیب ظاہر ہے۔ ذاکرؔ متاہل تھے اور سنی مذہب کے ماننے والوں میں سے تھے۔ ان کی بیگم شیعہ تھیں یا شیعہ ہوگئی تھیں۔ اس لئے کچھ لوگ ذاکر سے بھی برگشتہ خاطر ہوگئے تھے لیکن موصوف کی عالی ظرفی اور خوش اخلاقی کے سبب یہ کیفیت بہت جلد زائد ہوگئی۔ ذاکرؔ کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادی کا پتہ چلتا ہے جس کی شادی پیلی کوٹھی بازار میں ہوئی تھی۔ اس خاندان کے افراد اب پاکستان جاچکے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب واجد علی شاہ کے دربار کا شیرازہ بکھرا تو ۱۸۵۹ء میں مرزا رجب علی بیگ سرورؔ بنارس چلے آئے جہاں ذاکرؔ گویا ان کے منتظر ہی تھے۔ دونوں بزرگوں میں گہرے مراسم تھے۔ یہ سلسلہ ۱۸۶۷ء میں سرورؔ کے انتقال سے منقطع ہوگیا لیکن ذاکرؔ کی زندگی کا یہ خلا اس طرح پورا ہوا کہ انہی دنوں دہلی سے شہزادہ قادر بخش صابرؔ غریب الوطن ہوکر مستقل طور پر بنارس میں پناہ گزیں ہوے اور بنارس کی ادبی محفلوں میں پھر سے رونق آگئی۔ ذاکرؔ اور صابرؔ کے تعلقات کا ذکر محشرؔ مرحوم نے بھی کیا ہے۔ صابرؔ کا انتقال بنارس ہی میں ۱۸۸۲ء میں ہوا۔

ذاکرؔ کے نامور دوستوں میں مرزا سلامت علی دبیرؔ کا نام سرِ فہرست ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب لکھنؤ تاراج ہوا تو دبیرؔ کا آنا جانا بیرونی شہروں میں زیادہ ہوگیا۔ اب اہل بنارس کو بھی ان کی زیارت کا زیادہ موقع ملا۔ ذاکرؔ سے ان کی بہت زیادہ بے تکلفی اور دوستانہ تھا۔ دونوں دوستوں کے تخلص سے حروفِ علت نکالنے والا لطیفہ اسی دوستی کا دلچسپ یادگار ہے۔

ذاکرؔ کی بدیہہ گوئی بھی مشہور ہے۔ وارث علی خاں بنارس کے مشہور سوز خواں تھے جن

کی خوش آوازی مسلم تھی۔ آنریبل سر فضل علی کے دادا میر فیض علی خان کے تعزیہ کے ساتھ ایک دفعہ نوحہ خوانی کے لیے گئے۔ کسی نے وارث علی خاں کا وہ بستہ جس میں نوحے سلام وغیرہ تھے اڑالیا۔ بہت پریشان ہوئے کہ کیا پڑھیں۔ اتفاق سے ذاکر مل گئے۔ وارث علی خاں کو پریشان دیکھا تو فوراً دو نوحے فی البدیہہ قلم بند کر کے پیش کر دیے۔ یہ نوحے بہت مقبول ہوئے اور اب تک سوزخوانوں کی زبان پر ہیں۔ چند شعر یہ ہیں۔

غریب و بے کس و تنہا حسین وائے حسین
قتیل خنجر اعدا حسین وائے حسین

غضب ہے مہر میں زہرا کی سارا دریا ہو
مگر شہید ہو پیاسا حسین وائے حسین

کہا یہ فاطمہ نے ہائے کس غریبی سے
لہو میں غرق ہے میرا حسین وائے حسین

رگوں میں رکتی تھی حضرت کے دھار خنجر کی
یہ بولی دیکھ کے کبریٰ حسین وائے حسین

نہ خوف قبر کا اس کو نہ حشر کا ذاکر
جو ذکر کرتا ہو تیرا حسین وائے حسین

دوسرے نوحہ کا مطلع ہے۔

یہ فاطمہ کہتی ہوئی فردوس سے آئی مظلوم حُسینا
مرنے سے ترے لٹ گئی زہرا کی کمائی مظلوم حُسینا

محشر بنارسی مرحوم نے لکھا ہے کہ ”ذاکر نواب کلب علی خاں بہادر کے زمانے میں

رام پور گئے تھے جہاں ان کی ملاقات اپنے استاد بھائی اسیرؔ سے ہوئی تھی۔ نواب صاحب کی داد و دہش کے بعد جب ذاکرؔ بنارس لوٹے تو اسیرؔ نے اپنا قلمی دیوان بغرض نظر ثانی ذاکرؔ کے سپرد کیا اور کہا کہ آپ جب تجدید نظر فرمائیں گے تو شایع ہوگا۔ وہ دیوان بنارس میں محفوظ ہے کیونکہ اس واقعہ کے تھوڑے دن بعد اسیرؔ کا انتقال ہوگیا۔'' اسیرؔ شاگرد مصحفیؔ رام پور دربار کے استادوں میں سے تھے۔ نواب یوسف علی خاں ان کے شاگرد تھے۔ ۱۸۶۵ء میں یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں تخت نشین ہوے، یہ بھی اسیرؔ کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان حالات میں بہت ممکن ہے کہ اسیرؔ نے خود نواب صاحب سے ذاکرؔ بنارسی کو مدعو کرنے کی فرمائش کی ہو اور مناسب پذیرائی میں دیوان اسیرؔ پر نظر ثانی کی غرض بھی پیش نظر رہی ہو۔ اسیرؔ کا کلام رعایت لفظی پر مبنی ہے۔ اس کے مقابلے میں ذاکرؔ کی مضمون آفرینی اور بلندئ تخیل مسلم ہے۔ عمر کے لحاظ سے بھی ذاکرؔ اسیرؔ سے تین چار سال بڑے رہے ہوں گے۔ [1] اس لئے اپنے استاد بھائی سے مشورۂ سخن کا خیال اسیرؔ کے دل میں پیدا ہونا کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس وقت تک مصحفیؔ کے ممتاز شاگردوں میں صرف ذاکرؔ بنارسی بچے تھے۔ بقیہ لوگ یعنی آتشؔ، خلیقؔ، ضمیرؔ وغیرہ پیوندِ خاک ہو چکے تھے۔ اس لیے بھی مصحفیؔ کی جانشینی کا حق اب ذاکرؔ کو پہنچتا تھا۔

ذاکرؔ کے خاندان میں موسیقی، طب اور علم نجوم سے دلچسپی شروع سے چلی آتی تھی۔ ان کے دادا طفیل علی اور والد مولوی فضل علی مشہور طبیب اور اختر شناس تھے۔ ذاکرؔ کے چھوٹے بھائی مولوی پناہ علی ان فنون میں ید بیضا رکھتے تھے۔ مطب بھی کرتے تھے اور اسطرلاب بھی

---

[1] اسیرؔ کا انتقال غالباً ۷۶، ۷۵ سال کی عمر میں ۱۸۸۲ء میں ہوا۔ ذاکرؔ اس سے پہلے ۱۸۷۲ء میں تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں راہی عدم ہو چکے تھے۔

دیکھتے تھے۔ اپنے زمانے کے جانے پہچانے ستارنواز بھی تھے۔ سعیدؔ بنارسی خلف مولوی پناہ علی اپنے والد کی تعریف میں ''ہدیۃ السعید'' میں فرماتے ہیں کہ میرے والد کا نام شرف الدین اور عرف پناہ علی ہے۔ ان کا مفصل تعارف یوں ہے۔

یم مواج فیضان حقیقت   ڈر دیائے نیسانِ طریقت
طبابت میں ہیں جالینوسِ اعظم   عدیل بوفراسیطوس اکرم
علاج عین ہے تشخیص ان کی   شفائے نفس طب تخصیص ان کی
وہ رصّادِ طبیعت نے ہے کی چال   کہ سیاروں کا ثابت ہوگیا حال
ذہانت نے بھی کی وہ دوربینی   سُہا کی کھل گئی غیبت گزینی [1]

اس کتاب میں سعیدؔ بنارسی آگے چل کر اپنے عم گرامی حضرت ذاکرؔ بنارسی کے بارے میں درج ذیل اشعار میں گوہر افشانی فرماتے ہیں۔

جناب مولوی ذاکرؔ علی سا   ہوا بے مثل کب شاعر ہویدا
یہ حضرت تھے ہمارے عم نامی   کہ ہے ضرب المثل نام گرامی
وہ نزہت دی مضامین کے چمن کو   کہ آرایش ہوئی باغ سخن کو
وہ باغِ شاعری کا پھول پھولا   کمیتؔ و اصمعیؔ کو چرخ بھولا
وحیدالعصر خلقت سعید   لجادالیوم شعراً من بعید
مضامین آپ کے سنتا اگر قیسؔ   نہ پڑھتا پھر قِفانبک امرالقیس
وہ بحرِ طبع کو حاصل ہوا اوج   کہ گردابِ فلک ہے جس کی اک موج
ردیفِ عقلِ اول زور جودت   مضامین منزّہ عرش رفعت

---

[1] ہدیۃ السعید ص ۱۰۵

وہ بیتِ فکرِ والا ہیں گراں سنگ کہ جس سے قاف کا ہے قافیہ تنگ
وہ کی ہے قطعۂ مضموں کی تقطیع مرجز جس سے ہے معنی کا توقیع [1]

بنارس میں ذاکر کو علم نجوم کا بھی ماہر خیال کیا جاتا تھا۔ ان کی زندگی کے آخری ایام کے بارے میں ایک دلچسپ افسانہ مشہور ہے۔ کہتے ہیں ذاکر کو اپنے علم کے زور سے یہ پتہ چل گیا تھا کہ ان کی موت گھوڑے سے گر کر ہوگی۔ اس سے وہ تارک الدنیا ہو کر ویرانے میں رہنے لگے تھے۔ ایک دن کسی نے ذاکر کے کسی عزیز دوست کے انتقال کی خبر دی۔ جلدی میں ذاکر گھوڑے پر سوار ہو کر جنازہ میں شریک ہونے کے لیے چلے۔ اسی عجلت میں گھوڑے سے گر کر ان کا انتقال ہوا۔ اس روایت کی صحت یا عدم صحت سے بحث منظور نہیں۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ ان کا انتقال ۱۲۸۹ ھجری میں ہوا۔ سعید بنارسی نے اس کی سند اس شعر میں پیش کی ہے۔

گئے باغِ جہاں سے خلد کو جب وہ بارہ سونواسی ھجری تھا جب

انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ستر سال کی تھی۔ (۱۸۷۲ء-۱۸۰۲ء) اس حساب سے وہ میرزا دبیر (۱۸۷۵-۱۸۰۳) اور میر انیس (۱۸۷۴ء - ۱۸۰۲ء) کے لگ بھگ ہمعصر تھے۔

مولوی الطاف حسن رابط بنارسی نے اپنے استاذ کی تاریخ انتقال اس مصرع سے نکالی۔

"ذاکر حق مُرد وائے"

ذاکر بنارسی بڑے مشاق اور پُر گو شاعر تھے۔ محشر بنارسی مرحوم نے تذکرہ شعرائے بنارس میں اطلاع دی ہے کہ انھوں نے چار ضخیم دیوان مرتب کیے تھے۔ لالہ سری رام ایم اے رقم

---

[1] ہدیۃ السعید ص ۱۰۶-۱۰۵

طراز ہیں:

> مولوی ذاکر علی بنارسی خلف مولوی فضل علی شاگرد مصحفی صاحب دیوان گزرے ہیں۔ مشاق شاعر اور بڑے سخن سنج مانے جاتے تھے۔ نزاکت خیال کے ساتھ مضمون آفرینی کا بھی شوق تھا۔ [۱]

ان دونوں بزرگوں سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ ذاکر صاحب دیوان تھے لیکن گھاس کے بیسیوں ڈھیر کی چھان بین کے بعد بھی اس سوزن کا کہیں پتہ نہیں چلا سکا۔ مہاراجہ بنارس کے ذخیرۂ کتب میں ذاکر سے ملاقات کا قوی امکان تھا، لیکن وہاں بھی دیوان خواجہ ذاکر، مثنوی ذاکر اور متفرقات ذاکر میں ذاکر بنارسی کہیں نظر نہیں آئے۔ شخصی ذخیروں اور بیاضوں سے بھی سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس مضمون کے آخر میں جو چند اشعار نظر آئیں گے یہ میری اور میرے دوستوں کی دریوزہ گری اور دربدری کا ثمرہ ہے۔

بنارسی بزرگوں کا قول ہے کہ ''تندرستی ہزار نعمت ہے'' والا مشہور عالم مصرع حضرت ذاکر بنارسی کا ہے۔ اس کا پہلا مصرع کسی کو یاد نہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ ذاکر کے استاد مصحفی نے اس پر مصرع لگا کر اس کو یوں مقطع بنا کر اپنایا ہے کہ ؎

مصحفی سچ ہے قول ذاکر کا
تندرستی ہزار نعمت ہے

مصحفی کے سارے دیوان اس وقت میری دسترس میں نہیں ہے کہ اس بات کی تحقیق وتصدیق کرسکوں لیکن جناب الٰہی بخش ناظم شاگرد سعید بنارسی (جن کی عمر مبارک اس وقت نوے سال کے لگ بھگ ہے اور جو اس دور میں ہمارے اسلاف کے نمائندے ہیں) کا بیان

---

[۱] خمخانۂ جاوید ج۔سوم ص ۲۲۷

مستند معلوم ہوتا ہے۔ ناظمؔ صاحب نے اپنے استاد سعیدؔ بناری کی زبان سے یہ شعر اس طرح سنا ہے کہ:

مصحفیؔ سچ ہے قول ذاکرؔ کا
خاکساری بھی زور افسوں ہے

ذاکرؔ کے موجودہ کلام کو اگر مشتے از خروارے' والے معیار پر دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان کے کلام میں تازگی فکر کا پہلو کافی نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں میرؔ کی سی سادگی اور پرکاری بھی نظر آتی ہے اور آتشؔ کی سی رنگینی اور مضمون آفرینی بھی۔ ان کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی ایسی بات موجود ہے جو قاری کو متوجہ کر سکتی ہے۔ یہ بات خود اپنی جگہ اس لیے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ فقط اسی خوبی کے سبب وہ زندہ رہ سکتے تھے لیکن افسوس کہ انقلاب دہر کی آندھی نے ان کے شیرازۂ کلام کو بہت جلد منتشر کر دیا اس کے لئے وہ خود بھی قابل الزام ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور بقول سعیدؔ بناری چائے کے لیے بعض اوقات اپنے دیوان کے دو چار ورق نذر آتش کر دینا ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اب شعر سنیئے:-

سنتے ہیں جہاں میں نام اس کا
دیکھا نہ کہیں مقام اس کا
از بسکہ حیا ہے مکنت آمیز
پورا نہ سُنا کلام اس کا
کم خندہ دکم سخن کم اشفاق
ہر کام ہے ناتمام اس کا
جان آگئی جاں میں ہماری
آیا جو کبھی سلام اس کا

……………………

شکایت اس کی ناشنوائیوں کی سخت بیجا ہے
نہ پہنچا میرے کانوں تک بھی شورِ نوتواں اپنا
نہ بستے کاش اے دل ساحلِ بحرِ فنا پر ہم
مٹا جاتا ہے آغازِ ولادت سے نشاں اپنا

……………

عشق میں سر بھی گر جدا ہوگا　　نہ فراموش یہ مزا ہوگا
مل رہے گا ہمیں زمانے میں　　جو ہمارے نصیب کا ہوگا

……………

تھا جن کو گراں شبنم افلاک کا سایہ
سو آج انھیں پھول ہوا خاک کا سایہ
چاہوں تو ابھی آتشِ دوزخ کو بجھا دوں
ہے ابرِ سیہ دیدۂ نمناک کا سایہ
جب فصلِ بہار آئے گی ہم یاد کریں گے
وہ دھوپ سحر کی شجرِ تاک کا سایہ

……………

آتشیں رُخ پہ ترے خال کا آنا کیسا؟
قائم النار یہ بارود کا دانا کیسا؟

……………

بیمار ترے غم میں یوں زرد رو ہوا ہے
اشکوں کا دانہ دانہ تسبیح کہربا ہے

ضعف نے زور دکھایا پس مردن اپنا
اٹھتے ہی بیٹھ گیا گنبدِ مدفن اپنا
طولِ شب یلدا سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے
یہ زلفِ مسلسل جو ترے رُخ پہ پڑی ہے
پوچھو زبانِ خار سے اور میرے پاؤں سے
کس کس طرح سے بادیہ پیمارہاہوں میں
جواہر خانہ زنداں کو کیا ہے چشم پرخوں نے
مری زنجیر پرنگ جڑدیے ہیں اشکِ گلگوں نے
دل بھر گیا حَرم سے اب دیر میں بسا ہے
دل میں صنم ہے لب پر خدا ہے
پتلیوں تک خون ہو لخت جگرآنے لگے
لعلِ احمر سنگِ موسیٰ میں نظرآنے لگے
شب جو نالاں بیکسی سے یہ دل صدپارہ تھا
آسماں سے خوں فشاں ہردیدۂ سیارہ تھا
طوفان آتشیں پہ ہے عمرِ رواں مری
شور تنور آب زدہ ہے فغاں مری
تودست برہمن سے مارا پڑے گا زاہد
ناقوس اے ستمگر ٹوٹا تو سنکھیا ہے
شب جو باتوں میں وہ مہہ پیکر بہل کر رہ گیا
رنگ سو سو طرح سے گردوں بدل کر رہ گیا

لیلےٰ کا جب کہ نجد سے محمل نکل گیا
آرام قیس لاکھوں ہی منزل نکل گیا
یہی ہے گر حالِ آہِ سوزاں گریں گے جل کر فلک زمیں پر
یہی ہیں نعرے تو دیکھ لینا کہ حشر ہے حشر تک زمیں پر
چلنا ہے وہ قیامت اس شوخ نوجواں کا
برپا ہے ہر قدم پر اک شور الاماں کا
لالۂ صدرنگ پھولا کوہ پرتو کیا عجب
کوہکن کا خون کیا کیا رنگ ابھی دکھائے گا

……………………………

ذاکر بنارسی سارناتھ جانے والی سڑک پر لاٹھ کی مسجد کے روبرو ایک قبرستان میں دفن ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے بھائی مولوی پناہ علی اور ایک ہمشیرہ کی قبریں ہیں۔ ان شکستہ حال قبروں پر کوئی کتبہ یا لوح نہیں۔ خدا اہل بنارس کو معاف کرے۔

ذاکر کے انتقال کے بعد ان کی جانشینی کا سوال ان کے اہلِ خاندان اور ممتاز شاگردوں میں سبب مخاصمت بن گیا۔ ذاکر کی صاحبزادی کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ ذاکر کے یہ داماد جن کا پورا نام خلیل الدین حسن طاؔہر بنارسی تھا بہت اچھے شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ بنارس اور بنارس سے باہر مختلف شہروں میں ان کے شاگرد بھی موجود تھے۔ مولوی سعید الدین سعیؔد بنارسی ذاکر کے بھتیجے شاعری میں مسلم الثبوت استاد کہلاتے تھے اور اپنے شاگردوں کی نظر میں استاد کی جانشینی کے مستحق تھے۔ ذاکر کے ایک اور بھتیجے محمد عمر کلیم بن عبداللہ بھی ایک مشاق شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ ان کے شاگرد ذاکر کے بعد کلیم ہی کو بنارسی شعرا کا سرتاج

تسلیم کرتے تھے۔ خاندان سے باہر ذاکرؔ کے شاگرد الطاف حسین رابطؔ کے ہونہار صاحبزادے پروفیسر مرزا محمد حسن فائزؔ بنارسی کے علم وفضل اور فنی مہارت نے ہر طرف اپنے جھنڈے گاڑنا شروع کر دیے تھے۔ ان حالات میں ذاکرؔ کے شاگرد رفتہ رفتہ دو پارٹیوں میں تقسیم ہوگیے۔

کلیمؔ اور سعیدؔ کے شاگردوں میں اقبالؔ بنارسی اور ان کے ہم خیالوں نے اپنے آپ کو مرزا فائزؔ اور ان کے شاگردوں سے الگ کرلیا۔ اس واقعہ سے تقریباً نصف صدی بعد تک ان لوگوں کی شاعرانہ معرکہ آرائیاں جاری رہیں۔ نوک جھونک ہوتی رہتی اور اکثر لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچتی۔ ان مقابلوں نے بنارس کے ادبی ماحول میں زندگی کے آثار پیدا کر دیے اور ادب میں کچھ ایسی ادبی شخصیات کا ظہور ہوا جن کو باہر والوں نے بہت کم پہچانا اور خود اہل بنارس نے بھی انھیں بہت جلد بھلا دیا۔ زیرِ نظر کتاب میں ان میں سے بہت سے لوگ پڑھنے والوں کے سامنے آئیں گے اور زبان حال سے جدید ایرانی شاعر رہیؔ معیری کا یہ شعر پڑھتے نظر آئیں گے:

بودیم شمع محفل روشن دلان رہیؔ
رفتیم و داغِ خویش بدلہا گذاشتیم

فائز بنارسی

مرزا محمد حسن فائزؔ کو بنارس میں استاد الشعرا کہا جاتا ہے اور یہ لقب ان کے نام کے ساتھ اس لیے چسپاں کر دیا گیا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر اب تک بنارس کے تقریباً نوے فی صدی شاعران کے یا ان کے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ خود ان کے اپنے زمانے (۱۸۵۶ء سے ۱۹۲۹ء) میں ان کے شاگرد استاد ہو چکے تھے اور شاگرد در شاگرد کا یہ سلسلہ ایک وسیع کاروبار کی صورت پھیلا نظر آتا تھا۔ فائزؔ کی ذاتی فیاضی بھی اس سلسلہ میں بہت موثر ثابت ہوئی تھی۔ علم وفن کی تقسیم وتبلیغ میں وہ اپنے آرام واستراحت کا وقت بھی نہ دیکھتے تھے اور سوتے جاگتے ہر وقت شاگردوں کی تعلیم وتربیت میں مصروف رہتے تھے۔ فارسی اور عربی کے بہت بڑے فاضل اور فن عروض میں منتہی ہونے کے سبب ان کی شہرت بہت دور دور تک تھی۔ علم لغت اور قواعد دوستوں کی کتابوں میں ان کا کلام بطور سند پیش کیا جاتا تھا۔ یوپی کے مشرقی اضلاع میں غالباً گزشتہ سو سال میں ایسا صاحب فن شعر گو پیدا نہیں ہوا۔ اس علاقے میں فائزؔ عروضی شعرا کے بڑے سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔

فائزؔ کے والد مولوی الطاف حسین رابطؔ عربی اور فارسی کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ فن شاعری میں بھی دخل رکھتے تھے۔ حضرت ذاکرؔ بنارسی سے تلمند تھا۔ اور جے نارائن ہائی اسکول بنارس میں مدرّس تھے۔ فائزؔ نے عربی فارسی کی تعلیم اپنے پدر بزرگوار سے حاصل کی اور

انگریزی میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد سگرا مشن اسکول میں اردو اور فارسی کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے۔ وہ کچھ دیر تک ہریشچندر ہائی اسکول میں بھی رہے جہاں سے پنڈت مدن موہن مالویہ جی کی صاحب نظری انہیں بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو، فارسی و عربی کی صدارت کے لیے کھینچ لائی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کرسی کے لیے فائزؔ سے بہتر آدمی دور دور تک نہیں مل سکتا تھا۔

فائزؔ کو دیکھنے والے بہت سے بزرگ اس وقت بنارس میں موجود ہیں۔ خود ان کے شاگرد اور خاندان کے لوگ ان کی دلچسپ شخصیت کے بارے میں وسیع معلومات رکھتے ہیں۔ لیکن یہ امر اپنی جگہ پر آج بھی افسوسناک ہے کہ استاد کی یاد میں ایک آدھ بار یوم فائزؔ منعقد ہونے کے علاوہ کوئی مفید اور تعمیری کام منظرِ عام پر نہیں آیا۔ ان کا بیشتر اردو اور فارسی کلام تلف ہو گیا ہے یا ہو رہا ہے اور بدیہی ہے کہ اس کا سبب انقلاب زمانہ اور ابنائے روزگار کی بے مہری اور کم لطفی ہے۔

مرزا فائزؔ کا قیام شوالہ کے نزدیک اس کوچے میں تھا جس کو آج فائزؔ روڈ کا نام دیا گیا ہے۔ یونیورسٹی میں اپنے فرائض کی انجام دہی کے بعد وہ اپنا بیشتر وقت اپنے گھر پر ہی گزارتے تھے۔ شعرا اور طلبہ ان کی قیام گاہ پر اصلاح و تعلیم کے لیے حاضری دیتے تھے اور استاد گاؤ تکیہ پر نیم دراز ہو کر سب کی فرمائشیں پوری کرنے میں لگے رہتے تھے۔ تعلیم کے وقت کسی قسم کی قید و بند کا سوال نہیں تھا۔ جس کو لکھنے پڑھنے کا شوق ہو کتاب لے کر چلا آئے۔ اس میں ہندو مسلم عیسائی کا امتیاز نہ تھا۔ متونِ قدیم پر فائزؔ کو زبردست عبور حاصل تھا۔ عام طور پر بے تامل تقریر فرماتے تھے اور علمی ادبی فنی موضوعات پر ان کی باتیں بہت دلچسپ اور معلوماتی ہوتی تھیں۔ مطالعہ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ کتب بینی کا مشغلہ دن رات جاری رہتا تھا۔ گاؤ تکیہ لگا کر

لیٹ کر کتاب دیکھتے تھے۔ کتاب سینے پر مستقل پڑی رہتی تھی۔ شاگردوں کا بیان ہے کہ اس سے ان کے سینے پر گھٹے پڑ گئے تھے۔ ایک دفعہ ان کے ایک ممتاز شاگرد حضرت غنیؔ بنارسی کوئی فنی مسئلہ لے کر آئے۔ فائزؔ نے کسی لفظ کو غیاث اللغات میں دیکھنے کو کہا۔ غنیؔ مرحوم کو لفظ تلاش کرنے میں دیر ہوئی۔ فائزؔ نے پوچھا کیا لغت کا مطالعہ نہیں کرتے؟ ''جواب ملا'' ضرورت پڑتی ہے تو دیکھتا ہوں''۔ فائزؔ بولے'' یہ اچھی بات نہیں ہے۔ لغت کا مسلسل مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ میرے خیال میں شاید ہی کوئی ایسی لغت ہو جس کو میں نے سات مرتبہ سے کم پڑھا ہو۔'' اگر استاد کے اس بیان کو مبالغہ آرائی نہ سمجھا جائے تو اس سے ان کی فنی ریاضت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مرزا فائزؔ بہت لحیم شحیم آدمی تھے۔ خوش قامتی میں سینکڑوں میں نمایاں اور تن و توش میں جانے پہچانے۔ ایک شاگرد کے بیان کے مطابق شیروانی کے لئے جب ایک دفعہ ان کے سینے کی پیائش کی گئی تو پورے چوالیس انچ چوڑا سینہ نکلا تھا۔ لباس میں پاجاما اور شیروانی کو پسند کرتے تھے اور سر پر پانچ پلے کی ٹوپی رکھتے تھے۔ فائزؔ اپنے مذہبی اعتقادات کی رو سے شیعہ تھے۔ لیکن ایسے فراخ دل اور عالی ظرف شیعہ تھے کہ اگر ان کے شاگردوں میں سے کوئی صاحب فاروق اعظم پر بھی کوئی نظم اصلاح کے لیے پیش کرتے تو استاد نہ صرف اس میں اصلاح کر دیتے، بلکہ اگر مضمون میں کمی بیشی ہو تو اس کی تکمیل میں انہیں کوئی عذر نہ ہوتا۔

مرزا فائز ناسخؔ کے بڑے پرستار تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر پہلو سے ناسخؔ کی شخصیت اور شاعری سے بڑے متاثر تھے یہاں تک کہ ان کی شخصی عادات میں بھی ناسخی جھلک پائی جاتی ہے۔ ناسخؔ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنی دیو قامتی کے دوام کے لیے کھانے پینے میں اپنی مثال آپ تھے۔ فائزؔ کے بارے میں، میں بھی اپنی تحقیق کے مطابق نہایت وثوق سے

کہہ سکتا ہوں کہ اگر ناسخ پر کسی جن کا سایہ تھا تو فائز پر ناسخ کا سایہ تھا۔ ان کی خوشخوراکی مشہور تھی۔ مدنپورہ میں برکت اللہ خاں کبابی کا کباب ایک پیسے میں بکتا تھا اور وزن میں چھٹانک بھر سے کم نہیں ہوتا تھا۔ شب کو دکان بڑھاتے وقت جس قدر کباب بچ جاتے تھے برکت اللہ خاں سینی میں رکھ کر استاد کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ استاد لیٹے لیٹے سینی سے ایک ایک کباب اٹھا کر کھاتے جاتے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔ جب کباب ختم ہو جاتے تو برکت اللہ خاں سے پوچھتے میاں کتنے پیسے ہوئے، وہ جواب دیتا حضور ایک روپیہ چار آنہ یا ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ استاد چپکے سے پیسے دے کر اسے رخصت کر دیتے اور حاضرین سکتے میں رہ جاتے کہ ایک روپیہ آٹھ آنے کا مطلب بہتّر کباب سے کم نہیں، آخر یہ دیکھتے ہی دیکھتے کیسے ختم ہو گئے۔

حضرت مسلم الحریری بنارسی استاد سے فارسی پڑھتے تھے۔ کبھی کبھی استاد اپنے شاگرد کو بھی خدمت کا موقع دیتے تھے۔ ایک دن مدنپورہ سے گزرے تو دم لینے کی غرض سے مسلم صاحب کی قیام گاہ پر تھوڑی دیر کے لئے توقف فرمایا۔ مسلم صاحب نے تواضع کا سامان بہم پہنچانا چاہا۔ تو بولے۔ آج میری طبیعت کچھ اچھی نہیں۔ گھر میں کھانا نہیں پکوایا۔ آپ ایسا کیجیے کہ سنار پور کی چومہانی پر فلاں دوکان پر جایئے اور تین پاؤ پوریاں لے آیئے۔ اسی کی بغل میں برفی بہت لذیز ملتی ہے ایک پاؤ کافی رہے گی، اور ہاں فلاں حلوائی سے ایک پاؤ ربڑی لانا نہ بھولیے گا۔ بس اور کچھ نہیں، میں ذرا پانی پیوں گا۔'' بڑھاپے میں خود ان کے قول کے مطابق ان کی خوراک میں کمی آگئی تھی۔ اپنے ایک ہندو شاگرد کے بارے میں فرماتے تھے کہ ان کے یہاں بھینس ہے جو دونوں وقت چار چار سیر دودھ دیتی ہے۔ ایک وقت کا دودھ میرے یہاں چلا آتا ہے میں چار سیر کو پکا کر دو سیر کر لیتا ہوں، اب اسی پر اکتفا کر لیتا ہوں، کیوں کہ بڑھاپے کی وجہ سے ذرا بلغم پیدا ہو جاتی ہے۔ استاد کے کھانے کے سلسلے میں اور بھی بہت سے لذیذ واقعات

مشہور ہیں۔ بیگم کے انتقال کے بعد گھر میں کھانا پکانے کے لیے ایک ماما تھی جو استاد کے کھانے پینے کا اہتمام کرتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ ایک مہمان ایسے وارد ہوے جو میزبان سے بھی زیادہ خوش خوراک تھے۔ فائزؔ نے کھانے کے دوران محسوس کیا کہ راشن کم ہوتا جارہا ہے۔ انھیں فکر لاحق ہوئی کہ ماما بھوکی نہ رہ جائے۔ اس خیال سے خود کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ مہمان کھاتے جاتے تھے اور تعریف کرتے جاتے تھے۔ گوشت اچھا ہے۔ کباب بہت اچھے ہیں۔ جب ماما کے حصے کا کھانا بھی آگیا اور مہمان اس کو بھی ختم کر چکے تو برتن صاف کرنے لگے اور فائزؔ سے مخاطب ہو کر کہا کہ برتن چاٹنے کا ثواب مدینے میں جھاڑو دینے کے برابر ہے۔ جھنجھلائی ہوئی ماما یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے باورچی خانے سے ہانڈی لاکر مہمان کے سامنے رکھ دی اور اپنے آقا سے دست بستہ عرض کی کہ حضور ان سے کہیے کہ ذرا کربلا میں بھی جھاڑو دیتے جائیں۔

مرزا محمد حسن فائزؔ مزاج کے بڑے سخی تھے۔ زندگی کے کسی شعبے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ سائل ان کے دروازے سے بہت خوش خوش لوٹتا تھا۔ سخاوت میں نمائش ان کو سخت ناپسند تھی۔ سوالیوں کو آنے جانے کی عام اجازت تھی۔ ایک حاجتمند ہمیشہ جمعرات کو آتے تھے۔ استاد ان کی صورت دیکھتے ہی چپکے سے ایک چونی ان کو تھما دیتے اور وہ رخصت ہو جاتے۔ یہ صاحب جن کا نام جھمن تھا جمعرات کے بعد سنیچر کو پھر آئے۔ اور معذرت کی کہ حضور اس دفعہ جمعرات کو نہیں آسکا، استاد نے ایک اور چونی ان کی نذر کی۔ سوموار کو جھمن میاں تیسری مرتبہ آدھمکے اور اس بار اور بھی زیادہ عاجزی سے عرض پرداز ہوے کہ سرکار بیماری کی وجہ سے اس ہفتے خدمت میں حاضر نہیں ہوسکا، استاد نے بڑی خندہ پیشانی سے تیسری مرتبہ ان کا خراج ادا کر کے رخصت کردیا۔ ایک شاگرد شروع سے یہ کیفیت دیکھ رہے تھے۔ استاد سے کہا ”قبلہ یہ شخص جھوٹ بول رہا تھا۔ ہفتے میں تین مرتبہ آیا ہے۔“ استاد نے مسکرا کر جواب دیا۔ کوئی بات نہیں۔

ہوسکتا ہے اس دفعہ کوئی اشد ضرورت رہی ہو، میرے خیال میں افیون کم رہی ہوگی۔ "

فائز اپنے استاد بزرگ حضرت مصحفی کی طرح بڑے زود گو تھے بیشتر طرح مصرع پر غزل لکھتے تھے۔ شاگرد مصرع لے کر بیٹھ جاتے، استاد نیم دراز حالت میں کاغذ قلم سنبھالتے اور دوات پہلو میں رکھ لیتے۔ ایک دفعہ قلم ڈبو کر نکالتے تو ایک مصرع ضرور لکھ دیتے، زیادہ دیر ہوتی تو دو دفعہ قلم ڈبو لیتے۔ تاریخ گوئی کے فن میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ ان کے شاگرد حافظ مقبول احمد کوکب نے ایک دفعہ اپنے چاٹگام کے مرشد روحانی کے انتقال پر قطعہ تاریخ کہہ کر فریم میں جڑوایا تھا۔ بعد میں غور کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک سال کا فرق ہے۔ کوکب فریم توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اساتذ کے پاس آئے اور اپنی الجھن بیان کی، استاد نے ایک نظر قطہ تاریخ پر دوڑائی اور فوراً یہ کہہ کر کہ یہ مشکل بہت آسان ہے۔ بغیر ہاتھ لگائے اسی قطعہ سے صحیح مادہ تاریخ نکال دیا۔

اپنی شاعری کے بارے میں فائز کی خودنوشت تحریر موجود ہے جس میں کانپتے ہاتھوں سے یہ الفاظ درج کیے گئے ہیں۔ "والد سے میں نے یہ فن (شاعری) حاصل کیا ہے۔ ان کا نام مولوی الطاف حسین صاحب تھا۔ ان کا تاریخی نام آغا علی حسن ۱۲۳۰ھ ہجری ہے۔ میرا تاریخی نام آغا قایم حسن ہے ۱۲۷۱ھ والد شاگرد تھے۔ مولوی ذاکر علی صاحب ذاکر کے۔ وہ شاگرد تھے شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے۔ مولوی ذاکر علی صاحب کے انتقال کی تاریخ والد نے کہی۔ "ذاکر حق مردوائے" مرزا قادر بخش نے کہی" اچھا مرگ کا مضمون باندھا" (؟) والد مرحوم کی تاریخ میں نے کہی۔ "شد زوال آفتاب موقفِ ایمان وعلم"۔

فائز کا حلقۂ تلمذ بہت وسیع تھا۔ شاگردوں کا ایک جم غفیر ان کے ساتھ رہتا تھا۔ اس شان سے یہ لوگ مشاعروں اور ادبی نشستوں میں شریک ہوتے تھے کہ مصحفی اور انشا کی معرکہ آرائیاں یاد آجاتی تھیں۔ اس ماحول میں مصحفی کے براہ راست نمائندے تو فائز بذاتِ خود

ہوتے تھے۔ اور میرؔ، انشاؔ کی اتفاقیہ جانشینی کا افتخار قدرت نے اقبالؔ بنارسی کو بخش رکھا تھا۔

خواجہ غلام محمود اقبالؔ بنارسی فائزؔ کے معاصرین میں بہت خوش گو شاعر تھے۔ ان کے والد خواجہ غلام نبی بنارس کے مشہور وکیل تھے۔ اقبالؔ نے بی. اے. پاس کرنے کے بعد کچھ دیر تک بنارس کی دیوانی عدالت میں ملازمت کی۔ بعد ازاں وکالت پاس کر کے اپنے والد کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی لیکن وکالت سے رغبت نہ رکھنے کے سبب جلد ہی اس راستے میں لڑکھڑا کر رہ گئے۔ محمد عمر صاحب کلیم سے تلمذ تھا۔ اور میر ریاض علی ریاضؔ اور حکیم ابوالحسن نسیمؔ سے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان کی غزلیات گری پڑی مل جاتی ہیں۔ لیکن محشرؔ بنارسی مرحوم کے بیان کے مطابق مجموعہ رباعیات اور تاریخ عرب منظوم کے مسودے اب ناپید ہیں۔ [1] اقبال غزل گو شاعر تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں ان کے تغزل میں رعنائی خیال اور جدیدیت بہت زیادہ ہے۔ ان کے کلام میں ایک ڈرامائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ سنا ہے کہ جب وہ اپنی غزل مشاعرے میں سناتے تھے تو بذات خود اپنے ہر شعر کی تفسیر ہو کر رہ جاتے تھے۔ ان کے اشعار میں زندگی کی گوناگوں کیفیتوں کا عکس موجود ہے۔ زبان کی سادگی اور خلوص فکر سے بیشتر کلام بڑا موثر ہو گیا ہے۔

کب ہنستا تھا جو یہ کہتے ہو کہ رونا ہوگا
ہو رہے گا میری قسمت میں جو ہونا ہوگا

اک طرف دوست کا اصرار کہ آنکھیں کھولو
اک طرف موت تھپکتی ہے کہ سونا ہوگا

شوق سے آپ نقابِ رُخ زیبا الٹیں
ہو رہے گا میری قسمت میں جو ہونا ہوگا

---

[1] تذکرہ شعرائے بنارس مملوکہ جناب عباس حسین اور ڈاکٹر حسن بیگ

ہم کو اقبالؔ مصیبت میں مزہ ملتا ہے
ہم تو یہ سوچ کے ہنستے ہیں کہ رونا ہوگا

☆……☆……☆

کیا حرص تھی کیا بیتابی تھی اُمید بھرا دل ٹوٹ گیا
واں شیشہ اٹھایا ساقی نے یاں ہاتھ سے ساغر چھوٹ گیا
یوں محوِ جمال یار ہوا کچھ کہہ نہ سکا کچھ سن نہ سکا
بھولی ہوئی باتیں یاد آئیں جب ہاتھ سے دامن چھوٹ گیا

☆……☆……☆

اقبالؔ اور فائزؔ کا تصادم گویا جدید اور قدیم کا تصادم تھا۔ دونوں بزرگوں کے شاگرد ایک دوسرے کو سرِ مشاعرہ للکارتے اور بڑے دلچسپ ادبی لطائف دیکھنے اور سننے میں آتے۔ ایک مرتبہ شادؔ عظیم آبادی بنارس آئے، جن کے اعزاز میں اقبالؔ نے اپنے مکان پر ایک بزم سخن منعقد کی۔ اس محفل میں فائزؔ نے مختلف صنعتوں میں اپنے کچھ اشعار پڑھ کر سنائے۔ شادؔ کے ہمراہ ان کے ایک شاگرد آشفتہؔ بھی تھے۔ انھیں جو شرارت سوجھی تو بول اٹھے کہ حضور کچھ صنعت مہملہ میں بھی عنایت ہو۔ فائزؔ نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ جناب میرا سارا کلام اسی صنعت میں ہے۔ آشفتہؔ کی حرکت اہل محفل کو بہت ناگوار گذری، خود شادؔ صاحب نے معذرت چاہی لیکن شاگردان فائزؔ کے دل میں یہ غلط فہمی جاگزیں ہوگئی کہ آشفتہؔ نے یہ حرکت اقبالؔ کے اشارے سے کی ہے۔ اس واقعہ کے چند روز بعد اقبالؔ کے عزیز دوست حکیم اابوالحسن صاحب نسیمؔ نے ایک شاندار مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ مصرع طرح تھا۔ آپ کی بات کا ٹھکانا کیا”۔ مشاعرہ میں اقبالؔ نے مطلع پڑھا۔

بلبلِ زار کا ٹھکانا کیا
چند تنکے ہیں آشیانہ کیا

فائزؔ کے ممتاز شاگرد غنیؔ مرحوم نے سرِ مشاعرہ ٹوکا کہ اقبالؔ صاحب دوسرے مصرع کو یوں پڑھیے:-

چار تنکے ہیں آشیانہ کیا

ابھی مشاعرہ جاری تھا کہ حکیم مسیح الدورانی وحشیؔ شاگرد فائزؔ نے ایک لڑکے کو پیش کیا کہ صاحبزادے نے ایک شعر کہا ہے۔ رات زیادہ جا چکی ہے۔ انھیں نیند آ رہی ہے۔ شعر سُن کے انھیں جانے کی اجازت دیدی جائے۔ سامعین مشتاق ہوئے۔ لڑکے نے یہ شعر پڑھا۔

کبھی سنی ہوئے کبھی شیعہ
آپ کے باپ کا ٹھکانا کیا

حقیقت یہ تھی کہ حکیم ابوالحسن نسیمؔ کے والد حکیم محمد جعفر مرحوم پہلے حنفی المذہب تھے۔ بعد میں شیعہ ہو گئے تھے۔ شعر میں اسی طرف اشارہ تھا۔ اس شعر سے اہل مشاعر میں سخت برہمی پیدا ہو گئی۔ لیکن فائزؔ نے جو صدر مشاعرہ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ موقع سنبھال لیا۔ مذکورہ واقعات سے شاگردان فائزؔ اور اقبالؔ بنارسی کے احباب میں بہت کشیدگی پیدا ہو گئی تھی، جس کے تاثرات دیر تک قائم رہے۔

ان ہی دنوں میں حکیم مسیح الدورانی وحشیؔ نے مصرع نکالا۔

ہے دم شمشیر قاتل تار دامانِ قضا

اور لوگوں کو یہ چیلنج دے کر مدعو کیا کہ دیکھیں اس مصرع پر کون کون غزل کہتا ہے۔ شاگردان فائزؔ نے طبیعت پر بڑا زور دے کر غزلیں نکالیں۔ ایک شاگرد افسوںؔ نے مصرع کے ہر لفظ کو قافیہ

بنا کر سات غزلیں لکھیں۔ مشاعرہ میں ایک غیر معروف شخص نے ایک غزل پڑھی جس کے ہر شعر میں حکیم وحشی پر کچھ نہ کچھ چوٹ تھی۔ ایک شعر تھا۔

شاعری بناضی وقارورہ آمیزی نہیں
خود مسیحا آپ ہیں بیمار دامانِ قضا

حکیم وحشی تن وتوش کے اچھے اور بگڑے دل آدمی تھے۔ ڈنڈا سنبھال کے کھڑے ہو گئے۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے ٹھنڈا کیا۔ [1]

لیکن اس قسم کی ہنگامہ آرائیوں کے باوجود فائزؔ مرحوم خواجہ اقبالؔ سے بہت مخلصانہ سلوک کرتے تھے۔ دراصل انھیں کسی سے بگڑنا آتا ہی نہیں تھا۔

فائزؔ بدیہہ گوئی کے فن میں بڑے ماہر خیال کیے جاتے تھے جہاں کسی نے کوئی مصرع دیا انھوں نے تڑ سے اس پر مصرع لگایا۔ لکھنؤ کے ایک مشہور شاعر ان کے یہاں مقیم تھے رخصت ہوتے وقت ان کا دامن گھر کے صحن میں اُگی گلاب کی جھاڑیوں سے اُلجھ گیا۔ لکھنوی نے مصرع کہا کہ

دامنِ گل جو الجھ جائے کہیں خاروں سے

استاد نے فوراً دوسرا مصرع لگایا۔

بلبلیں آ کے چھڑا دیں وہیں منقاروں سے

فائزؔ کو دور دور کے مشاعروں میں مدعو کیا جاتا تھا۔ نواب مرشد آباد اور نواب رام پور بھی ان کے مداح تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے لکھنوی طرز سخن کی داد زیادہ تر لکھنؤ ہی میں پاتے تھے۔

---

[1] تذکرہ شعرائے بنارس از محشر بنارسی مرحوم مملوکہ جناب عباس حسین اور ڈاکٹر حسن بیگ۔

لکھنؤ جا کے سنو اور سناؤ فائزؔ
ڈھونڈتے کیا ہو بنارس میں سخنداں کوئی

فائزؔ کے مورث اعلیٰ میرک ولایتی اصفہان سے ہندوستان آئے تھے۔ یہ خاندان ایک عرصہ تک بہار کے مونگیر علاقے میں بھاگل پور میں مقیم رہا بعدازاں میر نوازش حسن بنارس چلے آئے اور یہ سلسلہ مولوی الطاف حسین رابطؔ اور ان کے صاحبزادے مرزا محمد حسن فائزؔ پر پہونچ کر ختم ہوگیا کیونکہ فائزؔ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ فقط دو صاحبزادیاں تھیں۔ ان کے ایک داماد میر وزیر حسین عروجؔ تھے جن کا شمار اپنے دور کے اچھے شعرا میں ہوتا تھا۔ اور جنھوں نے محلّہ گوری گنج میں اپنا پرنٹنگ پریس قائم کر رکھا تھا۔ فائزؔ کا دیوان ''تاج سخنور'' اس پریس میں عروجؔ صاحب نے ۱۳۲۰ھ ہجری مطابق ۱۹۰۴ء میں چھاپا تھا۔ بعد میں ۱۹۲۶ء میں فائزؔ کے دیوانے نواسے واجد حسین نے اس مطبع جلالی میں آگ لگادی تھی جس سے بہت سے قدیم ادبی ذخائر تلف ہوگئے۔ شاید خود فائزؔ کے اردو و فارسی کلام کا ایک کثیر حصہ اسی آگ کی نذر ہو چکا ہے۔ عروجؔ شاعری میں فائزؔ کے شاگرد تھے اور بڑے استاد پرست تھے۔ استاد کے کلام کو سنبھال سنبھال کر رکھتے تھے۔ بہت خوش نویس بھی تھے۔ استاد سے جو درس لیتے تھے اسے نستعلیق خط میں کتابی صورت میں لکھتے جاتے تھے۔ عروض پڑھتے وقت توضیحی مثالیں کلام فائزؔ سے جمع کی ہیں۔

آخری عمر میں فائزؔ کو بہت سے صدمات سہنا پڑے۔ انھوں نے اپنے دونواسوں واجد حسین اور حامد حسین کو اسی دلار سے پالا تھا جیسے مرزا غالبؔ نے باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو۔ ۱۹۲۶ء میں واجد حسین پر دیوانگی کا زبردست دورا پڑا اور انتہائی مجبوری میں فائزؔ نے ان کو آگرہ کے پاگل خانہ میں داخل کروادیا۔ یہاں سے واجد حسین ایک دن ایسے گم ہوئے کہ اب تک کوئی نشان نہیں مل سکا۔ دوسرے نواسے حامد حسین جن کو اب فائزؔ اپنی جان سے عزیز

رکھتے تھے۔ ۸/مئی ۱۹۲۹ء کو اچانک انتقال کر گئے۔ گھر والوں نے مصلحتاً اس خبر کو چھپائے رکھا۔ ۱۳/مئی کو صبح کو کسی طرح فائزؔ کو اس موت کی خبر مل گئی۔ ایسا صدمہ ہوا کہ اسی دن نواسے کے پیچھے پیچھے ملک عدم کی راہ لی۔ فائزؔ روڈ پر ان کے ایک زرخرید مکان میں ان کی نواسی اور نواسی کے صاحبزادے ان کی یادگار ہیں۔ ہاشم صاحب اور کاظم رضوی صاحب کے علاوہ ان کے ایک فرزند معنوی بھی موجود ہیں۔ جن کی شاگردانہ عقیدت نے استاد کے ہاتھ کا ایک ایک پرزہ حرز جاں بنا کے رکھا ہے۔ میری مراد جناب محمد اکبر خاں لودھی بنارسی، پرنسپل، انٹر کالج بدوئی سے ہے جن کے پاس فائزؔ کا غیر مطبوعہ فارسی کلام ''چمنستانِ عجم'' اور بیشتر اردو کلام محفوظ ہے۔

فائزؔ کے مداحوں اور شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ وہ ڈاکٹر بھگوان داس۔ رام چندر شکل۔ شیو پرشاد گپت اور سورگیہ پنڈت مدن موہن جی مالویہ کے ہم نشینوں میں سے تھے۔ ہندو یونیورسٹی کی تعمیر و تشکیل میں ان بزرگوں کے ساتھ فائزؔ کی حب الوطنی نے بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ بنارس کی سرزمین ان کے لیے بے انتہا کشش رکھتی تھی۔ خود فرماتے ہیں۔

محروم سیاست فلکم کرد بعالم
کنجی ز بنارس عربِ ما عجم ما
فائزؔ کو ملی روشنی طبع ازل سے
تا شمع بنارس میں جلے قبرِ حزیںؔ پر

فائزؔ کے ممتاز شاگردوں میں آغا حشرؔ کاشمیری، جگن ناتھ رتناکر، غنیؔ بنارسی، بیتابؔ بنارسی، فرخؔ بنارسی، حافظ مقبول احمد کوکبؔ بنارسی، مرزا طاہر بخش طاہرؔ، مولوی نذیر حسین لائقؔ، حافظ محمد یوسف افسوںؔ، محمد رفیع اللہ خاں نیرؔ، عبدالحمید ناصرؔ، حکیم وحشیؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو

کے مایۂ ناز فطرت نگار شاعر محشرؔ بنارسی کو فائزؔ سے وہی نسبت ہے جو اقبالؔ کو داغؔ سے تھی۔

فائزؔ کے شاگردوں میں مسلم الحریری بنارسی، نذیرؔ بنارسی، حفیظؔ بنارسی، ڈاکٹر مسرورؔ بنارسی اور جوہرؔ صدیقی جیسے خوش گو شعرا شامل ہیں۔ بزم فائزؔ میں جب تک ایسے چراغ روشن ہیں، فائزؔ کے فیض کا نور دور دور تک پھیلتا رہے گا۔

اس سے پہلے کہ ہم کلام فائزؔ کا جائزہ لیں۔ یہ پتہ چلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود شاعر کی اپنی شاعری کے بارے میں کیا رائے ہے۔ فائزؔ کے غیر مطبوعہ کلام میں ایسے اشارے اکثر مل جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

دعویٰ ہے کسی کو غزل خواں ہوں میں
کہتا ہے کوئی صاحب دیواں ہوں میں
دشوارئ نظم کو سمجھ کر فائز
دانا یہی کہتا ہے کہ ناداں ہوں میں

ایک اور رباعی ہے:

کس درجہ ہوں ناچیز اور حقیر اے فائزؔ
بات اپنی نہیں ہے دل پذیر اے فائزؔ
گویا کہ زمانہ مولوی شبلی ہے
میں ہوں ہمہ تن نظم دبیرؔ اے فائزؔ

اسے زمانے کی ناقدری کہیے یا خود فائزؔ کی شکست نفسی۔ بہر حال وہ شاعری میں انا کے شکار نہیں تھے لیکن ان باتوں کے باوجود ان کو یہ احساس ضرور تھا کہ ان کی ادبی خدمات کی شہرت ادب کے منصفوں کے کانوں میں پہونچ چکی ہے اور یہ کہ انھیں ''غوغائے عامیان'' کی

ضرورت نہیں:

فائزؔ سخن کا میرے شہرہ ہے منصفوں میں
محتاج میں نہیں ہوں غوغائے عامیاں کا

منصفوں میں اس شہرت اور غوغائے عامیان سے اس بے نیازی کے بعد بھی شاعر اپنے بارے میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

کچھ کام بجز نفسِ شماری نہ ہوا   حاصل ہنر کار براری نہ ہوا
اے نقص کلام ناقص العجز بھی ہوں   اظہار کمال خاکساری نہ ہوا

شاعر کی اس خاکساری اور کسرِ نفسی کے بعد جب اس کے سرمایۂ شعری پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے پہلا تاثر جو قاری کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ موضوعات شعری محدود ہوں تو ہوں لیکن شاعر کا میدان شاعری بہت وسیع ہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں فائزؔ نے اپنے علم و فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ غزل گوئی میں وہ طاق ہیں لیکن ان کی مشق اور مہارت کا مظہر وہ تضمینیں ہیں جو انھوں نے مختلف استادوں کے کلام پر اردو اور فارسی دونوں میں پیش کی ہیں۔ سلام، نوحے، رباعیاں، مثنوی، قطعات بوسیدہ بیاضوں اور کاغذ کے پرزوں کی صورت میں منظرِ عام پر آنے کے منتظر ہیں۔ ان میں سے بیشتر چیزیں اخلاقی اور موضوعات پر لکھی گئی ہیں لیکن شاعر کی فنی چابک دستی اور صناعی ہر جگہ داد طلب ہے۔ ''تاج سخنور'' غزلیات اور تضامین پر مشتمل ہے۔ اس دیوان کو ۱۹۰۴ء میں شایع کیا گیا تھا۔ شاعر اس کے بعد پچیس سال تک زندہ رہا۔ اس کی پر گوئی ضرب المثل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے اور بعد کا بہت کچھ کلام اب موجود نہیں۔

فائزؔ ذہنی اعتبار سے انیسویں صدی کے ابتدائی دور کے شاعر ہیں۔ وہ ساری عمر

بنارس میں رہے لیکن ان کی ذہنی پرورش لکھنؤ کے اس ماحول میں ہوئی جس میں روایتی معشوق کی مفروضہ کنگھی، چوٹی اور محرم اور مسّی کی داستان سرائی میں بڑے بڑے ماہرین فن نے اپنے علمی وقار اور زاہدانہ اعتبار کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ ایک سی تشبیہات اور تلمیحات کو قافیہ اور ردیف کے مختلف سنگلاخ سانچوں میں ڈھالنا اس ماحول میں ایک معجزے سے کم نہیں سمجھا جاتا ہے۔

پہلے معشوق کا ''سراپا'' ملاحظہ فرمائیے:

کنگھی سے ہاتھ اٹھا کے شب وصل لیٹیے
کب گیسوؤں سے آپ کے ہے پیچ وخم غلط
چوڑیوں کے شور سینے منہ کڑوں کا دیکھیے
آپ کے زیور بھی ہیں اے جان ہنستے بولتے
اس پری رو نے کہا باندھ کے جوڑا سر پر
آج چوٹی کے بکھیڑے سے تو پیچھا چھوٹا
دیجیے اپنے ڈوپٹے کا کفن عاشق کو
ٹل گئی سر کی بلا آپ کا پلّہ چھوٹا
پھول چوٹی میں جو بکھرے تو یہ ساماں دیکھا
رات بچھلی ہوئی تاروں کو پریشان دیکھا
چین کیا پائے کوئی ساتھ میں تیرے اے شوخ
چوڑیوں کو بھی اسی ہاتھ میں نالاں دیکھا
مسی آلودہ دونوں لب سخن کے زیب و زینت ہیں
کہوں کیا رنگ اس سودؔا کے مطلع کا جما کیا کیا

کان کے بالوں کی مچھلی سر کے بالوں میں پھنسی
دام ماہی گیر گویا دام گیسو ہوگیا
سرمہ لگایا تو نے جو تیغِ مژہ کے پاس
کچھ دور ایک میل سے پھر اصفہان نہ تھا

اب ایک ہی تلمیح کے مختلف استعمال سماعت فرمایئے:-

ہو عزیزوں سے جو تکلیف تو غربت بہتر
بک کے یوسف یہی کہتے تھے کہ ستا چھوٹا
کہتے ہیں وہ سن کے ذکر یوسف
دیکھا تو نہیں کہ خوب رو تھا
تھا غنیمت کہ نہ تھے مصر کے بازار میں تم
مفت میں اور بھی ارزاں مہہ کنعاں ہوتا
جان کی فکر نہ تھی رنج یہ تھا یوسف کو
باپ کا نام ڈبوتے ہیں برادر ہوکر
نیا عالم کیا، آئینہ خانے میں عیاں ہوکر
وہ یوسف آج گھر میں پھر رہا ہے کارواں ہوکر
نرخ بازار اب اے یوسف ثانی یہ ہے
جان دے دیتے ہیں سب نام تمہارا لیکر
اگر سچ پوچھیے تو زر کا عالم میں وہ رتبہ ہے
کہ یوسف سے بھی بڑھ کر اس کو اہل کارواں سمجھے

اردو شاعری کے اس ماحول بعید میں استادی کا معیار اس کاریگری پر ٹھہرتا ہے کہ شعر میں الہام کا پہلو زیادہ سے زیادہ رکھا جائے۔ مرتبہ الفاظ کو ایک دوسرے سے جس قدر زیادہ معنوی اور لفظی مناسبت ہوگی شعر کہنے والے کی اُستادی اسی نسبت سے مستند تر ہوتی جائے گی۔ قادر الکلام شاعر اس کو تسلیم کیا جائے گا جو اشعار میں پہلودار الفاظ استعمال کرے، اسی لئے بعض اوقات شاعری ضرب و تقسیم کا ایک ایسا حل ناپذیر معمہ بن کے سامنے آتی ہے۔ جس کے سارے بل نکال کے سیدھا سیدھا مفہوم سمجھنا اور سمجھانا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ مثال کے طور پر فائزؔ کا درج ذیل شعر ملاحظہ فرمائیے:-

مریض عشق نے پائی نہ صحت تیری باتوں میں
غلط ہے تو جو کہتا ہے کہ میں آؤں گا میت پر

میّت، مریض، صحت، غلط وغیرہ الفاظ میں رعایت لفظی کے مظاہرے کے بعد شعر کا ظاہری مطلب تو یہ ہے کہ مریض عشق اس بات کو غلط سمجھا ہے کہ معشوق اس کی میّت پر آئے گا لیکن ذرا غور کیجیے۔ تو ایک دوسرا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ میّت بالفتحہ غلط ہے اس کا صحیح لفظ بالکسر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مریض عشق نے تیری باتوں میں صحت اس لیے نہیں پائی کہ تو نے میت (بالفتحہ) پر آنے کے لیے کہا ہے اور یہ غلط ہے۔ جس شاعر کا کلام اس درجہ کا ہو بزرگ اس کی استادی کا صدق ولی سے اعتراف کرتے تھے۔ اس کسوٹی پر اگر فائزؔ کا کلام پرکھا جائے تو ان کی استادی میں کوئی کلام نہیں رہ جاتا۔

ہم ایسے خستہ جاں روئے شفا کیا خاک دیکھیں گے
جنھیں جو دیدۂ بیمار کا شک صادِ صحت پر
دیکھی نہیں جاتی ہے کہ مری شکل کسی سے
کھلتا ہے کہ مائل ہوں کسی پردہ نشیں پر

آگ غصہ سے بنے تم میں بنا آتش پرست
بت خموشی سے ہوئے تم میں بھی ہندو ہوگیا

اگر ز لال نہیں درد ساغر مئے لا
غرض تو صاف یہ ہے کہ ساقیا کہ جو ہے لا

ہوس خط کے لکھنے کی مر کر بھی ہے
ستمگر میرا سر قلم ہوگیا

لاغری میں لے گئی وحشت جو صحرا کی طرف
طوق گردن سایۂ مژگانِ آہو ہوگیا

پوست کھینچا بوسہ دنداں جسے تم نے دیا
راستی دعویٰ کی ثابت ہوگئی مسواک میں

ذرا انجام دیکھو خاک پتھر بھی نہیں حاصل
صفت بالفرض کچھ اکسیر میں ہو یا کہ پارس میں

اس حور کا جو نام لکھا کلک غیر نے
فائزؔ گل بہشت تھا منقارِ زاغ میں

سیاہی کا رنگ اُڑ گیا رکھے رکھے
غریبوں کے خط کا کبوتر یہی ہے

استاد کی صفت گری کی ان چند مثالوں کے بعد اب ان کی ایک نمائندہ غزل پیش کی جاتی ہے جن سے ان کے تغزل کے اجزائے ترکیبی کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔

دیر ہندو سے مسلماں سے مُصلّا چھوٹا
تم سے ملنے کے لیے خلق سے کیا کیا چھوٹا

عشق لیلےٰ میں قرار دل شیدا چھوٹا
قیس پڑھنے کو جو بیٹھا تو یہ شوشا چھوٹا
واہ رے شوق شہادت کہ مجھے جب دیکھا
خود بخود ہاتھ میں قاتل کے تپنچا چھوٹا
کیا جگہ سیر کی ہاتھ آئی ہے اے بحر جمال
محرم آبِ رواں میں جو کنارا چھوٹا
چشم طرار کو ہے شوق نظر بازی کا
پھر رہا ہے یہ ہرن شہر میں چھوٹا چھوٹا
لے گیا عاشق لاغر کو ہوا کا جھونکا
بے خطا آپ کے پہرے کا پیادا چھوٹا
تیرے دیوانوں کی ہر سمت علمداری ہے
اے پری قیس سے سنتے ہیں کہ صحرا چھوٹا
ہوں وہ میکش کہ لحد پر جو ہوئی تیاری
تا ابد گنبدِ مرقد سے نہ مینا چھوٹا
میں جو کہتا ہوں کہ ہوش و خرد و صبر گئے
وہ یہ کہتے ہیں کہ اچھا ہے بکھیڑا چھوٹا
نازکی یار کی مہندی میں سمائی ایسی
پھول ہاتھوں میں لیا رنگ حنا کا چھوٹا
روز گھر باغ سے جاتے ہیں وہ گھبرائے ہوئے
کل کرن پھول گرا آج ہے پتّا چھوٹا

لکھ چکے نام اسیران کمند کا کل
آپ کے فرد سے ہے فائزؔ شیدا چھوٹا

ہماری ادبی روایات میں ایک مستقل روایت یہ بھی چلی آتی ہے کہ صاحب دیوان ہونے سے بہت پہلے شاعر کو مشاعرے میں شریک ہو کر عوام سے قبول عام کی سند حاصل کرنا پڑتی تھی۔ کاغذ پر ثبت ہونے سے پیشتر کلام شاعر کو اسٹیج پر اپنی ثابت قدمی کا ثبوت دینا پڑتا تھا۔ یہ مرحلہ بہت سخت ہوتا تھا۔ طرح کے مصرعے ایسے عجیب و غریب اور ایسے سنگین ہوتے تھے کہ بہت سے نیم پختہ کھلاڑی مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی ہمت ہار دیتے تھے۔ ایسے اکھاڑوں میں خم ٹھونک کر اترنا صرف بڑے بڑے جگادریوں کا کام ہوتا تھا۔ عمرِ شاعری اور فضیلت کے لحاظ سے حفظ مراتب کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ اس طرح مستقل طور پر شاعر کے پڑھنے کا وقت مقرر ہو جاتا تھا۔ اکثر شاعر اسی تعین سے فائدہ یا نقصان اٹھاتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر ایک مبتدی بہت اچھا کہنے لگا ہے اور اس کے پڑھنے کی جگہ بہت پہلے ہے تو عین ممکن ہے کہ سامعین اس کو اس خیال سے درخور اعتنا خیال نہ کریں کہ وہ مشاعرے کا دیباچہ ہے۔ اسی طرح اگر کسی معمر شاعر کے پڑھنے کا وقت بہت بعد میں آتا ہے تو قرین قیاس یہ ہے کہ اس کی بزرگی کو مشاعرے کا تتمہ سمجھ کر اس کے گھٹیا کلام کو بھی برداشت کر لیا جائے گا۔ لیکن جہاں پارٹی بازی ہوتی تھی وہاں بزرگوں کو بھی کانٹوں میں گھسیٹا جاتا تھا۔ ایسے دشوار گذار مرحلوں پر استاد کو اپنی ساری امت کا ناجی بننا پڑتا تھا۔ بصورت دیگر دوسرے خلیفہ کا جھنڈا بہت اونچا گاڑے جانے کا خطرہ درپیش ہوتا تھا۔ فائزؔ اپنے وقت کے مرد میداں تھے۔ ان کی قلمرو بہت وسیع تھی اس لیے ان کا پرچم دور دور تک لہراتا تھا۔ اس کامیابی کے پیچھے ان کی سینکڑوں معرکہ آرائیوں کی داستانیں موجود ہیں جن کے چشم دید گواہ تو اب رفتہ رفتہ ملک عدم میں جا بسے ہیں لیکن ان کے دیوان میں

اب بھی ان فتوحات کی زندہ اور تابندہ یادگاریں موجود ہیں۔ ایسے موقعوں پر سنگلاخ زمینوں میں استاد کی طبع رواں کیا کیا شگوفے کھلاتی تھی اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوگا۔

سرتپ ہجر میں اے نالۂ شب گیر نہ کھینچ
آتش داغ سے عطر گل تاثیر نہ کھینچ
تو پسینے میں خط روئے طلائی نہ بھگو
شرم کھا کر عرقِ نسخہ اکسیر نہ کھینچ
اس طریقہ سے گئی ہے کس ترے بالے کی گونج
نیش عقرب ہوگئی ہے بس ترے بالے کی گونج
پائیں گے دشمن مزا کچھ بوسۂ رخسار کا
ناگنی بن کر جو لے گی ڈس ترے بالے کی گونج
اے بت غافل سنے گا تو جبھی جس دم بنے
مدِ آہِ فائزؔ بے کس ترے بالے کی گونج
وہ فتنہ جُو صنم آیا تو صورتِ ناقوس
اڑے گا رنگِ رخِ برہمن پکار پکار
سنو سنو غزلِ طرح پڑھتے ہیں فائزؔ
چمن میں کہتے ہیں مرغِ چمن پکار پکار
سوز و گداز دل سے ہوئی راہی عدم
ہر چند شمعداں میں مقیدِ تھا پائے شمع
تم انوریِ عصر ہو فائزؔ غزل پڑھو

روشن ضمیر بزم ہو صائب ہو رائے شمع
دیکھے جو زخمیوں کا ترے اضطراب تیغ
ہوجائے مثل موجِ رواں آب آب تیغ
تقطیع دل میں محو ہے وہ طفلِ شعر خواں
فائزؔ ہر اک ہے سطر کتابِ نصاب تیغ
دس بنایا صفر دیکر تاکہ ہو تسکین دِل
اس نے لکھا تھا کہ دوں گا بوسۂ رخسار ایک
دے کے دل فائزؔ جہاں کا حال ظاہر ہے مدام
پیشگی قیمت ادا کر کے ملا اخبار ایک
یہ آب و تاب شعلہ رخسار دیکھیے
پانی کے بدلے بھر گئی چاہِ ذقن میں آگ
خرامِ یار سے ہے آب و تابِ خندۂ گل
ہوا ہے صبح قیامت خطاب خندۂ گل
جب کہ خونِ سرِ شوریدۂ فرہاد بہے
بلبلہ نہر کا معکوس نمکداں ہوجائے
قیدِ ترکیب متیں سہل نہیں اے فائزؔ
جوڑ میں شعر کی ہاتھ آئے وہ زنداں ہوجائے
پرسوں کہا تھا آئیں گے برسوں میں آئے ہو
سچ ہے تمہاری بات بھی ہوتی ہے کم غلط

فآئز شکن سے زلف کے تحقیق ہو گیا
کسرہ صحیح مِشک میں ہے اور ضم غلط
لی ہے رو رو کے شب ہجر میں ہر دم کروٹ
موج کی طرح بدلتے ہی رہے ہم کروٹ
نہ پھرا وصل میں وہ آئینہ رو میری طرف
ہو گئی سدِ سکندر سے بھی محکم کروٹ
کب اس گل نازک کو گوارہ ہو کڑی دھوپ
سمجھا ہے درختوں کی گھنی چھاؤں بڑی دھوپ
کس مہر نے پھیلائے ضیائے دردنداں
شبنم کی طرح رات کو گلشن میں پڑی دھوپ
در پر کسی گل کے یہ نہیں خطِ شعاعی
دامن میں لیے آئی ہے پھولوں کی چھڑی دھوپ
خار و خس ہیں لاغری میں استخوانِ عندلیب
عندلیب اب آپ ہی ہے آشیانِ عندلیب
روشنی نجد میں کیوں آج ہے پھیلی مجنوں
رونق افروز ہے کیا ناقہ لیلیٰ مجنوں
دھوم ہے خانہ زنجیر میں تیاری ہے
خاص مہمان ہے فآئز تو طفیلی مجنوں

ایک خاص بات جو استاد کی غزلوں میں عموماً نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اکثر مقطعوں

میں اور کہیں کہیں اشعار میں بھی ان کے دینی اعتقادات بے ساختہ نظم ہو گئے ہیں۔ اہل بیت سے ان کی محبت خالص تغزل کے ماحول میں بھی بے اختیار نمایاں ہو جاتی ہے۔ ایسے مقامات پر ان سے نظم وضبط کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور وہ اپنے مذہبی بزرگوں کی یاد میں اور اپنی مغفرت کی فکر میں محو ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر کہیں خود ساختہ عشقیہ ماحول سے تھوڑی دیر کے لیے نجات مل جاتی ہے تو حکیمانہ باتیں بھی ان کی زبان پر آجاتی ہیں۔ اس قسم کے پاکیزہ اشعار کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بعد راحت نہ خدا دے تکلیف
دھوپ بدلی کی کڑی ہوتی ہے

فائزؔ جو نظر عرش معلیٰ سے گذر جائے
تکمیل نظر آئے کہیں شعر کے فن میں

دولت کسی بدشکل کی تصویر ہے فائزؔ
جو عیب نظر آئے وہ داخل ہے ہنر میں

پراگندہ ہیں دم بھر میں عناصر
حیات اے دل ہرن کی چوکڑی ہے

اگر سچ پوچھیے تو زر کا عالم میں وہ رتبہ ہے
کہ یوسف سے بھی بڑھ کر اس کو اہل کارواں سمجھے

کٹی افسوس کس غفلت میں میری عمر کی منزل
مجھے سوتا ہوا لے کر چلے ہیں لوگ بستر سے

اپنی دوا دوِش سے ہے آرام خلق کو
ہم بوستان دہر میں بادِ صبا ہوئے

خاکساری سے ہے مثلِ چاہ دل کی آبرو
جس قدر ہو پست اتنی خوب یہ تعمیر ہے

ہوش میں آؤ جو آئے ہو جہاں میں فائزؔ
کیا کہو گے کوئی پوچھے گا اگر کیا دیکھا

بلندی کب گئی روشن دلوں کی تیرہ روزی سے
نہیں گردوں دھواں ہے مشعل مہر منور کا

فائزؔ کی نظر میں وہ جذبہ جس سے وہ غزل خوانی پر آمادہ ہوتے ہیں داد حاصل کرنے کی آرزو ہے۔

داد ملنے کی تمنّا ہے فقط اے دوستو
بار دیگر جس نے فائزؔ کو غزل خواں کر دیا

لیکن یہ حصول داد اتنا آسان کام نہیں، جگر کاوی اور دیدہ ریزی کے بعد بھی اسے ''بیٹھے بیٹھے ہاتوں کا ہنانا'' خیال کیا جاتا ہے۔

کہتا ہے وہ بت شعر عبث کہتے ہو فائزؔ
بیٹھے ہوئے ہاتوں کا ہنانا نہیں اچھا

ہاتوں کی اس ہناوٹ میں سب سے پہلی ضرورت تو اس ہات کی ہے کہ مصرع پر مصرع اس خوبی سے لگایا جائے کہ دوست دشمن سب کے منہ سے واہ واہ نکل جائے۔ واردات قلبی اور مشاہدات عینی کے تجزیہ میں غور وفکر کی بجائے قدیم شاعری کے اس ماحول میں مصرعے پر مصرع فٹ کرنا شاعرانہ کمال کی پہلی منزل ہے۔ جو اس امتحان سے نکل گیا وہ کامیاب۔ دوسرے متشاعر فائزؔ اس فن میں مجتہد کا درجہ بھی رکھتے ہیں اور منتہی کا بھی۔ دوسرے استادوں کے مصرعوں پر انھوں

نے اس چابکدستی سے مصرع بٹھائے ہیں کہ ان کے مداحوں کے دل میں ان کی شاعرانہ عظمت کا سکہ ہمیشہ کے لیے بیٹھ گیا ہے۔ قافیہ بندی میں ذرا اجتہاد ملاحظہ فرمائیے۔ ولؔی دکنی کے اشعار پر کس خوبی سے تضمین کی ہے:-

تو برائی نہ کر خداسوں سے ڈر
کج ادائی نہ کر خداسوں سے ڈر
دل کو آئینہ کر خداسوں سے ڈر
بے وفائی نہ کر خداسوں سے ڈر
جگ ہنسائی نہ کر خداسوں سے ڈر

یہاں ایک اور بات قابل غور ہے۔ دوسروں کے اشعار پر تضمین کرتے وقت فائزؔ اپنے ماحول سے نکل کر زیر بحث شاعری کی قلم رو میں داخل ہو جاتے ہیں، یعنی مصرع لگاتے وقت انہیں اسی مقام سے بولنا پڑتا ہے جہاں سے دوسرا شاعر بولتا ہے۔ اس نقل مکانی سے فائزؔ کے فنی جوہر زیادہ درخشاں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ولؔی۔ حاتؔم۔ فغاںؔ۔ جانجاناںؔ۔ مظہرؔ۔ تاباںؔ۔ سوداؔ۔ میرؔ۔ میر دردؔ۔ میر سوزؔ۔ جرأتؔ۔ میر انشاؔ۔ مصحفیؔ۔ شاہ نصیرؔ۔ قدرتؔ۔ ناسخؔ۔ اسیرؔ۔ غالبؔ۔ قادر بخش صابرؔ۔ امیر مینائیؔ۔ داغؔ وغیرہ کی غزلوں پر بھرپور تضامین پیش کی ہیں۔ بعض اوقات ایک ایک شعر پر کئی کئی رخ سے مصرعے لگائے ہیں اور اس طرح فن شعر گوئی میں اپنی مشق و مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مرزا جان جاناں مظہرؔ کا شعر ہے۔

گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کے بھی سزاوار نہ تھا

فائز نے اس شعر پر تیرہ دفعہ تضمین کر کے تیرہ مختلف بندوں میں پیش کیا ہے۔ کچھ بند ملاحظہ ہوں:۔

(۱) وصل سے عالم حیرت میں سروکار نہ تھا
میرے گھر آؤ یہ مقصود بھی زینہار نہ تھا
پھونک دو داغ سے ایسا تو سیہ کار نہ تھا
گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کے بھی سزاوار نہ تھا
(۲) سالہا سال سے تھا تازہ گرفتار نہ تھا
کثرت زخم سے تھا رشک چمن خار نہ تھا
کس لیے زلف سے پھینکا ہے کوئی بار نہ تھا
گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کے بھی سزاوار نہ تھا
(۳) دایم الحبس تھا ہر چند گنہگار نہ تھا
پھر بھی راضی تھا رہائی کا طلبگار نہ تھا
شاکی کشمکش گیسوے خمدار نہ تھا
گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کے بھی سزاوار نہ تھا
(۴) دیکھتے ایک نظر آپ یہ دشوار نہ تھا
گرچہ توقیر کے شایاں سرِ بازار نہ تھا
گرچہ اشفاق کے لائق دم گفتار نہ تھا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کے بھی سزاوار نہ تھا

مظہرؔ کی اسی غزل کا مقطع ہے۔

لوگ کہتے ہیں موا مظہرؔ بے کس افسوس
کیا ہوا اس کو وہ اتنا بھی تو بیمار نہ تھا

استاد نے اس مقطع پر بھی کئی رخ سے تضمین کی ہے اور خوب گل افشانیاں فرمائی ہیں۔ مصرع کے مختلف الفاظ کو قافیہ بناتے ہوئے مختلف بندوں میں فرماتے ہیں۔

(۱) حیف وہ خستہ دل بے پر بے کس افسوس
ہائے وہ تفتہ تنِ مضطر و بے کس افسوس
آہ وہ شیفتۂ ششدر بے کس افسوس
لوگ کہتے ہیں موا مظہر بے کس افسوس
کیا ہوا اس کو وہ اتنا بھی تو بیمار نہ تھا

(۲) تھا غم اندوز بلا مظہر بے کس افسوس
کر گیا خوب وفا مظہر بے کس افسوس
بخش دے تجھ کو خدا مظہر بے کس افسوس
لوگ کہتے ہیں موا مظہر بے کس افسوس
کیا ہوا اس کو وہ اتنا بھی تو بیمار نہ تھا

(۳) تھا عجب مرد حق آگاہ سخن رس افسوس
دس جو روتے ہیں تو کرتے ہیں کہیں دس افسوس
جس نے یہ حال سنا اس نے کہا بس افسوس

لوگ کہتے ہیں موا مظہر بے کس افسوس
کیا ہوا اس کو وہ اتنا بھی تو بیمار نہ تھا

(۴) جس سے تھا قافلہ خلق کو شوق پا بوس
اس کے رحلت کا زمانے نے بجایا ہے کوس
ایک عاشق کا ہوا خاتمہ فائزؔ کو بھی کوس
لوگ کہتے ہیں موا مظہر بے کس افسوس
کیا ہوا اس کو وہ اتنا بھی تو بیمار نہ تھا

میرؔ کی مشہور غزل ہے۔

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے
ہم نے کیا دل پہ چوٹ کھائی ہے

اس کی تضمین میں فائزؔ کی قادر الکلامی دیکھیے۔

آہ تاکے شکستگی دل کی
ہے عجب شے شکستگی دل کی
مرحبا اے شکستگی دل کی
دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
کون لے جائے نامہ دلبر
ہو اسے حال دل کی خاک خبر
قاصد آ آ کے پھر گیا اکثر

لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر
شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

رشک فآئز کو کل تھا دامن گیر
عشق لیلےٰ کی دیکھ کرتا شیر
یہی کہتا تھا واہ رے تقدیر

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

مرزا غالبؔ کی غزل پر فآئزؔ کی یہ تضمین بھی ان کی استادی کی مضبوط دلیل ہے۔

کبھی پوچھا نہ ظالم نے کہ تم بے خانماں کیوں ہو
وطن کیوں چھوڑ کر نکلے ہو رسوائے جہاں کیوں ہو
اگر پوچھا تو یہ پوچھا کہ ناحق نوحہ خواں کیوں ہو
کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

نہ بولیں وہ تو ہم مہر خموشی کس لیے توڑیں
چھڑالیں وہ کلائی کو تو ہم ہاتھوں کو کیوں جوڑیں
وہ غصہ سے نہ باز آئیں تو ہم کیوں تم سے منہ موڑیں
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

محبت کس کو کہتے ہیں مروت نام ہے کس کا
تحمل کیا، قناعت کیا، حیا کیا، وضعداری کیا
کہاں تک صبر کب تک خامشی پاس ادب کیسا
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
خیال آئینہ عارض کا حیرانی کو کیا کم ہے
سواد زلف کا سودا پریشانی کو کیا کم ہے
ہجوم شوق اشکوں کی فراوانی کو کیا کم ہے
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو
یہی ہے بھولنا تو جی چرانا کس کو کہتے ہیں
یہی ہے چھیڑنا تو دل دکھانا کس کو کہتے ہیں
یہی ہے ناز کرنا تو جلانا کس کو کہتے ہیں
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
کیا فائزؔ نے اظہارِ نیازو آرزو غالبؔ
مگر کب مانتا ہے وہ نگارِ تند خو غالبؔ
بڑا طرار ہے عیّار ہے وہ فتنہ جو غالبؔ

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

مرزا محمد حسن فآئز کی فارسی شاعری کا ماحول وہی ہے جو سبک ہندی کے دوسرے شعرا کا ہے۔ ''سبک'' کا مطلب اسٹائل، طرز یا اسلوب ہے۔ جدید دور میں فارسی ادبیات کے چار مستقل اسلوب تسلیم کیے گئے ہیں۔ پہلا سبک خراسانی، دوسرا سبک عراقی، تیسرا سبک ہندی اور چوتھا دورۂ بازگشت۔ فارسی غزنویوں اور غوریوں کے ساتھ ہندوستان میں وارد ہوئی تھی اور تھوڑی ہی مدت میں یہاں سرکاری دینی اور ادبی حیثیت سے بہت اہمیت کی حامل ہوگئی تھی۔ منگولی حملے کی گیرودار میں شاعروں اور ادیبوں، عالموں اور دوسرے بزرگوں کے ساتھ ساتھ عوام کے مختلف طبقوں کی ایران سے ہندوستان کی طرف ہجرت نے اس زبان کے قدم اور بھی مضبوط کردیے اور رفتہ رفتہ اسے ہندوستان میں وہی مرتبہ حاصل ہوگیا جو اس سے پہلے اُپ بھرنش پراکرت اور سنسکرت کو مل چکا تھا۔ سولہویں صدی یعنی صفوی دور میں ہندوستان میں فارسی کی مقبولیت اور قابل رشک ترقی کا سب سے بڑا سبب مغل بادشاہوں اور ان کے متعلقین کی سرپرستی ہے۔ شاعروں، مورخوں، ادیبوں اور فاضلوں کی حوصلہ افزائی میں ہندی سلاطین نے ایسی فراخدلی کا ثبوت دیا کہ بیشتر فنکار صفوی درباروں کو سونا کر کے ہندی آستانوں پر جبیں سائی کے لیے آموجود ہوے۔ جن لوگوں کو بہ امر مجبوری لوٹنا پڑا وہ روتے ہوے گئے اور ان کی آنکھیں سارے راستے میں مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھتی رہیں۔

زشوقِ ہند زانساں چشم حسرت در قفا دارم
کہ رو ہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را (کلیم کاشانی)

انھوں نے صاف صاف ایران کی مذمت کی اور تحصیلِ کمال کے لیے بھی ہندوستان

پہنچنا ضروری قرار دیا۔

نیست در ایران زمین سامان تحصیل کمال
تا نیامد سوئی ہندوستان حِنا رنگین نہ شد (علی قلی سلیم)

اس طرح ہندوستانیوں کی سخن فہمی اور سخن گوئی کا ایک مخصوص معیار قائم ہو گیا جو شاعر اس کسوٹی پر پورا اترتا تھا اسے قبول عام کی سند مل جاتی تھی۔ مشہور ایرانی شعرا یہ سند ہندوستان سے لے کر ایران لوٹے اور وطن پہنچنے پر اسی کے سبب ان کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا گیا۔

ہند را چون نہ ستایم کہ در این خاک سیاہ
شعلۂ شہرت من جامۂ رعنائی یافت (صابر تبریزی)

ایرانی شعرا کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا جس کے نتیجے میں ہندوستانی دربار ہمیشہ ایرانی سخنوروں اور مقامی سخن سراؤں کے فارسی نغمات سے گونجتے رہے۔ یہی وہ حالات تھے جن میں فارسی ادبیات نے مستقل طور پر ہندوستان میں اپنا مرکز قائم کر لیا ....اس مرکز کا قیام شیخ علی حزیںؔ اصفہانی کے بنارس میں منتقل ہونے اور یہیں وفات پانے تک (۱۷۶۵ء) بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس اہمیت کی روشن دلیل فارسی ادب میں سبک ہندی کا ظہور ہے۔ سبک خراسانی اور سبک عراقی کے بعد سبک ہندی نے مضمون آفرینی اور دقت نظر کے ساتھ ‘ادعا متضمن دلیل’’ کی ایک ایسی مستقل روش قائم کی جس نے صائبؔ تبریزی اور غنیؔ کاشمیری جیسے باکمال شعرا کی پرواز شہرت کے لیے پر و بال کا کام دیا اور تقریباً دو سو سال تک ایسی شاہراہ بنی رہی جس پر فارسی شعر و ادب کا کارواں کمال افتخار سے گامزن رہا۔ یہاں میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کے فارسی گو شعرا کا کلام ہی سبک ہندی کا حامل ہے اور یہ کہ ایران میں یہ روش نہیں اپنائی گئی۔ حقیقت میں ایسا نہیں

ہے۔ سبک ہندی کو فارسی ادب میں ایک ایسی تحریک سمجھنا چاہیے۔ جس کے اجزائے ترکیبی میں بیشتر ہندوستانی انداز فکر کارفرما تھے۔ مضمون اور زبان دونوں لحاظ سے ہندوستانی چھاپ اس پر صاف نظر آتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی ہندوستانی شاعروں سے زیادہ ایرانی شاعروں نے اس روش کو پسند کیا۔ آملی کاشانی، تبریزیؔ اور اصفہانیؔ شاعر ہندوستان میں آئے اور اسلوب ہندی کو اپنا کر فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے لگے۔ ان میں سے بہت سے اسی خاک کا پیوبند ہوگئے۔ جو ایران لوٹے، انھوں نے اس روش کو سارے ایران میں مقبول بنا دیا۔ یہی سبب ہے کہ آج بھی ایران میں سعدیؔ اور حافظؔ کے بعد سبک ہندی کے نمائندہ شاعر صائبؔ تبریزی کو بے حد مقبولیت حاصل ہے یا یوں کہیے کہ ہندوستانی انداز فکر نے فارسی ادبیات پر جو گہرے نقوش چھوڑے ہیں ان کو آج خود زبان فارسی کے اجزائے ترکیبی میں سے خیال کیا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ملی تعصب کی وجہ سے ایرانی کھلے بندوں اس کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔

انوریؔ اور خاقانیؔ کا کلام علمی فلسفی، تاریخی اور دینی اصطلاحات کے سبب بہت سے مقدموں اور واسطوں کا محتاج ہے اسی لیے ان شعرا کا کلام بہت پیچیدہ اور دشوار نظر آتا ہے۔ سبک ہندی کے شعرا فنی اصطلاحات کے بغیر اپنی کم نظر تشبیہات سے کلام میں ایسے دقیق معانی پیدا کر دیتے ہیں کہ انھیں سمجھنے کے لیے صاحب نظری کی ضرورت پڑتی ہے۔ معمولی واقعات سے بڑے لطیف نتائج اخذ کرنے میں ان فنکاروں کو کمال حاصل ہے۔ عام انداز یہ ہے کہ پہلے کسی بات کا ادعا کیا جاتا ہے اور بعد میں کسی نہایت لطیف اور موزوں تشبیہ سے اس کو ثابت کیا جاتا ہے۔ حسن تعلیل کا فن بھی سبک ہندی کے ماہروں نے پروان چڑھایا ہے۔ اس روش پر چلنے والوں کے انوکھے مضامین اور خیالات کی ندرت قاری کے ذہن کو چونکا دیتی ہے۔ متقدمین اور متاخرین میں نکات و دقائق اور معانی و مضامین کے لحاظ سے ان کی مثال بہت کم

ملے گی۔ سبک ہندی کے شعرا نے دقت نظر اور باریک اندیشی کے خزانے گویا قدم قدم پر لٹائے ہیں۔

اردو کے عروج کے ساتھ اگرچہ فارسی گوئی کا رواج ہندوستان میں کم ہو گیا لیکن اردو گو استاد اپنی استادی کے اظہار کے لیے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی قادر الکلامی کا مظاہرہ کرتے آئے ہیں۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ اس صف میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ فائزؔ نے بھی اسی روش پر گامزن ہو کر ''چمنستان عجم'' کے عنوان سے ایک مختصر سا فارسی دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ یہ ان کے فارسی کلام کا انتخاب ہے اور ان کے شاگرد عزیز بابو بنائک پرشاد خلف بابو بنارسی لعل صاحب کے لیے مرتب کیا گیا تھا لیکن کسی وجہ سے شایع نہیں ہو سکا۔ اس مجموعے میں فائزؔ کی فارسی غزلیات جمع کی گئی ہیں جو زیادہ تر سبک ہندی کے نامور شعرا کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ قتیلؔ کی مشہور غزل ہے۔

مارا بہ غمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت
خود سوی ماندید و حیارا بہانہ ساخت

فائزؔ نے اس زمین کی خیال پروری اور شگفتہ بیانی سے آبیاری کی ہے۔

دل خود گرفت و زلفِ دوتا را بہانہ ساخت
دستِ کرم ببست و حنا را بہانہ ساخت
مشتاقِ بوی بادہ کم بود محتسب
خم را شکست و حکم خدا را بہانہ ساخت
تا خلوت رقیب شود در شبِ وصال
مارا چو شمع کشت و قضا را بہانہ ساخت

قاتل ز دیدِ تربتِ مظلوم شد خجل
گل کرد شمع و بادِ صبا را بہانہ ساخت
بخشید بو سہا کہ شود مرگ شادیم
بیداد کرد و خوی عطارا بہانہ ساخت
فائزؔ لب از لبِ تو نبرداشت تاسحر
درلطف بوسہ رسم وفا را بہانہ ساخت

''شدنی نیست'' کی ردیف میں ان کی درج ذیل غزل بھی ان کا شاہکار ہے۔

در مہرِ تجلی تو پیدا شد نی نیست   ہر دست کہ سوز دیدِ بیضا شد نی نیست
گوہر بہ صفایت نہ رسد ای یم خوبی   ایں قطرۂ آبست کہ دریا شد نی نیست
برمیتِ مجنوں شدہ انبوہ غزالاں   اکنوں گذرِ نافۂ لیلےٰ شد نی نیست
ایں عرصۂ حشر است کہ کوی تو ستمگر   عذری ز گنہگار پذیرا شد نی نیست
خون جوش عبث میزند ای نافہ آہو   خوشبو صفتِ زلفِ سمن سا شدنی نیست
باشد دل من مسکن مخصوص کدورت   گنجائش ایں خاک بصحرا شدنی نیست
ہر چند کہ زود آمدنی نیست قیامت   چوں صبح شبِ ہجر مگر نا شد نی نیست
مالید مسی ودھن از ناز خموش است   ایں غنچۂ گل ہست وبشب واشدنی نیست
نزدیک بود مرگ و ز فائزؔ تو بعیدی
ای جانِ جہاں وصل تو آیا شدنی نیست

حاجی قدسیؔ شہدی سترہویں صدی کا باکمال شاعر ہے جس نے طالبؔ، کلیمؔ اور صائبؔ کی پیروی میں اسلوب ہندی کی نازک کاریوں اور باریک اندیشیوں میں بہت نام پیدا کیا

ہے۔ اس کی یہ غزل ہندوستان، افغانستان، ایران اور ترکیہ میں یکساں طور پر مقبول ہے۔

من لذت درد تو بادر ماں نفروشم
کفر سرِ زلف تو بایماں نفروشم

فائزؔ نے قدسیؔ کے ماحول میں پہنچ کر اس غزل پر بڑی بھرپو تضمین کی ہے۔ مطلع پر چار رخ سے مصرعے لگائے ہیں اور قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔

(۱) چاک دل وحشی بگریبان نفردشم
خار غم عشقت بگلستان نفروشم
نقشِ کفِ پایت بسلیمان نفروشم
من لذتِ درد تو بدر مان نفروشم
گُفر سرَ زلفِ تو بایمان نفروشم

(۲) عشقِ لبِ لعلت بہ بدخشان نفردشم
خونِ دل مجروح بہ مرجان نفردشم
آزارِ فراقِ تو بصد جان نفروشم
من لذتِ درد تو بدر مان نفروشم
گُفر سرَ زلفِ تو بایمان نفروشم

(۳) من نعمت جور تو باحسان نفردشم
من دولتِ فقرِ تو بہ سلطان نفردشم
من حکمتِ عشق تو بہ یونان نفروشم
من لذتِ درد تو بدر مان نفروشم
گُفر سرَ زلفِ تو بایمان نفروشم

(۴) سود ای جمالت بعزیزان نفردشم
ارزان صفتِ یوسف کنعان نفردشم
من لذت درد تو بدرمان نفروشم
این سوز بصد قافله سامان نفروشم
کُفر سرَ زلفِ تو بایمان نفروشم

……

آن دیده ام از عشق که آفاق ندیده
از چاک گریبان سحر خلد دمیده
شوقِ خلشِ درد بدین اوج رسیده
در دل بخیالِ گل روی تو خلیده
خاری که بصد گلشن رضوان نفروشم

عیسیٰ بخریداری این جنس که دل بست
شد همتِ آن مشتری چرخ نشین پست
آخر نه مرا بهره ای از عقل و خرد هست
صد جان نستانم که دهم دامنت از دست
دشوار بدست آمد و آسان نفروشم

هر چند اسیر قفس جور و جفایم
بیداد کش پنجهٔ صیاد بلایم
اظهار صعوبت نه نمایم نه نمایم

صد خار خلد در جگرو لب نکشایم
این جنس گرامی بکس ارزان نفردشم
چون فائز بیباک بریم زمکاید
یعنی چہ کہ مشہور شوم صالح و عابد
طاعات ریای نگزارم بمساجد
قدسی من و تردامنی عشق چو زاہد
ہرگز بکسی پاکی دامان نفروشم

مذکورہ بالا فارسی اشعار سے بہ آسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ فائز کا فارسی کلام ان کے اردو کلام سے زیادہ موثر ہے اور یہ کہ یہاں محض لفظی صنعت گری نہیں ہے۔ مضمون آفرینی میں معنویت کا پہلو بھی شاعر کے پیش نظر رہتا ہے۔ فارسی گوئی کے سلسلے میں حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں لکھے گئے اس مخمس کا ذکر بھی ضروری ہے جو استاد نے کچھ ازراہِ عقیدت اور کچھ اپنے شاگردوں کی تعلیم کے لیے تحریر فرمالیا تھا۔ تخلیقات فائز میں اس مخمس کو بہت نادر خیال کیا جاتا ہے۔ خود استاد کی زندگی میں اس مخمس کی بہت شہرت تھی اور لوگ دور دور سے اسے نقل کرنے کے لیے آتے تھے۔ ایک مرتبہ استاد کو خود اس کی ضرورت تھی اور مکمل صورت میں یہ بنارس میں دستیاب نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے شاگرد جناب اکبر علی خان لودھی کو رقعہ دے کر چنار بھیجا کہ مولوی نذیر حسین لائق شاگرد فائز سے اس کی نقل لے آئیں۔ یہی نقل اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ اس پر ۲۴ر اکتوبر ۱۹۲۷ء کی تاریخ درج ہے۔

اس مخمس میں کل ملا کر ایک سو پچاس بند ہیں اور ہر بند بڑے التزام کے ساتھ کسی نہ کسی صنعت میں کہا گیا ہے۔ استاد اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے وقت اس مخمس کے مشکل الفاظ

کے معانی بیان کرتے جاتے تھے اور اس کے ساتھ جس صنعت میں زیر بحث بند ہو اس کی تفصیل وتوضیح لکھواتے جاتے تھے۔ میر وزیر حسین عروجؔ نے یہ مخمس استاد سے اسی انداز سے پڑھا تھا۔ بعد میں انھوں نے اسے خط نستعلیق میں لکھ کر محفوظ کرلیا۔ اس کتاب کے ایک صفحے پر پورا بند ہے اور اس کے بالمقابل صفحے پر الفاظ اور صنعت لفظی کی تشریح ہے۔ مثال کے طور پر عروجؔ نے ایک صفحے پر مخمس کا دوسرا بند درج کیا ہے۔

معجز بیان توئی فصحا را زبان توئی
مکنت نشان تو ئی شه والا مکا توئی
میرِ جنان توئی ملکِ دوجهان توئی
مهرامان توئی سند امتنان توئی
آرام جان توئی بخدا بلکه جان توئی

اس کے سامنے والے صفحے پر یہ عبارت درج ہے:-

''مسجع شعرائے عجم اوس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر مصرعہ میں دو سجع ہوں۔ پس اس بند کے چار مصرعوں میں آٹھ سجع ہیں۔ فصحا جمع فصیح۔ مکنت بضم میم بمعنی قدرت۔ مکنت نشان ترکیب فاعلی ہے۔ امتنان نعمت دینی۔ بخدا میں حرف باقسمیہ ہے۔''

اس عبارت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ استاد نے یہ مخمس خاص طور پر تعلیم وتعلم کے نقطۂ نظر سے موزوں فرمایا ہوگا۔ چونکہ ایک ہی جگہ اتنے صنائع بدائع کی توضیحی امثال ملنا ناممکن تھی اس لیے انھوں نے خود سے اس مشکل کو حل کردیا۔ تضمن المزدوج کی مثال یہ ہے کہ شعر کے ہر مصرع میں ایک لفظ مسجع ہو جیسے یکہ تاز۔ صاحب نماز وغیرہ۔ اب درج ذیل بند ملاحظہ ہو جس میں ایک شکل موازنہ کی ہر مصرعے کے تیسرے لفظ میں واقع ہے۔

ای یکه تازِ معرکه عزو افتخار
صاحب نماز صومعه عرش کردگار
یوسف نواز قافله حُسن اعتبار
تسہیل ساز مسئلہ جبرو اختیار
معبود وعبد ہر دو طرف درمیان توئی

صنعت ذوالقافیتین میں ہر مصرع میں دو قافیے پیش کیے جاتے ہیں۔ نہروان ایک لڑائی کا نام ہے جس کو حضرت علی ابن طالب نے جیتا تھا۔ اب بند دیکھیے :-

ای روح پرور دل محزون زائران
رد کرد نقش حب تو افسونِ صاحران
افتاد پیش پای تو مضمونِ شاعران
نوروز سرخ رنگ شداز خونِ کافران
مردِ ہزار گرد کشِ نہروان توئی

اگر شعر میں دو سے زیادہ قوافی ہوں تو اس کو ذوقوافی کہتے ہیں۔ اس کی بہت سی صورتیں ہیں۔ درج ذیل بند میں تین قافیے ہیں۔ ارزن ایک موضع کا نام ہے جو شیراز سے تین فرسنگ کے قافلے پرواقع ہے اور اس صحرا کو بھی کہتے ہیں جہاں سلمانِ فارسی کو حضرت علی نے شیر سے چھڑایا تھا۔ ضرغام بالکسر بمعنی شیر درندہ۔

رستم به بست ازادبت دست ہر زمان
تیر شجاعت از سببت رست بی گمان
بازوی سرکشان غضبت بست جاودان

ضرغام کبریا لقبت ہست درجہان
سلمان پناہ ارزن امن و امان توئی

ذو قوافی مع الحاجب میں ایک قافیہ کے بعد حاجب یعنی ردیف لاتے ہیں۔ "مدّ" کا مطلب پھیلنا ہے اور "لوا" جھنڈے کو کہتے ہیں۔ استاد کا یہ بند اپنی مثال آپ ہے۔

تیغ ظفر نمای توقد لوای تست
چرخ برین برای توسّد سرای تست
تخلیق ماورای تو مدِّ ضیای تست
خاموشی درثنای تو حدِّ ثنای تست
ای طور نور سرمۂ صوت دھان توئی

جوں جوں مخمس آگے بڑھتا ہے زورِ کلام زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل بند میں ہر قافیہ کے بعد ردیف دیکھیے۔

ای آنکہ وردِ نام تو بیمار را دواست
حسن قمر نظام تو فرخار راجلاست
طاعاتِ صبح و شام تواذ کار را صفاست
دم سازی کلام تو گلزار را صباست
گل دستہ بندی کلمات اذان توئی

اب ایک ہی بند میں چار قوافی مُتوالی ہیں:-

ہر کس کہ در حریم ولایت قدم نہاد
بروی درنعیم عنایت ارم کشاد

اندوخت ازعمیم عطایت حشم قباد
حاتم شدازرقیم سخایت کرم سواد
طی ساز گنج نامہ دریا و کان توئی

زوقوافی مع الحاجب میں پانچ قافیے ملاحظہ ہوں:-

بینم ظہور ماہ علوم تو رد برو
یا بم امور راہِ رسوم تو کو بکو
دانم و فور جاہ نجوم تو سو بسو
یوسف بنور گاہ قدوم تو خو برو
کنعان بہارِ عارض ریحان فشان توئی

درج ذیل بند مقفی ہے یعنی مصرع کا ہر لفظ قافیہ ہے ''مستنیر'' روشنی طلب کرنے والا ہے اور ''مرحب'' اس پہلوان کا نام تھا جس کو حضرت علی علیہ السلام نے خیبر کی جنگ میں قتل کیا تھا۔

بازار مستنیر تولّائی کرد گار
گلزار دل پذیر دلا رای افتخار
معیار بی نظیر رقمہای اعتبار
جبار قلعہ گیر سراپائی استوار
مرحب شکار خیبر محکم ضمان توئی

اس مختصر مضمون کی تنگ دامانی اس بات کی متحمل نہیں ہوسکتی کہ استاد کے خمسہ سے کچھ اور بند یہاں نقل کیے جائیں تاہم مذکورہ اقتباسات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ یہ مخمس ہندوستانی فارسی شاعری کے شاہکاروں میں شامل کیے جانے کا مستحق ہے۔ عنصریؔ، خاقانیؔ، انور

اور فائز نے اپنے قصاید میں صنائع لفظی ومعنوی کے انبار لگائے ہیں لیکن ایک ایسے ہندوستانی شاعر کے لیے جس نے اہل زبان سے ہزاروں میل دور رہ کر زندگی بسر کی ہو اور قواعد و دستور کی مدد سے زبان پر عبور حاصل کیا ہو، ایسی قادر الکلامی کا مظاہرہ کرنا آسان بات نہیں۔ چنانچہ جب مقطع میں یہ کہا جاتا ہے کہ

فائز زمین خمسہ ات اینست ارجمند
از سبعۂ معلقہ چرخ شد بلند
اعجاز این صنائع لفظیت حق پسند
از دولت ثنای سلیمانِ دیوبند
در عہد خویش خسروِ ہندوستان توئی

تو ایک ماہرِ فن کی زبان سے اس دعوے کو مجذوب کی بڑ نہیں سمجھا جاسکتا۔

مجموعی حیثیت سے فائز شاعر سے زیادہ استاد تھے۔ علمیت اور فنی ریاضت کے لحاظ سے وہ اپنے معاصرین میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کو بطور فن اپنے پیش نظر رکھا۔ فنی رموز ودقایق کی درس وتدریس میں اپنی ساری عمر صرف کی اور اپنے شاگردوں کو اس فن شریف کی طرف متوجہ کر کے بنارس کے ادبی ماحول کی پرداخت میں ایک لائق فائق معلم کے فرائض انجام دیے۔ ان کا اردو کلام اگرچہ صنعت گری اور ایہام گوئی کا مرقع ہے لیکن فارسی گوئی میں اور مخصوصاً تضامین میں ان کی قادر الکلامی مسلم ہے۔ سخنورانِ بناس کی ایک پوری نسل نے ان سے فیض حاصل کیا ہے۔

اُن کے سلسلۂ تلمذ میں آغا حشر کاشمیری جیسے ڈرامہ نگار، محشر بنارسی جیسے فطرت نگار، فرخ بنارسی جیسے غزل گو اور نذیر بنارسی جیسے قومی شاعر منسلک ہیں جن کی ادبی شخصیت ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

غزل
نگار سالنامہ صفحہ 72
1967
بیسویں صدی دہلی
سالانہ

محشؔر بنارسی

محشؔر مرحوم بنارس کے وہ البیلے شاعر تھے جن کے کلام میں تمام ناہمواریوں کے باوجود بعض مقامات پر حقیقی شعریت کی ایسی شمعیں روشن نظر آتی ہیں جن سے اردو کا شانۂ نظم دیر تک منور رہے گا۔ ان کا سرمایۂ شعری بہت مختصر ہے لیکن اس کے اجزائے ترکیبی میں اکثر ایسے نورانی عناصر موجود ہیں جو صاحبان نظر کے دیدہ و دل کو روشن کرتے رہیں گے۔ عام اصطلاح میں وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ اور مغربی ادب سے ان کی شناسائی ایک واجبی حد تک تھی لیکن شیلے، کیٹس اور ورڈزورتھ کی طرح نیچر کے اس شیدائی نے فطرت کی رعنائیوں کو اس انداز سے اپنے کلام میں سمویا ہے اور اپنے مترنم الفاظ کے رنگ و روغن سے قدرت کے مظاہر کی ایسی عکاسی کی ہے کہ اردو کی یہ نظمیں بڑی آسانی سے مغربی ادب کے اسی قسم کے نمونوں کے مقابلے میں کامیابی سے پیش کی جاسکتی ہیں۔

اپنے خود نوشت خاندانی حالات کے مطابق مرزا عباس بیگ محشؔر بنارسی کے مورث اعلیٰ محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں ایران سے دہلی آئے جہاں انھیں شاہی ملازمین میں شامل کرلیا گیا۔ پردادا مرزا رضا بیگ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفؔر کے متوسلین میں سے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے لیے اجو کشست و کشتار ہوا اس میں اپنے آقا سے نمک حلالی کے سنگین جرم میں ان کو بھی دار پر چڑھا دیا گیا۔ اس افسوسناک واقعہ کے بعد ان کے

صاحبزادے مرزا علی بیگ بنارس چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ مرزا عباس بیگ بنارس کے مشہور محلے اور شیخ علی حزیںؔ اصفہانی کی قیام گاہ م دال منڈی میں دسمبر ۱۹۸۹ء میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم خالص مشرقی انداز میں حاصل کر کے انٹرنس تک انگریزی پڑھی۔ انھیں شروع ہی سے شعروشاعری کا شوق تھا لیکن ان کے والد مرزا حیدر بیگ کی سخت گیری کی وجہ سے گھر کا ماحول کسی قسم کی شاعرانہ سرگرمیوں کے لیے سازگار نہ تھا۔ اپنی بیاض ’’محشرستان‘‘ میں اپنی شاعری کی ابتدا کے سلسلے میں محشرؔ نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جو اس کیفیت کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔ لکھتے ہیں: جہاں تک یاد ہے سب سے پہلا شعر میں نے آٹھ یا نو برس کی عمر میں کہا تھا۔ میرے مکان کے سامنے کامدانی والوں کو دوکانیں تھی، ایک افیونی قادر ان میں سے کسی دوکان پر کام کرتا تھا۔ اتفاقاً وہ سخت بیمار ا ہوا۔ دادا مرحوم اس کو افیون کے لیے پیسے دیا کرتے تھے۔ میں نے اس کیفیت کو دیکھ کر ایک شعر کہا جو میرا پہلا شعر ہے اور وہ یہ ہے:-

قریب مرگ تو ہیں گے پڑے ہوئے قادر
مگر افیم نہ چھوٹے گی تین پیسے کی

اس شعر کو کہہ کر میں نہایت خوش تھا۔ کاغذ پر مختلف روشنائیوں سے میں نے اسے لکھا، لیکن اس پر بھی تسکین نہ ہوئی، یہاں تک کہ میں نے (اپنے والد کے) عدالت کے کاغذ کے بستے پر اس شعر کو لکھ دیا۔ ابا ایک دن کسی کاغذ کی تلاش کررہے تھے۔ بستے پر لکھا ہوا شعر دیکھ کر مجھ سے پوچھنے لگے، یہ کس نے لکھا ہے؟ میں نے اپنا نام بتایا۔ پوچھا یہ شعر کس کا ہے۔ میں نے فخر سے یہ کہا ’’یہ شعر میرا ہے۔‘‘ وہ خلاف امید سے ناخوش ہوئے اور فرمانے لگے کہ اگر تم نے پھر کوئی شعر کہا تو خوب سزا دی جائے گی۔ ’’شاعری اچھی چیز نہیں ہے۔ میری تمام مسرت خاک میں مل گئی۔ اگرچہ میں نے اس کے بعد بھی کئی شعر کہے جو ایک واقعہ کے متعلق تھے مگر میں نے کسی کو

نہیں سنائے خود ہی دل میں پڑھ پڑھ کر مزے لیتا رہا۔''

اس گھریلو زبان بندی سے عین ممکن تھا کہ محشؔر کی ادبی صلاحیتیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتیں لیکن سن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے اتفاقات زمانہ نے ان کے لیے کچھ ایسے ہم نشین اور ہم ذوق بہم پہنچائے جنھوں نے قافیہ اور ردیف کی تمیز سکھانے کے بعد انھیں میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، آتشؔ اور انیسؔ تک بھی پہنچا دیا۔ محشؔر نے اپنے ان احباب میں غلام حسنین خان صاحب، امراؤ صاحب عزمؔ، خواجہ عبدالقدیر زہرؔ کاشمیری اور حکیم مسیح الدرانی وحشؔی حیدر آبادی کا نام بڑی محبت سے لیا ہے۔ یہ لوگ بڑے زندہ دل اور دوست نواز تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بنارس کے اچھے شعرا اور پڑھے لکھے لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حکیم وحشؔی حیدر آبادی کی قیام گاہ پر یہ لوگ ہر روز شب نشینی کے لیے جمع ہوتے تھے اور بیشتر وقت علمی اور ادبی صحبتوں کی نذر ہوتا تھا۔ اس زمانے میں بنارس کے ادبی افق پر دو ایسے ستارے روشن تھے جن سے بنارس کی تمام ادبی محفلیں منور ہو رہی تھیں۔ ایک مرزا محمد حسن فائزؔ بنارسی جو استاذ الاساتذہ کہلاتے تھے اور دوسرے آغا حشرؔ کاشمیری جو دراصل بنارسی تھے۔ آغا صاحب کا میدان اگرچہ ڈرامہ نویسی تھا لیکن شاعری میں وہ بھی مرزا فائزؔ کے شاگرد تھے۔ محشؔر، آغا حشؔر کے پڑوسی تھے اور غالباً انھیں بزرگوں کی تقلید میں اور اپنے دوسرے ہم نشینوں کے مشورے سے وہ بھی مرزا فائزؔ کی خدمت میں تلمذ کے لیے حاضر ہوئے لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ فائزؔ نے معمولی طور پر ان کی غزل دیکھ لی لیکن آئندہ کے لیے عدیم الفرصتی اور شاعری کی مشکلات کا بہانہ بنا کر انھیں لوٹا دیا۔ یہ واقعہ محشؔر کی خاطر شکنی کے لیے کافی تھا لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری اور حکیم وحشؔی کے ہفتہ وار مشاعروں کے لیے غزلیں کہتے رہے۔ یہ غزلیں اگرچہ ان مشاعروں میں بہت کچھ مقبول ہو جاتی تھیں لیکن اس زمانے میں میں محشؔر اپنی شاعری سے بہت کچھ ناامید اور غیر مطمئن ہو چکے تھے۔

بنارس کے باغ فاطمان میں شیخ علی حزیںؔ اصفہانی کی آرام گاہ کو بہت متبرک مقام سمجھا جاتا ہے اور یہ روایت عام طور پر مشہور ہے کہ شیخ کے مزار پر مطالعہ کرنے سے ذہن میں جودت پیدا ہوتی ہے۔

آج سے چالیس پچاس سال پہلے کے بنارسی شعرا شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے بھی شیخ کے مزار پر حاضری دینا ضروری خیال کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جو شخص چالیس جمعرات بلاناغہ شیخ کی آرام گاہ پر فاتحہ خوانی کرے وہ شاعری میں درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ محشرؔ کے ایک بے تکلف دوست ماسٹر عبدالوحید خاں وحیدؔ تھے۔ جو اس قسم کی باتوں پر بہت اعتقاد رکھتے تھے، ایک دن باتوں باتوں میں شیخ کی روحانی کرامات کا ذکر ہوا تو بات فاتحہ خوانی تک جا پہنچی۔ محشرؔ کے دل میں شاعری کی ایسی لگن تھی کہ فوراً تیار ہو گئے ۔ اور دونوں دوستوں نے ہر جمعرات کو شیخ کے مزار پر جانا شروع کر دیا۔ اگرچہ برسات کے موسم میں ان دونوں کو بہت تکلیفیں اٹھانا پڑیں لیکن چالیس جمعرات کی شرط مکمل کر کے چھوڑی۔ اس سخت ریاضت کا نتیجہ خلاف توقع محشرؔ کے لیے بہت مایوس کن ثابت ہوا۔ اپنی بیاض میں لکھتے ہیں۔ ”اس واقعہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میری شعر گوئی کی قوت بالکل زائل ہو گئی۔ اکثر میں نے فکر کی مگر کوئی شعر نہ کہہ سکا۔ اس طرح پورے تین برس گذر گئے، اس کا مجھے اکثر صدمہ رہتا۔“

شیخ کے مزار پر فاتحہ خوانی کا محشرؔ کی شاعری سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو اس واقعہ سے یہ بات ضرور کھل جاتی ہے کہ ابتدائی دور کی غزل گوئی محشرؔ کی شاعرانہ مزاج سے ہم آہنگی نہ پیدا کر سکتی تھی۔ ان کے حُسن طبیعت کو جلوہ فرمائی کے لیے مناسب پیرایہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ مصرع طرح پر غزل کہتے ضرور تھے لیکن اس سے ان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ بہت جلد اس قسم کی شاعری سے پریشان ہو گئے اور جب انھوں نے اپنے اشہب

فکر کی جولانی کے لیے مناظر قدرت اور مظاہر فطرت کی نقاشی کا میدان تلاش کر لیا تو وہ غزل گوئی کی مخالفت پر بھی اتر آئے اور اس سے دور ہو کر اپنی تمام تر صلاحیتوں کو نظم نگاری کے لیے وقف کر دیا لیکن یہاں افسوس یہ ہوتا ہے کہ زندگی بھر وہ اپنے قلم سے سنجیدگی سے کام نہیں لے سکے اور اس کا سبب فکر روزگار کے علاوہ بہت کچھ ان کا لاابالی پن اور رنگین مزاجی بھی ہے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ مختار ہو گئے تھے لیکن یہ قانونی پیشہ بہت زیادہ مصروفیت کے باوجود بھی ان کے لیے مالی حیثیت سے اطمینان بخش نہ تھا۔ اپنی خوش اخلاقی اور دوست نوازی کی وجہ سے وہ اکثر ایسے مقدمات کی پیروی میں مشغول رہتے تھے جو ”حساب دوستاں در دل“ قسم کی چیز ہوتے تھے۔ ادھر ان کی رنگین مزاجی، دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد جب شام کی اداسی اور تنہائی دور کرنے کا تقاضا کرتی تو مجبوراً انھیں سہاروں کا سہارا لینا پڑتا۔ جوانی سے بڑھاپے تک ان کے مزاج کا یہی رنگ قائم رہا۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی ذہنی تخلیقات کے خزانے جی کھول کر لٹائے اور بہت سے شاعروں کا دامن اپنے مزاحیہ اور سنجیدہ کلام کے جواہر سے بھر دیا۔ آخری عمر میں وہ اس قسم کے شاعرانہ معاملات میں اور بھی فیاض ہو گئے تھے چنانچہ اپنے زیر تکمیل تذکرۂ شعرائے بنارس میں جس کا مواد وہ ایک مدت سے جمع کر رہے تھے۔ انھوں نے بہت سے ایسے شاعروں سے بھی نہایت فیاضانہ سلوک کیا جو فقط تخلص کے گنہگار رہتے تھے۔

محشرؔ اہل تشیع میں سے تھے لیکن اپنی اعلیٰ ظرفی اور آزاد خیالی سے انھوں نے ہندو مسلم، شیعہ سُنی ہر قسم کے مخلص دوست پیدا کر لیے تھے۔ بنارس میں ان کے چاہنے والے ہر فرقہ میں موجود تھے۔ اسی مقبولیت نے انھیں بنارس میونسپل بورڈ کا ممبر بنایا جہاں بعد میں کئی سال تک وہ وائس چیرمین اور مختلف کمیٹیوں کے چیرمین بھی رہے۔ بنارس کے سماجی زندگی میں محشرؔ کی حشر خیزیاں مشہور تھیں۔ مشاعروں میں وہ اپنے چاہنے والوں کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے شرکت

فرماتے تھے۔ معاصرانہ چشمکوں میں بھی برابر کا حصہ لیتے تھے اور ماحول کے تقاضوں کی تکمیل میں بعض اوقات ہزل گوئی پر بھی اتر آتے تھے لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ ایک مخصوص شان محبوبی رکھتے تھے جو ان کے مخالفین کو بھی ان کا احترام کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

محشرؔ کی رنگین مزاجی بعض اوقات بڑے انوکھے گل کھلاتی تھی۔ ایک دفعہ انھیں خیال آیا کہ محض شاعرات کا ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ بنارس کے روایت پرست ماحول کے خلاف گویا یہ ایک بہت بڑی بغاوت تھی لیکن محشرؔ اپنی دھن کے پکے تھے۔ ۶ر مئی ۱۹۴۸ء کو بنارس میں پہلی دفعہ جے نرائن انٹر کالج کے میدان میں لیڈی سریواستوا کی صدارت میں ایک دلچسپ مشاعرہ ہوا جس میں ہندوستان بھر سے ۳۳ر۳۴ شاعرات نے حصہ لیا۔ مشاعرہ کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ ۱۹۴۹ء میں بیگم حفاظت حسین، کمشنر، بنارس کی صدارت میں یہی پروگرام پھر سے مرتب ہوا اور اس طرح محشرؔ کی کوششوں سے بنارسی خواتین میں ادبی ذوق کے احیا کے ساتھ ساتھ ایک زنانہ بزم ادب کا قیام بھی عمل میں آ گیا۔

محشرؔ شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ ایک اچھے صحافی بھی تھے۔ صحافت کے لیے وہ اپنی قانونی مصروفیتوں کے باوجود کچھ نہ کچھ وقت نکال ہی لیا کرتے تھے۔ ان کا روزنامہ ''آواز'' بنارس کے سیاسی حلقوں میں کافی مقبول تھا۔ اس اخبار کا ہفت روزہ خاص نمبر علمی اور ادبی تخلیقات کا بھی حامل ہوتا تھا جس کے سبب سنجیدہ لوگ بھی اس کی طرف مایل ہو گئے تھے۔ ''آواز'' کے بعد محشرؔ نے ۱۹۴۷ء میں روزنامہ ''آزاد'' کا اجرا کیا جو آج تک ان کے انتقال کے بعد بھی خاصی پابندی سے نکل رہا ہے۔ محشرؔ کی طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ان کی بیاض محشرستان میں ''ظرافت وطنزیات'' کے عنوان سے کافی اشعار دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے سیاسی اور سماجی ماحول کے معائب کو اجاگر کرنے اور اس کے مضحکہ خیز رخ کو پیش کرنے میں انھیں بڑا

مزہ آتا تھا۔ اسی مزاح نگاری کے شوق میں انھوں نے ایک ماہانہ اخبار ''حماقت گزٹ'' کے نام سے جاری کیا۔ جو اگر چہ زیادہ دیر تک سانس نہیں لے سکا لیکن اس کی عارضی حیات بھی اہل دل کے لیے دائمی کیف و مسرت کا پیغام تھا۔

محشرؔ کی زندگی کے آخری دس سال مختلف امراض کی نذر ہو گئے۔ ۱۱؍فروری ۱۹۴۶ء کی شام کو ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔ مسلسل علاج سے وہ اس سے جاں بر تو ہو گئے لیکن ہائی بلڈ پریشر کی شکایت نے انھیں ہمیشہ کے لیے مریض بنا دیا۔ عمر کے اس حصے میں ان کی زندہ دلی اور صحت دونوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ افسردگی کے اس عالم میں انھوں نے اپنی ایک تخلیق میں ''حال'' کے عنوان سے اپنی کیفیت یوں بیان کی ہے۔

وہ ہاتھ جو تھر تھرا رہے ہیں، اب اُن سے ساغر اٹھا رہا ہوں
جو عہد رنگین گذر چکا ہے، پھر اس کو واپس بلا رہا ہوں
تھکی ہوئی زندگی لیے ہے، شباب رفتہ کا جام رنگیں
شراب تھوڑی سی بچ گئی ہے، اب اس میں آنسو ملا رہا ہوں
یہ زندگی کوئی زندگی ہے، نہ قہقہے میں نہ چہچہے ہیں
زبان ہے بند زمزموں کی، خموش نوحے سنا رہا ہوں
نہ اب ہے حسنِ خرام ساقی، نہ ساغروں میں شراب باقی
حسین ماضی کی دلربا آ، میں منتوں سے بلا رہا ہوں
ہوائے غم سنسنا رہی ہے، چراغ دل کے بجھا رہی ہے
امید مردہ کی آڑ لے کر، میں ان کو پھر سے جلا رہا ہوں
وہ پیاس دل کی شراب رنگین، لبوں کی جس کو بجھا چکی ہے

اداس راتوں کے غمکدے میں، اب آنسوؤں سے بجھا رہا ہوں
یہ شور کیسا مچا رہی ہے، کہیں نہ احباب میرے سُن لیں
بلا اشاروں سے موت مجھ کو، میں تیرے نزدیک آ رہا ہوں
حیات کی دھڑکنیں کہاں ہیں، فریب دیتا ہوں زندگی کو
رکا ہوا ہے دل فسردہ، میں اس کو جھولا جھلا رہا ہوں
بہار کے زمزمے خزاں میں، ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے
خزاں رسیدہ ہوں آہ محشؔر، خزاں کے نوحے سُنا رہا ہوں

محشؔر کا انتقال تقریباً چھیا ۶۶ برس کی عمر میں ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ انتقال کے وقت ان کے بہت سے ادبی کام ادھورے تھے جو اسی ناتمام حالت میں ان کے داماد سید عباس حسین اور ان کے فرزند مرزا احسن بیگ کے پاس محفوظ ہیں۔

مرزا عباس بیگ محشؔر اپنے رجحان اور ذوق کے اعتبار سے شاعر تھے لیکن ابتدائی دور میں انھیں ناول نویسی کا بھی شوق تھا۔ ان کے اپنے قول کے مطابق ان کے متعدد ناولوں میں جو ابتدائی عمر میں لکھے گئے۔ خوبصورت ناگن، حکیم گلباز، سراب فیشن، عابدہ اور سنہری دنیا، بہت مقبول ہوئے۔ ان ناولوں پر جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے کہ آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کی فضا طاری تھی۔ اس لیے ان میں کسی قسم کی انفرادیت تلاش کرنا بے سود ہوگا۔ ان کی شاعری کی ابتدا غزلوں سے ہوئی۔ قصیدہ ان کے مذہبی اعتقادات کے اظہار کا بہتر ذریعہ بن سکتا تھا۔ اس لیے غزل کی نسبت قصیدہ کی طرف زیادہ توجہ کی۔ بعد میں غزل گوئی کم و بیش ترک کر کے غزل اور غزل سراؤں کی مخالفت پر بھی کمر باندھ لی۔ ان کی بیاض ''محشرستان'' میں (جس میں ۱۹۰۹ء سے ۱۹۵۳ء تک کا کلام محشؔر محفوظ و منقول ہے اور جو ان کے جانشینوں کے حسن

انتظام سے اس وقت میری دسترس میں ہے) سات مختلف عنوانات کے تحت محشرؔ نے اپنی شعری اور نثری تخلیقات کو یادگار چھوڑا ہے۔ پہلا حصہ مختصر حالات، دوسرا اسلامیات، تیسرا ہذیانات، چوتھا نظارے، پانچواں تاثیرات، چھٹا ظرافت اور ساتواں متفرقات کے عنوان سے ہے۔

محشرؔ اپنے شیعی عقائد میں بڑے راسخ الاعتقاد تھے۔ ابتدائی عمر میں بھی جہاں ان کی غزلیں محض قافیہ پیمائی اور مصنوعی اشعار سے پر نظر آتی ہیں وہاں ان کے قصیدوں، مرثیوں اور دینی موضوعات پر مبنی مختلف منظومات میں خلوص اور جذبات کی فراوانی ہے۔ مرقع حیدری، زمزمہ توحید، مراثی جناب امیرؑ، قصائد اور منقبت جناب امیرؑ، نوحے، حمد، نعت، بزم عزا اور اہل عزا وغیرہ منظومات میں ایسے اشعار بکثرت نظر آتے ہیں جن میں جذبے کی تڑپ کے ساتھ حسن طبیعت بھی نمایاں ہے۔ یہ چیزیں اہل مجلس کے لیے بھی لکھی گئی ہیں اور خود اپنے دل کی تسکین کے لیے بھی۔ تشبیب میں اکثر منظر کشی کی وہ رعنائیاں بھی جھلک جاتی ہیں جو بعد میں کلام محشرؔ کا طرۂ امتیاز بنیں۔ ۱۹۱۳ء میں لکھے گئے قصیدے ''در منقبت جناب امیرؑ'' کی بہاریہ تشبیب کے یہ چند اشعار شاعر کے روشن مستقبل کی صاف نشاندہی کرتے ہیں۔

دن آگئے بہار کے رخصت ہوئی خزاں
گلشن ہے برگ ہائے پریشاں لیے ہوے
سوئے زمین خشک چلی ریزش سحاب
ہر چیز کی حیات کا سامان لیے ہوے
پھر ہر طرف سے ابر اٹھے جھوم جھوم کر
سینوں میں اپنے نوحؑ کا طوفاں لیے ہوے
موجوں کی زلف پھیل گئی سطح آب پر
کچھ انتشار گیسوے جاناں لیے ہوے

پھر آسماں پہ قوس قزح جلوہ گر ہوئی
کچھ عکس سبزہ و گل و ریحاں لیے ہوئے

اڑنے لگے طیور خوش الحان ادھر ادھر
نغموں میں انبساط کے ساماں لیے ہوئے

کوئل کی کوک اور پپیہے کی پی کہاں
پھیلیں فضا میں درد کے طوفاں لیے ہوئے

موروں کی دل فگار صدائیں ہوئیں بلند
کچھ طرز نالہِ شب ہجراں لیے ہوئے

پھر بزم گل کی شوکت و تزئین کے لیے
جگنو چلے ہیں شمع فروزاں لیے ہوئے

خالص دینی ماحول میں بھی شاعرانہ استدلال ملاحظہ ہو:-

لختِ جگر شہ حجازی کے لیے
کچھ چاہیے شان امتیازی کے لیے
وہ سجدہ کہ طول ہے ابد تک جس کا
موزوں تھا حسین سے نمازی کے لیے

غزل گوئی سے محشرؔ کی بیزاری کی طرف پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ اس کا دلچسپ ثبوت ''ہذیانات'' کا عنوان بھی ہے جس کے تحت محشرؔ نے بیاض میں اپنی غزلیات اور متفرق غزلیہ اشعار درج کیے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیم وحشی صنف سخن سمجھنے کے باوجود محشرؔ کا دامن تخیل خارستان غزل میں اُلجھ اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ شاید مشاعروں میں شرکت کے لیے اس کافرادا کا سہارا

لینا ضروری سمجھا گیا ہو، بہر حال غزل گوئی سے محشرؔ کے تنفر کی وجہ یوں بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ ان کا مزاج اس صنف سخن سے ہم آہنگ نہیں ہونے پاتا۔ طرح میں غزل انھیں مجبوراً کہنا پڑتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں مصنوعی اشعار کی بھرمار ہے۔ محشرؔ اپنی غزلوں میں بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں کہیں خیالات کا تسلسل غزل میں بھی نظم کا سا ماحول پیدا کر دیتا ہے تو کلام میں زندگی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔

بزم ہستی میں شمع سوزاں ہوں   آپ اپنی فنا کا ساماں ہوں
خود خزاں ہے مری بہار مری   اشکِ خونیں سے گل بداماں ہوں
شادی و غم میں ساتھ ساتھ مرے   برق خنداں ہوں ابر گریاں ہوں
نیستی سے بدل کے ہستی کو   کیا کہوں کس قدر پریشاں ہوں

رقیب، عدو، مزار، حشر وغیرہ مضامین سے قطع نظر کہیں کہیں ایسے دلچسپ اشعار بھی مل جاتے ہیں جن سے ایک قدیم خیال کے مطابق مشاعروں کی چھتیں اُڑ جایا کرتی تھیں۔

تو نے مٹا کے مرجع عالم بنا دیا   یوں کون جانتا تھا ہمارے مزار کو
اس طرح سے گذرا نہ کرو راہ گذر سے   اب لوگ تمھیں دیکھتے ہیں اور نظر سے

……

شکستہ اور ناہموار گورستاں کی دیواریں
بتاتی ہیں کہ حدِ عالم فانی یہاں تک ہے
سیر چمن کو شوق سے جاؤ مگر مجھے
بے اعتبار یاں ہیں نسیم و صبا کے ساتھ
وہ افسانہ جسے ہر روز ہم دل کو سناتے ہیں
خدا جانے تمہارے سامنے کیوں بھول جاتے ہیں

ان کا یہ خط نہیں سند التفات ہے
لکھ لکھ کے میرا نام مٹایا گیا تو ہے

……

جسے حیات کی رنگینوں نے ٹھکرایا وہ وقت طاعت پروردگار میں گذرا
برق بیتاب نشیمن پہ مرے شوق سے گر کیا برا ہے جو گلستاں میں چراغاں ہوجائے

میری خاموشی تمہاری داستاں ہوجائے گی
کیا خبر تھی بے زبانی بھی زباں ہوجائے گی

مَس ہورہی ہے تیری تصور سے میری روح
ڈرتا ہوں فرق آئے نہ تیرے وقار میں

سب جسے روز حشر کہتے ہیں ہم غریبوں کی رات ہوتی ہے
وہی ہے لمحۂ سیمیں کہ جو نگار کے ساتھ فروغ جام میں یا لالہ زار میں گذرا

لیکن یہ اشعار خود شاعر کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ وہ شعر میں دروغ و کذب اور تصنع پسندی کا مخالف ہے اور اپنے ماحول کی ترجمانی کا قائل ہے۔ قصۂ وصال اور افسانۂ فراق اس کے لیے کوئی دلکشی نہیں رکھتے۔ اس جھوٹ کے طومار سے اسے دلی نفرت ہے۔ اس کے سامنے صحیفۂ قدرت ہے جس کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے وہ شب و روز کوشاں ہے۔ حسن کائنات کی دلفریب تصویریں کھینچنا اس کا نصب العین ہے۔ اس کے خیال میں جب تک دل کی کیف و مستی کے جذبات موجزن نہ ہوں قلم سے شعر کا نکلنا محال ہے۔ درج ذیل اشعار میں محشؔر نے یہ سب باتیں نظم کر کے اپنے نظریۂ شاعری کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

غزلوں کی اب ہماری زباں میں کمی نہیں
اس صنف شاعری میں کوئی دلکشی نہیں

دنیا یہ کہہ رہی ہے بدل دو ادب کا رنگ
اور ہم یہ کہہ رہے ہیں ''نہیں جی ابھی نہیں''
جس میں فراق و وصل کے قصے نہ نظم ہوں
اپنا یہ اعتقاد ہے وہ شعر ہی نہیں
اک پھول اک پرند کوئی منظرِ حسیں
موضوعِ شاعری ہے تو وہ شاعری نہیں
کس درجہ ہوگئے ہیں تصنع پسند ہم
کہتے ہیں ''اصلیت میں کوئی دلکشی نہیں''
شاعر نہیں جو جھوٹ کے طوفان باندھ دے
جو اصلیت سے دور ہے وہ شاعری نہیں
شاعر وہی ہے جو کہ حقیقت نگار ہے
جس کی دروغ و کذب سے وابستگی نہیں
افسانۂ فراق ہو یا قصۂ وصال
وہ جانتا ہے اس میں کوئی دلکشی نہیں
پڑھتا ہے وہ صحیفۂ قدرت کو رات دن
اس کی نظر سے بات کوئی چھوٹتی نہیں
ہوتا ہے اس کی روح پہ ماحول کا اثر
مصنوعی اس کا جذبۂ دل ایک بھی نہیں
وہ وارداتِ قلب کو کہتا ہے شاعری
جو واردات قلب نہیں شاعری نہیں

وہ حسن کائنات کی تصویر دلفریب
یوں کھینچتا ہے جس میں ذرا بھی کمی نہیں
فطرت کے دل پسند ترنم کا ساز ہے
چپ ہو تو کائنات میں پھر زندگی نہیں
جب تک نہ اس کے قلب میں ہو کیف موجزن
اس کے قلم سے شعر نکلتا کبھی نہیں
تنقید کا ہے غم نہ ستائش کی فکر ہے
اس کے خیال صاف میں پراگندگی نہیں
ہوتا ہے آپ مست وہ اپنے کلام سے
غیروں کی بے خودی پہ اسے بے خودی نہیں
ہاں زندہ باد شارح اسرار کائنات
آجائے جس کو موت تری زندگی نہیں

بنارس کے ادبی ماحول میں جہاں شاعری سے مراد غزل گوئی اور صرف غزل گوئی تھی اس قسم کے خیالات ایک کھلی ہوئی بغاوت کے مترادف تھے۔ محشؔر کے معاصرین پھولوں، پرندوں اور مناظر فطرت کے موضوعات پر لکھی ہوئی نظموں کو شاعری نہیں سمجھتے تھے۔ ایسی شاعری کی داد تو درکنار اس کو سننے کے لیے بہت کم لوگ تیار ہوتے تھے۔ راقم الحروف نے ابھی کل تک بنارس کے کچھ ادبی حلقوں میں یہ صدائے بازگشت سنی ہے کہ محشؔر کی شاعری چُوں چُوں کا مربہ ہے۔ خود محشؔر کے دوران زندگی میں بھی ان کے ہم وطنوں نے انھیں درخور اعتنا نہیں سمجھا اور ان کی فطرت نگاری کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ایسی باتیں عام حالات میں شاعر کی خاطر شکنی کا سبب

بن کر اسے اس روش سے منحرف ہونے پر مجبور کر سکتی تھیں لیکن محشرؔ غم تنقید اور فکر ستائش سے بلند تر ہو کر اپنی موضوعاتی شاعری کے ماحول میں ایسے بے خود ہوئے کہ انھیں غیروں کو بے خود کرنے کی خواہش سے نجات مل گئی۔ درج بالا اشعار میں انھوں نے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ ان تجربات کے پیچھے ان کی رومانی زندگی کا اکثر و بیشتر حصہ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ جو سرسبز کوہساروں اور شاداب وادیوں میں بسر ہوا اور ان کی متعدد منظومات میں اچھوتے انداز سے جلوہ گر ہو کر اردو شاعری میں ہمیشہ کے لیے یادگار رہ گیا۔

محشرؔ کی ایک عمر سیر و شکار میں گذری انھیں برسات میں بپھرے ہوئے دریاؤں، گونجتی گھمراتی پہاڑی ندیوں اور سرسبز ماحول میں گھرے ہوئے تالابوں کا نظارہ بہت مرغوب تھا۔ بہار کے پھولوں سے لدی پھندی وادیاں اور جوش روانی سے ابلتے ہوئے چشمے انھیں اپنے ہم نشین اور ہم سفر معلوم ہوتے تھے۔ مہکتے ہوئے پھولوں اور منڈلاتی ہوئی رنگین تتلیاں انھیں قوس قزح کے ٹکڑے دکھائی دیتی تھیں یہ قوس قزح جب آتش گل کو بھڑکاتی تھی تو ان کے تخیل میں رنگ و نور کے طوفان اٹھنے لگتے تھے۔ موسم برشگال میں ویرانوں کی سیر کرتے ہوئے جب ان کی نگاہیں ابر آلود فضاؤں کی طرف اٹھ جاتی تھیں تو بجلی کبھی ابرِ سیاہ کے ہاتھ میں لرزاں شمشیر معلوم ہوتی تھی اور کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ٹھنڈی ہوا اپنے لرزتے ہاتھوں سے لوح آسمان پر سنہری عبارت تحریر کر رہی ہے۔ برسات کی رم جھم میں بادلوں کے پس منظر میں بگلوں کی قطار میں وہ موتیوں کی لڑیوں کو مائل پرواز دیکھتے تھے۔ باد صبا کے لڑکھڑانے پر جب درختوں کے پتے تالیاں بجا بجا کر ہنستے تھے تو محشرؔ کا دل روحانی خوشیوں سے معمور ہو جاتا تھا۔ چمن کی نغمہ فروش فضاؤں میں کوئلوں کی ترانہ سازیاں کچھ ایسا جادو کرتی تھیں کہ ان کے دل کا ایک ایک تار بج اُٹھتا تھا۔

دوشیزہ فطرت کی یہی ادائیں تھیں جنھوں ن نے محشرؔ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسحور

کر دیا تھا۔ پرستارِ مجاز ہونے کے باوجود وہ فطرت کے ان حسین حقائق کے ایسے دلدادہ تھے اور یہ نظارے ان کی آنکھوں میں اس دل فریبی کے ساتھ سما گئے تھے کہ آخری عمر میں جب وہ مفلوج ہو گئے اور ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف نے سیر و سیاحت کی خوشی چھین لی تو وہ DAFFODILS کے شاعر ورڈز ورتھ کی طرح عالم تصور ہی میں ان مسرت افزا نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو ایک استفسار کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا۔

"۱۹۴۶ء کی ۱۳ رفروری کو شام کے وقت مجھ پر بائیں جانب فالج کا حملہ ہوا۔ حملہ کے بعد دو ماہ میں میرے اعضا جن پر فالج کا اثر تھا درست ہو گئے۔ البتہ ضعف اعصاب اختلاج اور ہائی بلڈ پریشر کی تکالیف کم و بیش قائم رہیں۔ اس وقت جب کہ خرابی صحت سے نہ تو جوئباروں اور آبشاروں میں نہا سکتا ہوں نہ سرسبز جنگلوں شاداب وادیوں میں دن گذار سکتا ہوں۔ ان تمام دل بستگیوں کا دروازہ مجھ پر بند کر دیا گیا ہے لیکن عالم خیال میں ان حیات بخش مناظر سے ہمکنار ہوتا رہتا ہوں اور خوش ہوں۔"

مظاہر فطرت سے یہی عشق اور صحیفۂ قدرت کا یہی مطالعہ اور مشاہدہ تھا جو پہلے محشر کی زندگی بنا اور پھر رفتہ رفتہ ان کی موضوعاتی شاعری میں ڈھل کر اردو ادب میں ایک البیلے روپ میں جلوہ گر ہوا۔ برسات، بسنت، طلوع سحر، چاندنی رات، قوس قزح، ستارۂ سحری، سورج مکھی اور کنول کے پھول، جوہی، اشوک، ہر سنگار اور حُسن حنا وغیرہ عنوانات سے انھوں نے جو تخلیقات پیش کی ہیں وہ ہمارے گلشن ادب کو ہمیشہ کے لیے مہکاتی رہیں گی۔ محشر کی یہ فطرت نگاری کوئی سرسری چیز نہیں۔ اس میں ایک ایسی کیفیت ہے جو شاعر کی فطرت سے گہری ہم آہنگی کی نشان دہی کرتی ہے۔ وہ فطرت کا عکاس ہونے کے علاوہ اس کا ہمراز بھی ہے۔ غم حیات سے فرار کے لیے دامن قدرت اس کے لیے بہترین پناہ گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مستقل ساتھی

اور ایک باوفا محبوب بھی ہے جس سے وہ ہنستا بولتا ہے اور ہم آغوشی کی لذت بھی حاصل کرتا ہے۔

صبح کا ستارہ نظر افروز نظاروں کے ہجوم میں جب نور پاشیاں کرتا ہے تو شاعر نہ صرف یہ کہ اس سے ہم کلام ہوتا ہے بلکہ اپنے آپ کو بے خودی شوق کے سپرد کر کے اس کے سیلاب تجلی میں ڈبونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ اقبال کی طرح فلسفیانہ موشگافیوں سے کام نہیں لیتا بلکہ شعریت کا سہارا لے کر ماحول کی جگمگاتی تصویر صفحۂ قرطاس پر اتارتا ہے۔

ستارۂ سحری

صبح کے طائروں کی بزم غزل خوانی میں
شبنم آلود پروں کی گہرا افشانی میں

جلوہ فرما نظر افروز نظاروں میں ہے
جاگتا نیند سے بے چین ستاروں میں ہے

بڑھتی آتی ہے سحر، محو تمنا خاموش
چاہتی ہے کہ بنالے تجھے آویزۂ گوش

اور نسیم سحری چھیڑ کے شاخوں کا ستار
کر رہی ہے تجھے نغمات کی مے سے سرشار

گہر افشانیِ شبنم جو بہک جاتی ہے
اس کی سرشاری پہ پھولوں کو ہنسی آتی ہے

تیرے نظاروں میں کلیاں ہیں یہاں تک بیتاب
برگ نازک کی الٹ دیتی ہیں رہ رہ کے نقاب

ہلکی ہلکی سی یہ دریائے فلک کی امواج
چومتی ہیں تری پیشانی زریں کا تاج
ان کی بیباکی سے تجھ کو جو حیا آتی ہے
ایک لرزش سی ترے جسم میں آجاتی ہے
میں ترے حُسن کے سیلاب میں بہتا جاؤں
اس طرح تیرے قریب اور قریب آجاؤں
اپنے حسنِ نظر افروز میں کھودے مجھ کو
اپنے سیلاب تجلی میں ڈبو دے مجھ کو

نیچر سے ہم آغوشی کا یہ جذبہ محشؔر کی نظم ''نسیم بہار'' میں اور بھی شدت سے نمایاں ہے۔ غم روزگار کا مارا ہوا انسان بہار کی معطر ہوا سے تسکین دل کی کبھی خواہش نہیں رکھتا بلکہ اسی ہوا کا ایک جھونکا بن کر باغوں جنگلوں، آبشاروں، جوئباروں، ندیوں اور وادیوں کی گشت کرنا چاہتا ہے۔ نسیم بہار کی طرح وہ بھی چشموں میں نہانا اور ندی کے آئینے پر تصویریں بنا کر سوئی ہوئی موجوں کے جادو کو جگانا چاہتا ہے۔ شاعر کی دلی تمنا ہے کہ نسیم بہار کا ساز ہمراز اور آواز بن کر اس کی سانسیں اس کے معطر جھونکوں میں اس طرح مل جائیں کہ شاعر اور نسیم بہار کی دو الگ الگ ہستیاں محسوس نہ ہوں۔

نسیم بہار سے

مجھے بھی ساتھ لیتی چل فضائے بوستانی میں
گلوں کی بادشاہت طائروں کی حکمرانی میں

جہاں نکہت کو تو آزاد اور پابند کرتی ہے
گلوں کے کنٹروں کو کھولتی اور بند کرتی ہے
جہاں سرشار ہوکر تو ستار اپنا بجاتی ہے
جہاں تو رقص کرنا شاخساروں کو سکھاتی ہے
جہاں نوخیز شاخیں دیکھتی رہتی ہیں مڑ مڑ کر
تری نازک خرامی کی ادائے دلستاں اکثر
نہاتی ہے جہاں تو قہقہہ زن آبشاروں میں
عقاب تیز پر کی طرح اڑتی جو ئباروں میں
جہاں ندی کے آئینے پر تصویریں بناتی ہیں
جہاں سوئی ہوئی موجوں کے جادو کو جگاتی ہے
جہاں بوسوں سے تیرے نئے کے جنگل گنگناتے ہیں
کبھی نغمے سناتے ہیں کبھی سیٹی بجاتے ہیں
مرے دل کی تمنا ہے میں تیرا ساز بن جاؤں
ترا ہمراز بن جاؤں تری آواز بن جاؤں
مری سانسیں ترے انفاس میں اے کاش کھو جائیں
یہ دونوں ہستیاں اس طرح مل کر ایک ہو جائیں

انگریزی شاعر نے ''ڈیفوڈل'' پھولوں کے تختے ہمیشہ کے لیے اپنے تصور میں محفوظ کر لیے تھے اور اپنی اس نظم کو انگریزی ادب میں عمر جاوداں عطا کی تھی۔ محشؔر نے چاندنی رات میں ندی میں اترتے ہوئے بطوں کے قافلے دیکھے تھے۔ اُسے اپنے تصور میں یہ دل نشین منظر اب بھی

متحرک دکھائی دیتا ہے۔ اردو شاعری میں اس موضوع کی مثال شاید مشکل سے ملے گی۔

بطوں کا قافلہ

مچل مچل کے نہاتی تھی چاندنی میں ندی
فروغِ حُسن بہاتی تھی چاندنی میں ندی

ادھر سے پا کے محبت بھرا اشارہ چاند
ندی کی موجوں میں اترا فلک کا پیارا چاند

ندی کی موجوں کے حسنِ شباب کا جوبن
بڑھا رہا تھا دلِ ماہتاب کی دھڑکن

یہ رنگ دیکھ کے ہر موج مسکراتی تھی
کبھی اٹھاتی تھی سر کو کبھی جھکاتی تھی

فضا میں آئی نظر ایک کاپنتی سی لکیر
کہ جیسے نیلے سے آنچل پہ نقرئی تحریر

ہوا میں آنے لگی پھر صدائے موسیقار
کہ جیسے تار شکستہ کی رس بھری جھنکار

رواں تھا قافلے کے آگے قافلہ سالار
اور اس کے پیچھے تھی کچھ دور تک بطوں کی قطار

ندی کی موجوں میں اترا یہ مرمریں بیڑا
ضیائے مہ میں چمکتا ہوا حسین بیڑا

ہر ایک قافلے والا خوشی میں تھا سرشار
ندی پہ دوڑ رہی تھی صدائے موسیقار

ندی کے سینے پہ ابھرے ہزارہا گرداب
جلو میں اپنے لیے کانپتے ہوئے مہتاب

ندی کی لہروں سے ٹکرائے نقرئی سینے
بساطِ موج پر پھیلے بلور کے سینے

ندی پہ یوں خطِ رفتار کے تھے نظارے
کہ جیسے ٹوٹتے ہیں آسمان سے تارے

بلند ہو کے ذرا سطحِ موجِ پر خم سے
بکھیرتے تھے گہر اپنے بازوئے نم سے

ہوا میں ہوتی تھی پیہم جو بارش گوہر
ضیائے ماہ بڑھاتی تھی تابش گوہر

کھنچی کمان سی گردن کو جب بڑھاتے تھے
ندی کی موجوں کے پہلو کو گدگداتے تھے

ندی میں چاروں طرف دلفریب ہلچل تھی
رواں نشاط کی جو موج تھی مسلسل تھی

پڑے گا کیا غم امروز کا وہاں سایہ
جہاں نشاط کا فردوس ہو اتر آیا

زمانہ ہوگیا دیکھا تھا یہ حسیں منظر
ہے آج بھی یہ تصور کا دلنشین منظر

کیٹس ، شیلے، اور ورڈز ورتھ کی طرح محشؔر کا جمالیاتی ذوق بھی اس قدر حساس ہے کہ محبوبۂ فطرت کا ایک مبہم سا اشارہ بھی اس کے دل کی دنیا کو زیروزبر کر دینے کو کافی ہے۔ نیچر کی رعنائیاں اور کافرادائیاں مسرت کے لازوال خزانے ہیں جن کے سامنے دنیا کی تمام دولت ہیچ ہے۔ وہ جذباتی طور پر نیچر کے اس قدر قریب ہے کہ نیچر ہی کا ایک جزو بن کے رہ جاتا ہے۔ نیچر کی عکاسی اردو کے اکثر شعرا نے کی ہے لیکن بیشتر کی حیثیت مصور کی سی ہے۔ محشؔر ایک مصور کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ وہ اپنی زبان سے نیچر کی داستان نہیں سناتا بلکہ نیچر اس کی زبان سے پڑھنے والے سے ہمکلام ہوتی ہے اور ''جز'' ''و'' کا کل'' سے یہ وصال اس کو اردو شاعری میں ایک منفرد مقام دلانے کے لیے کافی ہے۔ درج ذیل نظم میں شاعر اور نیچر کا یہ رشتہ بخوبی ظاہر ہے۔

میں تنہا نہیں ہوں

یہ ندی کی موجوں کے شیریں ترانے
یہ معصوم نغموں کے دلکش فسانے
یہ نکھرے شگوفے یہ گل تازے تازے
یہ شاداب وادی کی چہرے کے غازے
معطر معطر یہ دھیمی ہوائیں
کسی حُسن نازک کے دل کی صدائیں
گھنی جھاڑیوں کی مسلسل قطاریں
ہوا کے اشاروں کی رقصاں بہاریں
کہیں ابر پاروں کے سائے ندی میں
حسیں کوئی جیسے نہائے ندی میں
پرندوں کے نغموں کے طوفاں فضا میں
یہ پرواز کی سنسناہٹ ہوا میں
پپیہے کی سوزندہ لَے کے شرارے
ہواؤں میں بہتے ہوئے غم کے دھارے
میں ان سب کا ہمراز ہوں ہم نشیں ہوں
میں تنہا نہیں ہوں میں تنہا نہیں ہوں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیٹس، شیلے اور ورڈز ورتھ کی شاعری کو محشرؔ نے صرف پڑھا ہی نہیں بلکہ محسوس بھی کیا ہے۔ اُن کی خودنوشت بیاض ‘‘محشرستان’’ میں جو اس وقت میرے پیش نظر ہے اس کا ایک دلچسپ ثبوت مل جاتا ہے۔ اس ضخیم بیاض کے آخری صفحہ پر محشرؔ نے شیلے کے عنوان سے درج ذیل سطور پنسل سے نقل کی ہیں۔

Shelley

Soul meets soul on lover's lips,

It was thy kiss, love that made me immortal,

See! the mountain kiss high heaven,

And the waves clasp one another,

No sister flower ould be forgiven,

If it disdained its brother,

And the moon-beams kiss the sea,

What are all these kissings worth,

If thou kiss not me.

شیلے کے ان خیالات سے شاعر بے حد متاثر ہے۔ اسی بیاض میں ایک نظم مضطرب روحوں کا سنگم نظر آتی ہے۔ اردو میں یہ خیالات انوکھے ہیں۔ ان پر شیلے کا پرتو موجود ہے لیکن محشرؔ نے اپنے زور تخیل اور شاعرانہ استدلال سے اسے بہت خوبصورت اور موثر بنا دیا ہے۔

مضطرب روحوں کا سنگم

محبت کا فرازکوہ جب پیغام دیتے ہیں
فلک کی نیلگوں ساری کا آنچل چوم لیتے ہیں
نسیم صبح رنگین گلکدوں سے جب گذرتی ہے
گِل نوخاستہ کو چھیڑتی ہے پیار کرتی ہے
رُپہلے میکدے میں جھومتی ہیں چاند کی کرنیں
ندی کا حسن سیمیں چومتی ہیں چاند کی کرنیں
گلوں میں حسن کا سرشار بھونرا جب کہ آتا ہے
چمن میں ہر طرف بوسوں کا اک طوفان لاتا ہے
یہ ربط حسن و جذبِ عشق کا پیمان محکم ہے
جسے کہتے ہیں ''بوسہ'' مضطرب روحوں کا سنگم ہے

اپنی فطرت نگاری کے سلسلے میں محشرؔ نے عام طور پر اپنے دل کی بات کہی ہے اور اپنی آنکھوں پر بھروسہ کیا ہے۔ ان کا نیچر کا علم مطالعہ سے زیادہ مشاہدے پر مبنی ہے، یہی سبب ہے کہ ان کی نظموں کے موضوعات بڑے اچھوتے اور نادر ہیں۔ ''شام کے وقت بارش کے بعد پرندوں کی کیفیت''، ''عشق پیچاں کا شرابی''، ''سرد پونوں کے چاند سے خطاب''، ''شکستہ پر مرغابی''، ''آزاد کنیری''، ''بتکدہ آباد'' وغیرہ وغیرہ۔ ان منظومات کے عنوانات کی طرح ان میں پیش کیے گئے خیالات بھی تازگیٔ فکر اور ندرت تخیل کے حامل ہیں۔ ''شکستہ پر مرغابی'' اردو نظم میں یقیناً ایک نہایت بیش قیمت اضافہ ہے۔

شکستہ پر مرغابی

چمیلی کے لچکتے کنج تھے سرسبز میداں تھا
بھری برسات تھی امنڈا ہوا بادل کا طوفاں تھا

کروندے کے وہ اُجلے پھول اور وہ سُرخ آویزے
کہیں ہیرے کی کنیاں تھیں کہیں یاقوت کے زیزے

ہوا کے مست بھونکے جب کہ ان کے پاس آتے تھے
ہر اک بوسے پہ رنگ و بو کے طوفاں مسکراتے تھے

گھنے پیڑوں میں کویل اپنا سازِ غم بجاتی تھی
مرے بچپن کی پہچانی ہوئی آواز آتی تھی

ذرا کچھ دور پر اک چشمہ گل پوش بہتا تھا
کبھی کچھ شور کرتا تھا کبھی خاموش بہتا تھا

گلوں کی ٹہنیاں شفاف چشمے میں نہاتی تھیں،
ابھرتی تھیں لچکتی تھیں کبھی غوطے لگاتی تھیں

ٹپکتے تھے کبھی کچھ گوہرِ خوش آب پتوں سے
شفق کا رنگ گل سے جلوۂ سیماب پتوں سے

نوا سنجانِ صحرا شادماں تھے چہچہاتے تھے
کبھی پر کو پھلا کر صاف چشمے میں نہاتے تھے

پروں کو اپنی منقاروں سے جب یہ صاف کرتے تھے
نمی سے رنگ منقاروں کے بڑھتے تھے نکھرتے تھے

لب ساحل تھی اک زرّیں قبا خوش رنگ مرغابی
فسردہ، پیکرِ غم، نیم جاں، تصویر بے تابی
میں اس کے پاس جب پہنچا مرا دل غم سے بھر آیا
کہ میں نے پر شکستہ پیکر معصوم کو پایا
کسی بے رحم کی بندوق نے یہ ظلم توڑا تھا
دل احساس کا بے درد ہو کر خوں نچوڑا تھا
ترا انساں خدایا کس قدر بے داد کرتا ہے
ترے رنگیں کھلونے توڑ کر دل شاد کرتا ہے۔

محشؔر کے کلام میں ہیئت کے اعتبار سے بھی ایک منفرد تجربہ موجود ہے۔ انھوں نے اپنی موضوعاتی تخلیقات کو اکثر رباعی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ایک موضوع پر کہی گئی رباعیات میں مربوط اور مسلسل خیالات نظم کیے گئے ہیں جس سے موضوع کی یک رنگی اور تسلسل میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مثال کے لیے مندرجہ ذیل تخلیقی نظم پارے ملاحظہ ہوں۔

برسات کی شام

نکھرا نکھرا ہے حُسن دوشیزۂ شام
جھونکے ہیں ہوا کے زندگی کے پیغام
پھیلے ہیں ابر کے رُپہلے ٹکڑے
کچھ ان میں سبک سیر ہیں کچھ مستِ خرام
بھونروں کا فسانہ غم انگیز چھڑا
کویل کا ترانہ الم ریز چھڑا
شاخوں کو صبا نے جب ذرا جنبش دی
گلزار کا نغمہ دل آویز چھڑا

بھونرے مستانہ وار پھولوں پہ گرے   ہو ہو کے بے قرار پھولوں پہ گرے
چھیڑا جو صبا نے تھپکیاں دے دے کر   اٹھ اٹھ کے بار بار پھولوں پہ گرے
گلشن کی فضا میں تتلیاں تھرائیں   یا باغ میں اڑتی ہوئی پریاں آئیں
یا دست بہار نے تماشے کے لیے   پھولوں کی ہوا میں پتیاں بکھرائیں
بکھرے ہوئے پھولوں میں خیابانوں میں   یا بادۂ مشک بود ہے پیمانوں میں
ہیرے برسا کے ابرِ مست گیا   اب پھول برس رہے ہیں بستانوں میں
سنولا گیا منظرِ ضیا بار کا رنگ   پھولوں کا رنگ اور اشجار کا رنگ
میلی سی ہوگئی سنہری چادر   پھیکا پھیکا سا اب ہے گلزار کا رنگ
ہنگامۂ گلشن میں کمی سی آئی   ہلکی سی ہر طرف خموشی چھائی
بکھری زلفِ سیاہ دوشیزۂ شام
تاروں نے کہیں کہیں جھلک دکھلائی

ہنس

موجوں پہ ندی کے حکمراں ہوتے ہیں
سینے تانے ہوئے رواں ہوتے ہیں
ہنسوں کی خوشی دید کے قابل ہے جب
جھٹکار کے پر گہرفشاں ہوتے ہیں

بگلے

نسریں کی کوئی شاخ گل بار ہوئی
یا سلک گُہر مایلِ رفتار ہوئی
یا ابر سیاہ میں ہے بگلوں کی قطار
یا چرخ پہ کہکشاں نمودار ہوئی

تتلی

نازک خوش رنگ زرفشاں ہیں کچھ پھول
نیلے کچھ پھول ارغواں ہیں کچھ پھول
گلزار میں تتلیاں نہیں رقصاں ہیں
آغوشِ نسیم میں رواں ہیں کچھ پھول

مور

نظارے کے واسطے ہیں زریں جلوے
یہ روح نواز اور حسن آگیں جلوے
سائے میں درختوں کے ہیں رقصاں طاؤس
یا ابر میں قوس کے ہیں رنگیں جلوے

جُگنُو

جگنو یہ نہیں فلک سے ہے بارش نور
یا دوشِ نسیم پر رواں شعلۂ طور
یا ساغرِ ماہ سے ہیں چھلکتے قطرے
یا برق کے ذرّوں سے فضا ہے معمور

کنول

پھولوں سے کنول کے بھر گئے ہیں تالاب
یہ حسن صبیح اور یہ رنگ شباب
ہاتھوں نے کسی مست کے پھیلا دی ہے
بلور کی پیالیوں میں کچھ سُرخ شراب

کویل

خاموش فضا کی زندگانی تم ہو
جنگل میں صدائے لن ترانی تم ہو
کویل کے جگر فگار و پیہم نالو
میری کھوئی ہوئی جوانی تم ہو
نازک نئی ڈالیوں میں روپوش نہ ہو
اے پیکرِ غم نالہ فراموش نہ ہو

بے چین ہے روح درد سننے کے لیے
پھر کوک خدا کے واسطے خاموش نہ ہو

بھنورا

دوشیزۂ گل عذار کی آنکھیں ہیں
یا آہوے مرغ زار کی آنکھیں ہیں
بھنوروں سے بھرے سفید پھولوں کو نہ پوچھ
یہ پھول نہیں بہار کی آنکھیں ہیں

محشؔر کا سرمایۂ شعری بہت قلیل ہے لیکن اس قلت میں بھی ان کے یہاں شعریت کی کثرت اس انداز سے محسوس ہوتی ہے کہ انھیں اردو کے فطرت نگاروں کی صف اول میں جگہ دی جاسکتی ہے۔

محشؔر کی منتخب نظموں کا ایک مجموعہ ''نگار فطرت'' کے نام سے ''اکادمی پنجاب، لاہور'' نے جولائی ۱۹۵۴ء میں شایع کیا تھا۔ اس مختصر مجموعے میں ان کی ۵۱ نظمیں شامل ہیں اور اس کا پیش لفظ اور مقدمہ صلاح الدین احمد اور نذیر آغا کے قلم سے ہے۔ مجموعہ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے جس میں متن کے ۱۱۱ صفحے ہیں۔ محشؔر مرحوم نے اپنی یہ نظمیں اپنی اسی بیاض سے منتخب کی ہیں جو ''محشرستان'' کے عنوان سے اس وقت میری تحویل میں ہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں وہ ''نگار فطرت'' کا دوسرا حصہ بھی مرتب کر رہے تھے لیکن موت نے ان کے ہاتھ سے قلم چھین لیا۔ ان کی دوسری قابل قدر تالیف ان کا ''تذکرہ شعرائے بنارس'' ہے جو دو حصوں میں منقسم ہے اور ابھی تک ان کے علم دوست داماد جناب عباس حسین اور ہونہار فرزند ڈاکٹر حسن بیگ کی تحویل میں

غیر مطبوعہ حالت میں پڑا ہے۔ پہلے حصے میں ۱۸۰۰ء سے لے کر ۱۹۰۰ء تک اور دوسرے میں ۱۹۰۰ء سے ۱۹۵۵ء تک کے اسی بنارسی شعرا کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر حسن بیگ اور جناب عباس حسین کی خواہش کے احترام میں ’’تذکرہ شعرائے بنارس‘‘ راقم الحروف کے مقدمہ اور تعلیقات کے ساتھ اسی سال شایع ہو جائے گا۔

غنیؔ بنارسی

شیخ عبدالغنی بنارس کے ادبی ماحول میں منشی غنیؔ بنارسی کے نام سے پکارے جاتے تھے اور اپنے زمانے کے نامور سخنوروں میں ان کو جگہ ملتی تھی۔ اپنے استاد مرزا محمد حسن فائزؔ کے بعد غالباً وہ بنارس کے سب سے بڑے عروضی شاعر تھے جنھوں نے فن شاعری اور اس کے رموز و دقائق پر عبور کا مظاہرہ جا بجا اپنی تخلیقات میں کیا ہے اور فن عروض اور علم بیان کی عالمانہ روایات کو نہ صرف اپنی شاعری میں برتا ہے بلکہ ان ادبی اور فنی نکات کے تعارف و ترویج کے لیے بھی شعوری کوششیں کی ہیں۔ غنیؔ غزل کے شاعر تھے لیکن ان کی قادرالکلامی کا مظہر ان کے شاندار قصائد ہیں جن میں ان کی روانی طبع بڑے زور شور سے موجزن نظر آتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے قدامت کا رنگ غالب ہونے کے باوجود کہیں کہیں وہ جدید شاعر معلوم ہوتے ہیں اور یہ مقامات وہ ہیں جہاں انھوں نے حیات اور کائنات سے اپنی شناسائی کا ثبوت دیا ہے یا اپنے ماحول اور شہر کی سماجی اور تہذیبی اقدار کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

غنیؔ ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ صیغر سنی میں والدہ کے انتقال کے سبب ان کی ایک عمر ننیہال میں گزری۔ اپنے نانا حکیم ابوالمنصور صاحب کے زیر سایہ خاندانی رکھ رکھاؤ اور وضع داریوں کے جھرمٹ میں انھوں نے حسن اخلاق اور حسن معاشرت کی بنارسی روایات کا احترام

کرنا سیکھا۔ ان کے اوائل شباب میں ننیہال اور ددھیال دونوں انقلاب زمانہ کا ہدف ٹھہرے اور آناً فاناً دونوں گھروں کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد سرک سرک کر بنارسی مہاجنوں کی تھیلیوں میں سما گئی۔ غنیؔ کے لیے یہ بڑا صبر آزما زمانہ تھا۔ ان کے والد شیخ محمد ایوب اشرف نے بارہا کوشش کی کہ تاجرانہ کمی بیشی کے غیر یقینی ماحول میں غنیؔ حصول علم سے اپنے مستقبل کو محفوظ کرلیں لیکن یہاں طبیعت نے وہ سیمابی خاصیت پائی تھی کہ بزرگوں کی ہزار پابندیوں کے باوجود غنیؔ کا پائے استقامت کسی مکتب میں نہ ٹھہرا۔ بارہ سال کی عمر تک غنیؔ لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں بالکل کورے تھے اور عین ممکن تھا کہ ہمیشہ کے لیے زیر زمینی کرگھوں کا جزو بے حس بن کے رہ جاتے لیکن اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کے ذہن اور ذوق سلیم کو جھنجھوڑ کر بیدار کردیا۔ میں نے اس کی تفصیل معتبر بزرگوں سے سنی ہے۔ چونکہ اس سے غنیؔ کی شاعری کے آغاز اور حصول علم سے دلچسپی پر روشنی پڑتی ہے اس لیے اس کا بیان مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حاجی مُنا صاحب کے دولت کدہ پر ایک شب اندر سبھا کا ناچ ہو رہا تھا۔ غنیؔ بچوں میں بیٹھے تماشہ دیکھ رہے تھے کہ یکایک سبز پری نے گانا شروع کیا۔

محمد کا بڑا جاہ و حشم ہے
زیادہ سب سے اور اللہ سے کم ہے

یہ مطلع غنیؔ کے دل و دماغ پر چھا گیا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اسے پڑھتے رہے۔ ناچ ختم ہو گیا۔ محفل برخاست ہو گئی۔ دنیا اپنے اپنے گھروں کو سدھاری لیکن غنیؔ اسی شعر کی کیفیت میں کھوئے رہے اور گھر پہنچتے پہنچتے اسی زمین میں کئی شعر کہہ ڈالے۔ غنیؔ کے چچازاد بھائی عبدالحمید خود شاعر تھے اور فائزؔ کے شاگرد تھے۔ ان کو ننھے غنیؔ کے ان اشعار نے اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے غنیؔ کو مع ان کے کلام کے فائزؔ کے دربار میں پیش کردیا۔ زندگی کا یہی موڑ

براہ راست غنیؔ کو علم و ادب کی شاہراہ پر لے آیا۔ استاد نے اشعار سنے۔ [1] حوصلہ افزائی کی اور پوچھا یہ شعر تم نے خود لکھے ہیں؟ جواب ملا ”خود کہتے ہیں لیکن خود لکھتے نہیں کیوں کہ میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔“ گو یہ حقیقت تھی مگر استاد نے اسے شکست نفسی سمجھ کر تاکید کی ”آئندہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر لانا“۔ استاد کی اس فرمائش نے غنیؔ کو لکھنے پڑھنے کی طرف ایسا متوجہ کیا کہ زندگی کے آخری لمحہ تک حصول علم ان کے لیے ایک مشن بن کر رہ گیا۔ انھوں نے اس کے بعد اپنی ساری عمر حصول علم اور علمی و ادبی خدمات کی نذر کی۔ اپنی پسماندہ برادری کی زبوں حالی اور علمی پستی کے پیش نظر مدرسہ محمود المدارس کا سنگ بنیاد رکھا جس کے معلمین میں منشی بیتابؔ بنارسی اور خود غنیؔ بھی شامل تھے۔ رفتہ رفتہ یہی مدرسہ مرکزی تعلیمی ادارے کی حیثیت اختیار کر گیا اور آج جامعہ اسلامیہ کے نام سے ایک بڑی بارونق درسگاہ کی صورت لیے ہوئے ہے۔

منشی غنیؔ کا قد درمیانہ، رنگ کھلتا ہوا اور بدن چھریرا تھا۔ جوانی میں پہلوانی کا شوق تھا اور باقاعدگی سے کسرت بھی کرتے تھے۔ پہلوانی میں ایک دفعہ گردن پر چوٹ آئی تو گردن میں خفیف سا خم پیدا ہو گیا جو آخر عمر تک قائم رہا۔ لباس میں ان کو پاجامہ اور انگرکھا پسند تھے۔ پاجامہ چھوٹی مہری کا ہوتا تھا اور شیروانی علی گڑھ ٹائپ کی۔ گول ٹوپی اکثر سر کی زینت بنی رہتی تھی۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت بڑی بارعب تھی۔ اپنے شاگردوں اور مداحوں میں گھرے رہنا اور ہمہ وقت شعر و سخن میں مصروفیت ان کے مرغوب مشاغل تھے۔ غنیؔ کا مزاج صوفیانہ تھا۔ اپنے روحانی اعتقادات کے لحاظ سے وہ مولانا کامل صاحب ولید پوری کے مرید تھے۔ مرشد سے

---

[1] غنیؔ کے وہ ابتدائی اشعار یہ ہیں۔

اگر سر پر محمدؐ کا قدم ہے
تو پھر روز قیامت کیا الم ہے
وہ عالی مرتبہ روضہ ہے ان کا
سرِ افلاک بھی سجدے میں خم ہے
محمدؐ سا جو رہبر ہم نے پایا
خدا کا خاص یہ ہم پر کرم ہے
مدینہ ہند سے ہر چند ہے دور
اگر ہے جذب الفت دو قدم ہے

والہانہ محبت فرماتے تھے۔ پرانے کاغذات میں ایک ''قطعہ تاریخ وصال'' نظر پڑا ہے جو غنیؔ نے اپنے مرشد کے انتقال پر ملال پر موزوں کیا تھا۔ اس قطع کے ہر مصرع سے تاریخ نکلتی ہے اور چونکہ یہ ان کی تاریخ گوئی اور فارسی گوئی دونوں سے دلچسپی کا ثبوت ہے اس لیے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

قطعہ تاریخ وصال

حضرت مولانا و مرشدنا غوث الوقت چراغ ربانی شاہ محمد کامل صاحب نعمانی

وصال پیر ما شد وا دریغا ۱۳۲۲ھ ھجری
کہ بود آن صادق و روشن ضمیری ۱۳۲۲ھ ھجری
شہِ کامل چراغ بزم ادلی ۱۳۲۲ھ ھجری
دلی ای گوشہ گیری بی نظیری ۱۳۲۲ھ ھجری
بہ ذکری محو ہردم در حقیقت ۱۳۲۲ھ ھجری
کہ مثلش بود شاہی یا فقیری ۱۳۲۲ھ ھجری
مجلّی ساخت عالم از صباحش ۱۳۲۲ھ ھجری
کہ بوداو مظہر شمع قدیری ۱۳۲۲ھ ھجری
کہ ہشیار است از جام شرابش ۱۳۲۲ھ ھجری
خراباتی ای صوفی یا فقیری ۱۳۲۲ھ ھجری
بگویم آہ تاریخ و صالش ۱۳۲۲ھ ھجری
کہ بدالحق حسن روشن ضمیری ۱۳۲۲ھ ھجری

۱۹۰۴ء

فکر معاش کے سلسلے میں غنیؔ کو بنارسی کپڑے کے نقشبند کی حیثیت سے کام کرنا پڑتا تھا لیکن اس کام میں وہ اپنا بہت کم وقت صرف کرتے تھے۔ خود ان کے اہل خانہ (مخصوصاً بیگم غنیؔ) ان کے علم و فضل اور شاعرانہ صلاحیتوں کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ گھر میں لاکھ پریشانیاں ہوں، غنیؔ اگر فکر سخن میں ہیں تو بیگم غنیؔ کسی کو مخل نہ ہونے دیں گی۔ شاگردوں اور مداحوں کی ان کو کمی نہ تھی لیکن جذبۂ غیرت اور قناعت پسندی کے اوصاف حمیدہ نے سوالی ہونے کے باوجود کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانے دیا۔ اس لحاظ سے وہ اسم با مسمیٰ تھے۔ شطرنج سے بہت دلچسپی تھی۔ اوائل عمر میں شکار کا بھی بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ شرخاب کے جوڑے پر فائر کیا۔ ایک پرندہ گھائل ہوگیا تو اس کے جوڑے نے گھائل کو اپنے پروں سے ڈھانپ لیا۔ غنیؔ اس منظر سے اتنا متاثر ہوئے کہ شکار کھیلنا ترک کر دیا۔

غنیؔ کا شمار بنارس کے معززین میں ہوتا تھا۔ معاصرین میں ان کے سب سے بڑے حریف خود ان کے استاد بھائی منشی بیتابؔ بنارسی تھے۔ ایک ہی استاد یعنی مرزا فائزؔ کے شاگرد ہونے کے باوجود دونوں استادوں میں اکثر نوک جھونک رہتی تھی۔ دونوں کے شاگردوں کی آپس میں ٹھنی رہتی تھی لیکن غنیؔ اور بیتابؔ خود بڑے بلند اخلاق بزرگ تھے۔ اسی لیے ذاتی طور پر ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے تھے۔ مشاعروں کی طرح پر بڑی دھوم دھام اور بڑے اہتمام سے غزلیں کہی جاتی تھیں اور چپکے چپکے ہونہار اور خوش آواز پٹھوں کی پیٹھ ٹھونکی جاتی تھی لیکن جب دونوں استاد ایک دوسرے کے مقابل ہوتے تھے تو اچھے اشعار کی داد و تحسین میں بخل سے کام نہ لیتے تھے۔ ایک تحریری سند کے مطابق مرزا فائزؔ نے غنیؔ کو اپنے شاگردوں میں افضل تسلیم کیا تھا۔ غنیؔ کے شاگردوں نے اس سند کی رو سے غنیؔ کو مرزا فائزؔ کا جانشین قرار دیا ہے۔ اصل تحریر میری نظروں سے گذری ہے۔ بڑی مشکل سے کانپتے ہاتھوں سے یہ عبارت لکھی گئی ہے۔

''شیخ عبدالغنی صاحب متخلص بہ غنیؔ میرے شاگردوں میں فی الواقع بہت بڑے مرتبے کے ہیں۔ اگر میری شاعری کوئی چیز ہے تو ان کی شاعری اس کا بہت ہی اعلیٰ درجہ کا حصہ ہے۔''

محمد حسن فائزؔ ۲۵/ اپریل ۱۹۲۹ء روز پنجشنبہ ۱۴/ ذیقعدہ ۱۳۴۷ھ

آج کے دور میں اس سند کی کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو آج سے چالیس پچاس سال پہلے کے ادبی ماحول میں اس سند کو شاگرد کے لیے حیات جاوید کا سرٹیفکٹ خیال کیا جاتا تھا۔ منشی بیتابؔ اور منشی غنیؔ کے شاگردوں میں بھی یہ سند ایک کی تحقیر اور دوسرے کی توقیر خیال کی جاتی تھی اور دونوں استادوں کی ادبی ارزش کا تعین اسی پیمانے پر مبنی ہو کر رہ گیا تھا۔ اب رہی فائزؔ کی شاعری کے مرتبے کی بات کہ غنیؔ کی شاعری کو اس کا بہت ہی اعلیٰ درجے کا حصہ تسلیم کیا گیا ہے۔ تو اس کا فیصلہ روح عصر بہت پہلے سے کر چکی ہے۔

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت　　رفت و منزل بدیگری پرداخت

غنیؔ مرحوم بہت سے فنون میں مہارت رکھتے تھے۔ قیافہ شناسی کے ساتھ ساتھ خواب کی تعبیر بیان کرنے میں بھی ان کے ہم عصر ان کو منتہی سمجھتے تھے۔ اس فن میں ان کی کامیابی کے بہت سے واقعات بنارس میں مشہور ہیں۔ ان کی ادبی خدمات مُسلّم ہیں۔ انھوں نے ایک پوری نسل کے ادبی ذوق کی تربیت کی ہے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان کے لائق فرزند اور بنارس کے جانے پہچانے شاعر حضرت مسلم بنارسی اسی ادبی خاندان کے ایک اہم فرد ہیں۔

غنیؔ کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ ان کے ایک اپنے مصرع سے بھی تاریخ وفات نکلتی ہے یعنی

قصہ تمام چلیے بہ منزل تمام ہے = ۱۳۵۷ھ

مسلم صاحب نے مزار غنیؔ حقائق شناس = سے تاریخ نکال کر ان کے مزار پر کندہ کروائی ہے۔

۱۳۳۸ھ

منشی غنیؔ محلہ مدنپورہ کے نزدیک ریوڑی تالاب میں اپنے موروثی قبرستان میں دفن ہیں۔

غنیؔ بنارسی کی تصنیفات میں مسدس غنیؔ موسوم بہ قومی اصلاح اور ایک نعتیہ مسدس ''چشمۂ رحمت'' ابتدائی دور میں شایع ہو چکے ہیں، ان کا دیوان جو غزلیات اور قصاید پر مشتمل ہے ابھی تک غیر مطبوعہ صورت میں میرے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ ایک مختصر رسالہ صنائع بدائع کے بیان میں مع امثلہ شعری زمانے کی توجہ کا منتظر ہے۔ ابتدا میں غنیؔ نے ناول بھی لکھے تھے اور ڈرامے بھی۔ ان کا ایک ناول ''توبتہ النصوح'' کے انداز میں موجود تھا۔ جس میں انھوں نے اصلاحی اسلوب اختیار کیا تھا۔ اب ناپید ہے۔ اسی طرح چند ڈرامے آغا حشرؔ کاشمیری اور حسنؔ لکھنوی کے طرز پر مقفیٰ عبارت میں تحریر کیے تھے۔ ان ڈراموں میں گیت بھی تھے اور غزلیں بھی۔ اب ان کا کہیں وجود نہیں۔

اپنے زندہ دل حریف منشیؔ بیتاب بنارسی کے خمسوں کے جواب میں خمسے اور کجریاں بھی لکھیں لیکن اپنے شاگردوں میں تقسیم کر کے بے تعلق ہو گئے۔

اپنی نعتیہ مسدس ''چشمۂ رحمت'' (مطبوعہ ۱۳۲۰ہجری) کو غنیؔ نے نظام حیدر آباد کے نام نامی سے معنون کیا ہے۔ بارہ صفحات کی اس مختصر نعت کے شروع میں میر محبوب علی خاں نظام حیدر آباد کی ستائش میں ایک مختصر قصیدہ بھی درج ہے جس کا مطلع ہے۔

عیاں قلم سے ہے شکل شعاع جلوۂ ماہ
مثال مردم دیدہ ہیں نقطہائے سیاہ

مسدس کے آخر میں ایک ''مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات'' اور ایک نعتیہ غزل بھی

شامل کی گئی ہے۔ مسدس مجموعی حیثیت سے غنیؔ کی پختہ گوئی کا ثبوت ہے۔

اللہ رے شوقِ نعت محمدؐ دم رقم   چلتا ہے سر سے تختۂ قرطاس پر قلم
کب شوقِ روشنائی کو کہیے قلم سے کم   آگے رواں ہے خامۂ رنگیں سے دو قدم
شوقِ ثنا میں محو ہر اک خوش نہاد ہے
ہو جلد ذکر شاہِ رسل یہ مراد ہے

"قومی اصلاح" (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) مولانا حالیؔ کے "مدوجزر اسلام" کی صدائے بازگشت ہے۔ چوبیس صفحات پر مشتمل اس مسدس کے شروع میں غنیؔ نے اپنے آشتی پسند نظریہ کی وضاحت اس رباعی میں کر دی ہے۔

گر قوم کا ہم فخر کریں بے جا ہے
اصل ایک ہے نسل ایک عبث جھگڑا ہے
سب حضرت آدم کی ہیں اولاد غنیؔ
اچھا جو کرے کام وہی اچھا ہے

اس مسدس کا موضوع مسلمانوں کی گذشتہ سنہری روایات اور موجودہ کاہلی، بے پرواہی، اخلاقی اور سماجی پستی ہے۔ فضل فروشوں اور پڑھے لکھے جاہلوں کی مذمت کی ہے۔ نام نہاد مرشدوں اور سالکوں کا ذکر کیا ہے۔ حالیؔ کی ہم زبانی میں قوم سے خطاب فرماتے ہیں۔

اُٹھو نیند سے آنکھ کھولو خدا را   کہ بیڑا بھنور میں پڑا ہے تمھارا
نہ ہے ناخدا اور نہ ہے کچھ سہارا   نہ یہ سوجھتا ہے کدھر ہے کنارا
نہ جاؤ ادھر تم ہوا ہے جدھر کی
ذرا سوچ لو ہے کدھر راہ گھر کی

نہ ہوتیں کاش پلکیں گل کے یا اشکوں میں بہہ جاتیں
مزہ جب تھا بروز وعدہ اس کی دید بازی کا

بنادے میری بگڑی بھی کہ تیرے در پہ آیا ہوں
بڑا شہرہ سنا ہے میں نے تیری کارسازی کا

بتوں میں کس کا جلوہ ہے نہ سوچا دید بازوں نے
جو ممکن ہو تو ہم منہ پھونک دیں عشق مجازی کا

قسم ہے تیری رحمت کی نہیں میں خلد کا طالب
دکھا دے اپنی صورت واسطہ شاہِ حجازی کا

غنیؔ بام حقیقت تک اگر تجھ کو پہنچنا ہے
لگا لے اس کے آگے جھک کے زینہ سرفرازی کا

غنیؔ کی بیاض میں جو اس وقت زیر نظر ہے غزلوں کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے اور ان کے نیچے کوئی تاریخ نہیں۔ چنانچہ یہ پتہ چلانا ناممکن ہے کہ کون سی غزل کس وقت کہی گئی ہے لیکن غور و فکر سے یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ کچھ غزلیں قدامت کی گہری چھاپ لیے ہوئے ہیں اور کچھ ایسی بھی ہیں جن میں شاعر نے اپنے آپ کو جدّت پسند بنانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ غالباً ابتدائی دور میں غنیؔ اپنے استاد فائزؔ کے نقش قدم پر چلنے میں فخر محسوس کرتے ہوں گے اور روایتی شاعری کی تنگنائے غزل میں انھوں نے اپنی فنی صلاحیتوں کو محصور کر لیا ہوگا۔ بھولی بسری ناسخیت کا یہ وہ ماحول ہے جہاں محاورہ، روزمرہ اور فصیح وغیرہ کی بحث ہی سب کچھ ہے۔ اس فنی دار و گیر میں مضمون و موضوع کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، ہاں الفاظ میں اگر تناسب یا تضاد یا رعایت لفظی کی کوئی اور خوبی دانستہ یا نادانستہ طور پر کلام میں پیدا ہو جائے

تو شاعر بڑا ورنہ مہمل گو تصور ہوگا۔ ذاتی تجربے یا شخصی مشاہدے کا یہاں تصور نہیں، مضامین سب کے پاس گویا پہلے سے موجود ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون کن الفاظ میں ان کو ادا کرتا ہے۔ الفاظ کی اس شاعری میں استاد وہی سمجھا جائے گا جس نے معمولی سے معمولی مضمون کو الفاظ کی جکڑ بند اور باغی قوافی کی گرفت میں لاکر لفظی بازیگری کا عملی ثبوت بہم پہنچایا ہو۔ اس قسم کی شاعری میں جذبات کی بجائے مشق سے کام لیا جاتا ہے اور چند محدود مضامین والفاظ کے کیل کانٹوں سے لیس ہو کر شاعری کا قلعہ سر کرنے کی کمر توڑ کوشش کی جاتی ہے۔ اب غنیؔ کو اس عالم میں دیکھیے۔

بے نشاں خط کو صنم لے کے مرے گھر آیا
خاص اللہ کا بھیجا یہ پیمبر آیا

تیرے آنے کی یہاں کون خبر کر آیا
جو اٹھا قبر سے دوڑا سرِ محشر آیا

سرمہ تیرے لیے اے چشم ستمگر آیا
تیز کرنے کو چھری طور کا پتھر آیا

کیوں نہ میں خاک ہوا برق تجلی سے تری
دیکھ کر طور کو بے ساختہ دل بھر آیا

رکھ لیا سر پہ تجھے جان کے اے بت میں نے
زیرِ پا عالم وحشت میں جو پتھر آیا

دم آخر بھی نہ دیدار کی حسرت نکلی
اشک آنکھوں میں اُسے دیکھتے ہی بھر آیا

بدگمانی نے بڑا کام بگاڑا میرا
کی فغاں غیر نے الزام مرے سر آیا
دیدۂ یار نے تسخیر کیا عالم کو
لے کے چلتا ہوا جادو یہ فسوں گر آیا
گھر میں اللہ کے روشن ہے غنیؔ گھی کا چراغ
خانۂ دل میں جو وہ ماہ منور آیا

غنیؔ کے رنگ شاعری میں تغیر کا سبب بعد میں ان کی شادؔ عظیم آبادی سے ملاقات ہے۔ شادؔ کسی وقت بنارس میں تشریف لائے تھے۔ فائزؔ اور ان کے شاگردوں نے شادؔ کی مناسب پذیرائی کی تھی لیکن شاید فائزؔ کے حق میں یہ بات بہت اچھی ثابت نہیں ہوئی کیونکہ ان کے غنیؔ ایسے شاگردوں کا حلقہ اب استاد کے رنگ شاعری سے اکتا گیا اور شادؔ کے زیر اثر انھوں نے اپنا لہجہ بدل ڈالنے کی سعی شروع کی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ فائزؔ کا سکہ ان کے دل سے اُٹھ گیا ہو۔ زمانے کا ساتھ دینے کا شوق ایک طرف استاد پرستی اپنی جگہ پر ہمیشہ قائم رہی۔ بقول غنیؔ ۔

مدتوں کی ہے خدمت فائزؔ
جب غنیؔ کچھ تجھے شعور آیا
نیز نہ کیوں قبضہ ہو میرا اے غنیؔ ملک معانی پر
کہ میں ہوں جانشیں فائزؔ سے سلطان سخنداں کا

غنیؔ کے کلام میں شادؔ کے رنگ تغزل کی نشاں دہی کرنا...... تقریباً ناممکن ہے۔ انھوں نے فائزؔ سے شادؔ کا رنگ اختیار کرنے کی اجازت ضروری طلب کی تھی اور فائزؔ نے عالی ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کو اس بات کے لیے آزاد بھی کر دیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فائزؔ کی طرح خود غنیؔ اب زندگی کے ایسے موڑ پر تھے جہاں سے پلٹ کر بالکل کوئی دوسرا

راستہ اختیار کرنا ان کے لیے امکان پذیر نہیں ہو سکتا تھا۔ ہاں اسی راستے میں انداز رفتار کو کسی قدر بدلا جا سکتا تھا۔ غنیؔ کے بس کی یہی بات تھی اور یہی ان سے ہو سکا۔ ان اشعار میں قدیم وجدید رنگ کا دلچسپ امتزاج نظر آتا ہے۔

گرد نظر بھی یوں گئی اشک رواں کے بعد
جیسے غبار اڑتا ہے ہر کارواں کے بعد
جاتے ہی تیرے داغِ تمنا ہرے ہوئے
جیسے بہار آئے چمن میں خزاں کے بعد
گر ہم سے ضد نہیں تجھے اے برقِ حُسنِ گل
صیاد کا بھی پھونک دے گھر آشیاں کے بعد
پردے میں بھی چھپے ہوئے یوں آشکار ہو
مہر مبیں ہو جیسے کئی آسماں بعد
ہوگا نہ ختم سلسلۂ جستجو غنیؔ
جائیں گے اس جہان میں اب اس جہاں کے بعد

……

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا   میں رہا ہو کے بھی رہا نہ ہوا
پوچھتے ہم بھی ان سے ان کا مزاج   سامنے ان کے آئینہ نہ ہوا
اس کے وعدے پہ جی رہے ہیں غنیؔ   جس کا وعدہ کبھی وفا نہ ہوا

……

تیرے دیوانے کا ہے کیسا مزاج   جب ذرا بدلی ہوا بدلا مزاج
شیخ جی سے جھک کے ملتا ہوں بہت   پھر بھی حضرت کا نہیں ملتا مزاج

میری دنیا تک بدل دی آپ نے   آپ کا لیکن نہیں بدلا مزاج
ہائے رے نازک مزاجی حسن کی   عشق نے دیکھا کہ بس بدلا مزاج
دم میں کچھ ہے دم میں کچھ ہے دم میں کچھ   خاک کے پتلے کا ہے کیسا مزاج
اب غنیؔ کا حال کچھ ایسا نہیں
کہنے کو کہتے ہیں ہے اچھا مزاج

……………………

بیٹھا ہوں دور باغ سے بے بال و پر نہ چھیڑ
افسردہ خاطروں کو نسیم سحر نہ چھیڑ
یا تو غنیؔ نہ چھیڑ اُسے وہ ہے تند خو
یا چھیڑ بھی اُسے تو سرِ رہ گذر نہ چھیڑ

……………………

یوں تو دنیا میں ہے پیاری سے بھی پیاری آواز
پھر بھی تم تم ہو تمھاری ہے تمھاری آواز
آئی کانوں میں ہمارے نہ تمھاری آواز
حرم و دیر میں سو بار تو ماری آواز
ایک شعلہ سا اٹھا سرد ہوا گرد ہوا
ہائے کس دھن میں مغنی نے اتاری آواز
اس محبت کا برا ہو کہ زمانہ گذرا
گونجتی ہے ابھی کانوں میں تمہاری آواز

……………………

اب تلک نالۂ دل کی جو رسائی نہ ہوئی
آخرش بیٹھ گئی تھک کے ہماری آواز
اب چمن میرا چمن ہے نہ قفس میرا قفس
دے نہ للّٰہ مجھے بادِ بہاری آواز

....

سبک خرامی عمرِ رواں ارے توبہ
نہ گرد اڑے نہ کہیں ہو نشان پا معلوم

....

فریاد میں جب تاثیر نہیں کیا حاصل شور مچانے سے
تہہ کر کے غنیؔ رکھ دیجیے انھیں جن شعروں میں جذبات نہیں

....

کیا انقلاب ہے چمن روزگار میں
ہم دوش پر ابھی تھے ابھی ہیں مزار میں

....

اپنے مآل کار کو کوئی نہ کچھ سمجھ سکے
موت نہ ہو تو زندگی جملۂ ناتمام ہے
بلبل و گل کا ہے بیاں اور نہ ذکر خال و خط
طرزِ سخن میں آپ کے ہم کو غنیؔ کلام ہے

....

روتے کٹی ہے عمر لحد میں بھی روئیں گے   بس ایک رات کے لیے ہم تو نہ سوئیں گے

……

مجھ کو غرض نہ دیر نہ کعبے سے کام ہے
تو سامنے نہیں ہے تو سجدہ حرام ہے
سجدے میں بھی خیال ہے حور بہشت کا
زاہد تری نماز کو میرا سلام ہے
اے زیست آفتاب لب بام آگیا
ہم راہ میں ہنوز ہیں اور وقت شام ہے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ساقی دم اخیر
بھرپور ایک جام کہ لبریز جام ہے
وہ تو نہ آئے پیک اجل آگیا غنیؔ
قصہ تمام چلیے یہ منزل تمام ہے

……

رخصت بہار

سیر چمن کو ہم جو گئے آج اے غنیؔ
دیکھا کہ ایک رنگ نیا آشکار ہے
ہر غنچہ ایک خوں شدہ دل ہے فراق میں
ہر گل کا تیغ ہجر سے سینہ فگار ہے

برگِ شجر میں ہے کف افسوس کی روش
بکھرا کے بال سنبل تر سوگوار ہے

نہر چمن میں پانی کے بدلے بھرے ہیں اشک
شبنم کی آڑ رکھ کے فلک اشک بار ہے

سوسن نے اپنے جامہ کو رنگا ہے ماتمی
لالے کا سینہ غم سے بہت داغدار ہے

تھامے کھڑی ہے نرگس بیمار بھی عصا
آنسو بھرا ہے آنکھ میں زار و نزار ہے

چہرے کا رنگ ہے گل تر کے اُڑا ہوا
مرغ خزاں نصیب کا دل خار خار ہے

پوچھا جو باغباں سے کہ یہ ماجرا ہے کیا؟
رو کر کہا کہ رخصتِ فصل بہار ہے

……

ہر مسرت میں ہے رودادِ قلق — پھول ہنستے ہیں مگر سینہ ہے شق
اے شہیدانِ وفا کچھ تو کہو — غرقِ خوں ہے کس لیے رنگِ شفق
چہرۂ ہستی ہے بے نقش و نگار — عالمِ نیرنگ اک سادہ ورق
شبنم و گل کی نمائش کی قسم — زندگی ہے کچھ مسرت کچھ قلق
سامنے ان کے نہ جانے کس لیے — رنگ چہرے کا ہوا جاتا ہے فق

ہے فنا عینِ بقا عینِ حیات ہے یہی ہستی کا مضمونِ ادق
دشمنوں کو بھول بیٹھا ہے غنیؔ
دوستوں نے دے دیا ایسا سبق

……………………

زندگی ہے اک مسلسل اضطراب   انقلاب و انقلاب و انقلاب
یہ تبسم، یہ ترنم، یہ شباب   تم بھی لاسکتے نہیں اپنا جواب
ہم سے ہوتے ہیں کہاں مست وخراب   ہم نے دیکھا ہے محبت کا شباب
ہر دعا میری دعائے بے اثر   ہر نظر ان کی نگاہ کامیاب

……………………

تم کہاں اور جلوۂ یوسف کہاں   ہے حقیقت پھر حقیقت خواب خواب
دل نے دیکھا ہے مقام حسن وعشق   ایک منزل میں ہیں ماہ و آفتاب
کیا مجھے سمجھا ہے تونے حسنِ دوست   ہم نے تجھ کو کردیا ہے کامیاب
ہوش نے دیکھا نہ جس کو خواب میں   بے خودی نے اس کو دیکھا بے حجاب
حسن کا حُسن تجلی ہائے ہائے   کچھ ہے شوق خود نمائی کچھ حجاب
اے غنیؔ ہم تو نہ سمجھے آج تک   زندگی ہے خواب یا تعبیر خواب

……………………

ہوتو سکتا نہیں ہوسکتا جو ایسا اے کاش
خود تجھی سے ترے جلوے کو چھپاتا اے کاش
عشق رسوا کی طرح حسن نہ رسوا ہوتا
لب پہ آتا نہ مرے نام تمہارا اے کاش

ہنسنے والے تو ملے غم کا مداوا نہ ملا
تم نہ سنتے تھے تو میں کچھ بھی نہ کہتا اے کاش
خود تمہیں حسن کا احساس نہ ہوتا ایسا
دل میں جو تھا مرے وہ لب پہ نہ لاتا اے کاش
درد سے اپنے تو دنیا ہی تڑپتی ہے غنیؔ
دردِ دشمن سے بھی دل میرا تڑپتا اے کاش

……

وہ روٹھ گئے ہنسی ہنسی میں   سب رہ گئی میرے جی کے جی میں
اب کیا ہے کہ ہم نذر کریں گے   افسوس نہ آئے زندگی میں
جانا ہے تمہیں کہیں تو جاؤ   کچھ ہم بھی سمجھ چکے ہیں جی میں
اتنا نہ ہنسے کسی پر انساں   جو اشک نکل پڑیں ہنسی میں
آنا تھا تمہیں تو پہلے آتے   دیکھو رکھا ہے کیا غنیؔ میں

……

پہلے تو اس تک آپ کو پہنچا سکے نہ ہم
پہونچے وہاں تو آپ میں پھر آ سکے نہ ہم
ایسے گرے کہ رہ گئے اک سو پڑے پڑے
اے پائے خستہ تجھ کو بھی سہلا سکے نہ ہم
دل جس طرف ہے منہ بھی ادھر اپنا پھیر لیں
اتنا بھی جی فراق میں ٹھہرا سکے نہ ہم

کیا سر اٹھا اٹھا کے تری راہ دیکھتے
آنسو جب اپنی آنکھ کے ڈھلکا سکے نہ ہم
کیا تیرے ساتھ کیف نظر بھی چلا گیا
تیرے بغیر دل کہیں بہلا سکے نہ ہم
کیا جلد اس نے بخش دئے جرم اے غنیؔ
اپنے کئے ہوئے پہ بھی شرما سکے نہ ہم

……………………

طرفہ اندازِ حیا ان کے نظر آتے ہیں
رہ کے آنکھوں میں بھی دیدار کو ترساتے ہیں
کل سرِ بزم ازل چھین لیا دل میرا
آج وہ سامنے آتے ہوئے شرماتے ہیں
کیا کریں کس سے کہیں حشر ہوا مر کے جیے
آج بھی غدر وہ دیدار میں فرماتے ہیں
دیکھنے والے ترے ہوگئے بیہوش تو کیا
مرنے والے تو فقط نام پہ مرجاتے ہیں
ضعفِ پیری سے نہیں جسم میں رعشہ ہے غنیؔ
صورتِ شمع سحر خوف سے تھراتے ہیں

……………………

قصیدہ نگاری دوسرے اصناف سخن کے مقابلے میں اس لیے بھی مشکل تر ہے کہ اس میں کامیابی کے لیے زبردستِ قوت تخلیق، پرواز تخیل اور تازگی فکر کی ضرورت ہے۔

قصیدے کی شان وشوکت کے لیے بہترین شعری صلاحیتوں کے علاوہ علم وفن بھی درکار ہیں اور موجودہ دور میں عام طور پر یہ سب چیزیں یکجا ملنا بہت دشوار امر ہے۔ ان ہی تاثرات کے پیش نظر عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دور قصیدہ گوئی کے زوال کا دور ہے اور خاقانؔی و انورؔی و عرفؔی کے بنائے ہوئے نقشے پر سوؔدا اور ذوؔق نے اردو میں جس قصر کا سنگ بنیاد رکھ کر بڑی عالی شان عمارت تعمیر کی تھی وہ رفتہ رفتہ اب سنسان ہوتے ہوئے کھنڈر کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔ یہ بات میرے خیال میں سوفی صدی حقیقت نہیں کیونکہ ابھی تیس سال پہلے تک غنؔی بنارسی جیسے قصیدہ نگار موجود تھے جنھوں نے مذکورہ استادوں کی زمینوں میں بھرپور اور کامیاب قصاید لکھ کر یہ ثابت کردیا ہے کہ اردو میں قصیدہ نگاری کا فن ابھی زوال کی پستیوں سے ہمکنار نہیں ہوا۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ غنؔی نے اپنے قصائد کی بنیاد مذکورہ بزرگوں کی طرح کسی فانی ممدوح کی مدح پر نہیں رکھا جس سے ان کا منہ بھی سونے چاندی سے بھر دیا جاتا اور ان کی شہریت ممدوح کے درباریوں اور مصاحبوں کے حلقے کو توڑ کر تمام ممالک محروسہ کر اپنے زیرنگیں کرلیتی۔ قصیدہ نگار کی حیثیت سے غنؔی کی گمنامی کا ایک اور سبب ان کی قناعت پسند طبیعت اور اشاعت و تبلیغ سے تنفر کا جذبہ ہے۔ وہ بنارس سے باہر کم تشریف لے جاتے تھے اور خود بنارس میں کسی ایسی ادبی تنظیم کا تصور تک موجود نہ تھا جس کے توسط سے بنارسی شعرا کی آواز بیرونی دنیا تک پہنچتی ہے۔

اردو زبان میں عام طور پر قصاید کا موضوع سلاطین اور امرا کی مدح یا نعت ومنقبت ہے۔ غنؔی کے کلام میں ''حمد باری تعالیٰ'' کے عنوان سے جو قصیدہ موجود ہے وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے بھی نادر ہے اور اسلوب فکر کی رعایت سے بھی۔ قصیدے کی تشبیب میں بڑی اٹھان

ہے۔ شاعر کی شاعرانہ خوداعتمادی ملاحظہ ہو۔

اے تعالیٰ اللہ پہنچی کس جگہ طبع رواں
جانہیں سکتے فرشتوں کے جہاں وہم وگماں
لامکاں میری علوالعزمی کی جولاں گاہ ہے
زینۂ بام ترقی ہیں مرے نُہ آسماں
ہمت عالی یہ کہتی ہے اجازت ہو اگر
توڑلاؤں عرش کے تارے ابھی بے نردبان
میں سراپا اک طلسم عالمِ نیرنگ ہوں
باغ ابراہیم ہے ہرداغ سوزاں میں نہاں
جامہ ہستی میں مضمر ہے مرے بزمِ نشاط
ہرکلی میں مرے دامن کے ہے گلزارِ جناں
"نحن اقرب" کارگ گردن مری مصداق ہے
جلوہِ زارِ سرِ الااللہ ہے روح رواں
عظمتِ توحید سینے میں جو ہو مضراب زن
ہرنفس کے تار سے نکلے صدائے کن فکاں
سازِ ہستی میں بھرا وہ نغمۂ توحید ہے
چھیڑدوں تو پھر مجھے سجدے کریں کروبیاں
کیوں کہ میرے دل میں اس کی جلوہ گاہِ ناز ہے
لامکاں مسکن ہے جس کا عرش اعظم آستاں

گریز کے بعد جب حمد پہ آتے ہیں تو حقیقت شناسی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

طور سینا جس کے کوچے میں ہے سنگ رہ گزار
ہوش اڑتے ہیں جہاں مانندِ گردِ کارواں

تاب نظارہ کسی کو صورت موسیٰ نہیں
اس لیے وہ دیدۂ عالم سے رہتا ہے نہاں

اس کے دریا کا ہے قطرہ بحر ناپیدا کنار
گرد ہے صحرا کی اس کے گیتیِ شوکت نشاں

کون دریا جس کی ہر ہر موج ہے آغوشِ حور
کون صحرا جس کا ہر ہر گوشہ ہے رشک جناں

حلقۂ گرد اب اس کا ہے محیطِ دور خلق
ہر بگولے میں ہے اس کے گردشِ ہفت آسماں

رشکِ سیّارہ رَوانی میں ہے اس کا ہر حباب
روکشِ قطبِ فلک ہے اس کا ہر سنگ نشاں

اسی زمیں میں غنیؔ اپنے نعتیہ قصیدہ کا آغاز کرتے ہیں تو اس کی بہاریہ تشبیب میں ان کی قادرالکلامی کے جوہر اور زیادہ کھلتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں قاری کو فارسی شاعری کی کلاسکی قضا یاد آنے لگتی ہے۔ جوش طبیعت نے تسلسل اور روانی کی انوکھی مثال پیش کی ہے۔ غنیؔ کی طبع وقار یہاں اپنی شاعری سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتی ہے۔

رونق افروزِ چمن ہے کون آج اے باغباں
خلد سے بھی ہے ریاض دہر کا پلہ گراں

ہیں لدے پھولوں سے ایسے نونہالان چمن
اٹھ نہیں سکتیں زمیں پر ہاتھ رکھ کر ڈالیاں
دانۂ انگور کا گچھا ثریا بن گیا
ہے زمین سبز گلشن میں عروجِ آسماں
پنکھڑی میں یاسمن کی نور صبحِ زندگی
داغ میں لالے کے رنگِ شامِ وصلِ جاوداں
اوس کی بوندیں نہ کہیے موتیوں کے ڈھیر ہیں
نخل کا ہر ایک پتہ ہے کفِ گوہر فشاں
پھول کی کلیوں میں ہیں آثار رنگ انبساط
مسکراتے ہیں بہم گویا حسینان جہاں
ہے نگاہِ دیدۂ نرگس میں جادو کا اثر
ریشۂ شاخِ شجر میں صورت شریاں ہے جاں
سنبلِ پیچاں نے کھولی اپنے گیسو کی گرہ
یا کھلی صحن چمن میں مشک عمبر کی دکاں
کیا تکلف ہے کہ بہر نو عروسان چمن
غنچۂ گل عطر سے لائے ہیں بھر کر شیشیاں
لالہ وگل میں ہے رنگِ روئے غلمان بہشت
اور شاخِ نسترن ہے ساعدِ حورِ جناں

شوکت شاہانہ رکھتی ہے عروس نو بہار
بوئے گل کو دوش بادِ صبح ہے تختِ رواں
قطرۂ شبنم میں ہے تاثیر آب زندگی
پائی ہے سبزے نے مثلِ خضر عمرِ جاوداں
عکس سوسن سے بچھا ہے فرش رنگیں ہر طرف
چادر مہتاب رکھے تہہ لگا کر آسماں
آتشِ گل نے جو کی ہے گرم بھٹی ہر طرف
ابر بن کر چھا رہا ہے سارے گلشن میں دھواں
بن کے ساقی چار سو بیٹھی ہے گلشن میں بہار
ہے سبوئے غنچہ لبریز شرابِ ارغواں
وہ لگی چلنے نسیمِ صبح مثلِ دورِ مے
وہ لگے مستوں کی صورت جھومنے سروِ رواں

ایک اور قصیدہ ''نعت رسولؐ'' میں اس زمین میں نظر آتا ہے جس میں سینکڑوں سال پہلے عرفیؔ اور سوداؔ جیسے باکمالوں نے فلک بوس دولت خانے تعمیر فرمائے تھے۔ آخری دور میں حضرت محسن کاکوروی نے جو قصیدہ اس زمین میں لکھا ہے وہ اردو ادب کے شاہکاروں میں ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

محسنؔ نے اپنی تشبیب میں بہاریہ منظر کو مستقل طور پر مجسم کر دیا ہے اور یہ وہی ماحول ہے جہاں سے میرزا محمد رفیع سوداؔ جیسے قادر الکلام قصیدہ نگار نے یوں راہِ گریز اختیار کی تھی۔

تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفیؔ
آتش از فیض ہوا سبز شود در منقل

اب اسی زمین میں غنیؔ کے اشہب قلم کی جولانیاں ملاحظہ فرمائیے۔ محسنؔ کے جواب میں غنیؔ بھی تشبیب کے ابتدائی حصے میں کاشی کی برشگالی فضاؤں کا نقشہ پیش کرتے ہیں لیکن اس زور شور سے کہ پڑھنے والا خود کو بھیگتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

کر کے اشنان جو کاشی سے اٹھا ہے بادل
زلفِ شبگوں سے ٹپکتا ہے ابھی گنگا جل

کوئی قطرہ بھی زمیں تک جو پہنچ جاتا ہے
بڑھ کے دریا کی روانی سے وہ کہتا ہے کہ چل

جس طرف دیکھیے اک بحر نظر آتا ہے
اس تراوش سے نہ چھوٹا کوئی صحرا نہ جبل

جس کا جی چاہے جہاں کر لے وہ گنگا اشنان
ساری دنیا میں یہ لبریز بھرے ہیں جل تھل

چند قطروں میں تو یہ حال ہوا عالم کا
اے صبا کیا ہو جو بال اپنے نچوڑے بادل

دیکھ کر ابر سیہ شور یہ گوکل میں اٹھا
وہ چلے آتے ہیں پربت سے کنھیا پیدل

نہیں تھمتا نہیں تھمتا نہیں تھمتا پانی
نہیں کھلتا نہیں کھلتا نہیں کھلتا بادل

ایک حالت پہ کئی روز سے ہے رنگ جہاں
پاؤں تک ہوگئے ہیں ابلق ایام کے شل
ابر تیرہ نے چڑھائی وہ اندھیری منہ پر
شوخیاں بھول گئیں گم ہوئی ساری چھل بل
صورتِ اسپِ گِلی ہل نہیں سکتا در سے
اس کی کیا تاب جو آگے وہ بڑھے چار اَنگل
اس اندھیرے میں کہیں پاؤں بڑھا سکتا ہے
نہ کہے ابلقِ ایام کو کوئی اڑیل
کوئی طوفان بلاخیز ہے یہ تاریکی
بجھ گئی برق جہاں لائی جلا کر مشعل
آگیا ابر میں خورشید تو چیخ اٹھا رعد
مست اڑا لے گئے دامن میں چھپا کر بوتل
پھوٹ کر پھیلی ہے حرفوں میں سیاہی ایسی
ہوگئی منشی گردوں کی عبارت مہمل

ابر گہر بار کی اس تراوش کے بعد اسی قصیدے میں اب بہار کا جوش نمود دیکھیے۔

ہاں مگر ہوگئی سر سبز زمینِ گلزار
تا بہ تہہ فیض طراوت نے کیا اپنا عمل
جم گئے پشت پہ ماہی کے سم گاؤ زمیں
دفعۃً کاسۂ سر توڑ کے شاخ آئی نکل

اور وہ شاخ کہ ہے جس کا شگوفہ گیتی
اور وہ گیتی جو ہے مزرعِ اربابِ عمل
اور وہ مزرعِ ارباب عمل ہے کہ جہاں
تخم ریزی جو کرے آج تو پھل پائے کل
کل بھی کہتے ہیں اک جوش نمو کی توہین
اس قدر جلد یہاں ملتا ہے ہر شے کا بدل
تخم ریزی کوئی اک ہاتھ سے کرتا جائے
دوسرے ہاتھ سے چنتا وہ چلا آئے پھل
اس قدر جوش نمو ہم نے نہ دیکھا نہ سُنا
دانۂ قطرۂ شبنم جو گرا منہ کے بل
ملتے ہی خاک میں پیدا ہوئی شاخ دریا
جو گئے بحرِ رواں فیض سے جس کے جنگل
اس میں وہ جوشِ روانی وہ خروشِ امواج
گونج اٹھا شور تلاطم سے ہر اک دشت وجبل
اور موجوں کے تھپیڑے جو پہاڑوں میں لگے
سنگ سے سنگ لڑے یوں کہ شرر آئے نکل......الخ

غنیؔ نے بہت سے قصیدے کہے لیکن درج بالا قصیدہ یقیناً ان کا شاہکار ہے۔ تنہا اسی قصیدے کی بنا پر انھیں ایک ممتاز قصیدہ نگار تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس قصیدے میں مناجات اور غزل بھی شامل ہے۔ کل ملا کر اس میں ۱۲۷ اشعر ہیں۔

بیتاب بنارسی

بنارس کے منشی عبدالرزاق بیتاب کی شخصیت اور شاعری آگرہ کے نظیر اکبرآبادی کی شخصیت اور شاعری سے اس قدر مشابہت رکھتی ہے کہ اگر میں حلول یا تناسخ الارواح کا قایل ہوتا تو فوراً یہ مان لیتا کہ نظیر اکبرآبادی نے اپنے انتقال کے لگ بھگ تیس بتیس سال بعد ۱۸۶۰-۶۳ء میں جب دوبارہ جنم لیا تو اپنا نام بیتاب بنارسی تجویز فرمایا اور ازسرِ نو اسی انداز اور اسی خوش مشربی سے اپنے ہم نشین بانوا فقیروں کے اکھاڑوں میں چیت بدی کے میلوں ٹھیلوں اور برسات کی بہاروں میں زندگی کے تقریباً پچاسی سال اور لوگوں کی آنکھ کی پتلی بنکر گذار دیے۔ نظیر آگرہ میں تھے اور بیتاب بنارس میں۔ لیکن دونوں کا نظریۂ حیات، مسلک، فقیرانہ مزاج اور شاعری کا ماحول، اس لیے بھی حیرت انگیزی طور پر یکسانیت رکھتا ہے کہ دونوں بزرگ ایک ہی سلسلہ کے فقیر تھے۔ وہ سلسلہ تھا ان فقیروں کا جو اپنے آپ کو بانوا کہتے تھے اور تجرد میں عنقا اور آزادروی میں ہوا کا جھونکا تھے۔ ہندو مسلم اتحاد اور خالص ہندوستانی ماحول و روایات کی تشکیل و تکمیل میں یہ سلسلہ ایک زبردست قومی تحریک تھا۔ چنانچہ فرقہ واری کے وحشت ناک صحراؤں میں کدورت کے غبار کی وجہ سے جب بہت کم چہرے صاف دکھائی دیتے تو اس نازک دور میں بانوا فقیروں کے یہ اکھاڑے ایسے ہرے بھرے نخلستانوں کا منظر پیش کرتے جہاں ایک طرف نعتیہ انداز میں نغمہ سرائی ہوتی تھی اور دوسری طرف کرشن لیلا کے گیت سنے سنائے جاتے تھے۔

وطن دوستی اور قومی مسائل پر خمسے پڑھے جاتے تھے۔ کنجوسوں اور سرمایہ داروں کی ہجو میں طنز و ظرافت کے گلزار کھلائے جاتے تھے۔ عبیر و گلال اُڑا اُڑا کر ہندو مسلم کو ایک ہی رنگ میں رنگا جاتا تھا۔ تہوار اور بدلتے ہوئے موسم کے اعزاز میں ساز و آواز کا سہارا لے کر زندگی اور اس کے حُسن سے استفادہ کرنے کا پیغام دیا جاتا تھا۔ نظیر اکبر آبادی اور بیتابؔ بنارسی کی شاعری اسی ماحول کی پیداوار ہے۔ فرق یہ ہے کہ نظیر اس ماحول کے موجدوں میں سے تھے اور بیتابؔ مقلدوں میں سے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ خواص کی اکثریت نے دونوں بزرگوں کی عوامی شاعری کو چنداں اہمیت نہیں دی اور انھیں اپنے ماحول کی ترجمانی کے جُرم میں ہلکے پھلکے تک بندوں سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا۔

شیخ عبداللہ نے اپنے بیٹے منشی عبدالرزاقؔ کو جو کچھ بھی بنانا چاہا ہو اُس سے بحث نہیں، خود وہ کیا بنے اور کیا بننا چاہا اس کی تفصیل خود ان کی زندگی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ عبدالرزاق نے بیتابؔ بنارسی کے روپ میں اپنا کلام مرزا فائزؔ کو دکھایا۔ استاد پرستی ان کی رگ رگ میں تھی لیکن فائزؔ کے شاگردوں میں وہ ایک بالکل مختلف چیز تھے۔ شعر و شاعری ان کو جننا نہیں تھی زندگی خود ان کے منہ سے بولتی تھی اسی لیے جو لفظ جس جذبے کا ترجمان ہو کر لب تک آیا اسی انداز میں سننے والوں کے کانوں میں اتر گیا۔ بیتابؔ نے لفظوں کی اس آزادی کا ہمیشہ احترام کیا اور شاید ضرورت سے زیادہ احترام کیا۔ وہ ہر محفل میں ہر دربار میں بلائے جاتے تھے۔ لوگ ان کی گل افشانیوں کے منتظر رہتے تھے اور بڑھ چڑھ کر فرمائشیں کرتے تھے۔ منشی جی قلم برداشتہ سب کو خوش کرتے تھے اور اکثر یہ بات بھول جاتے تھے کہ یہ باتیں منہ سے نکال کر کاغذ پر بھی اتاری جائیں گی۔ اسی چیز نے ان کے کلام میں ناہمواری اور اس ناہمواری نے حریفوں کو ناہموار باتیں اچھالنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس خصوصیت میں بھی وہ ان کے ہم آواز ہیں۔

منشی بیتابؔ فقیر گر تھے جب تک اکھاڑے کا فقیر ان کے ہاتھ سے اپنے ماتھے پر 'الفا' نہیں کھنچوا لیتا تھا اکھاڑے میں داخل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن وہ خود راجپوتی کر آن بان سے جلوہ گر ہوتے تھے۔ کھلا پاجامہ، چست شیروانی، داڑھی اوپر کو چڑھی ہوئی، مونچھیں کشیدہ، فرقِ مبارک پر راجپوتی اسٹائل کی نستعلیق دستار فضیلت اور آنکھوں پر چشمہ، ان کے وقار کے بانکپن اور وضع داری کے اجزائے ترکیبی تھے۔ عمر بھر بچوں کے جھمیلے سے آزاد رہے۔ اپنے حجرے کو بھی اپنی طرح آزاد چھوڑ رکھا تھا۔ ساز و سامان سے دوری، کنڈی کواڑ سے بے فکر گھر سے باہر نکلتے تو یاران طریقت اور شاگردان بے مہاوت بے روک ٹوک آدھمکتے۔ اسی چھینا جھپٹی میں منشی جی کا عزیز ترین سرمایۂ حیات یعنی ان کی تصنیفات و تالیفات بھی دست بدست غائب ہو گئیں۔ ایک شاگرد نے ان کا کچھ کلام ان کی حیات ہی میں اپنے نام سے چھپوا دیا۔ ایک دوسرے صاحب استاد کی بیاض لے اڑے۔ لیکن خود ان کا طائر روح بھی بہت جلد قفس عناصر سے پرواز کر گیا۔ یہ شخص بہار کا رہنے والا تھا۔ منشی جی کی ضخیم بیاض کا کیا حشر ہوا یہ خدا جانے، منشی جی کی ذہانت اور ظرافت کا ایک زمانہ قایل تھا۔ ان کے دوست میں دشمن سبھی اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ منشی بیتابؔ منصف مزاجی میں دور دور تک اپنا جواب نہیں رکھتے۔ خاندانی دشمنیوں میں اُنھیں ثالث کے فرائض انجام دینے پڑتے تھے اور اکثر ان کے فیصلے کو دونوں فریق خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے تھے۔ کبھی کبھی مذہبی مناظروں میں بھی ان کو گھسیٹ لیا جاتا تھا لیکن اس ماحول میں بھی منشی جی اپنی ظرافت طبعی سے کام لے کر ایک ہی جملے میں حریف کو لاجواب کر دیتے تھے۔ دل آزاری سے تنفر کے سبب اور خاص و عام سے صلح و آشتی کے خیال سے بیتابؔ ایسے ماحول سے گریزاں رہتے تھے۔ اس فن میں ان کے استاد بھائی آغا حشرؔ کاشمیری کو البتہ کمال حاصل تھا۔ شروع شروع میں ان مناظروں میں امتیازی حصہ لینے کے سبب حشرؔ کی بڑی شہرت تھی۔

منشی بیتابؔ کی وسیع المشربی کے باعث بنارس اوراس کے گردونواح کے علاقوں میں ان کے شاگردوں اور مداحوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی لیکن متعصب حلقوں میں ان کے بارے میں عجیب وغریب باتیں مشہور تھیں ۔ کچھ مذہبی مریض ان کو دہریہ کہتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ منشی بیتاب چونکہ مشرع وضع قطع نہیں رکھتے اس لیے انھیں شریعت سے دور کا واسطہ بھی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ منشی جی اپنی وسیع النظری کے سبب اس عالمی مذہب کے ماننے والوں میں سے تھے جس کو جدید دور میں انسان دوستی کا نام دیا گیا ہے۔ مسلمانوں سے زیادہ ہندو اور ہندوؤں سے زیادہ مسلمان انھیں عزیز تھے۔ بنکروں سے لے کر مہاجنوں تک اور ارباب نشاط سے لے کر بڑے بڑے کوٹھیوں والے سرمایہ داروں تک ان کے پرستار تھے اور اس ہردل عزیزی کا سبب ان کا وہ مثال کردار تھا جو ان کے فقیرانہ مزاج کا دین تھا۔

منشی بیتابؔ اپنے آپ کو بانوا فقیر کہتے تھے اور اپنی بانوائی کا سلسلہ حضرت نظیر اکبرآبادی سے ملایا کرتے تھے۔ نظیر اکبرآبادی کا ایک مشہور فوٹو ہے جس میں وہ ایک مخصوص فقیرانہ لباس میں نظر آتے ہیں۔ اس تصویر میں ان کے سر پر ایک تاج ہے۔ گلے میں کنٹھا بدن پر چیتے کی کھال ایک ہاتھ میں کشکول کی قسم کا ایک کاسہ اور دوسرے ہاتھ میں ایک لمبی سی چھڑی ہے۔ یہ حلیہ ایک بانوا فقیر کا ہے اور طریق بانوائی میں اس لباس کے مختلف اجزا کی اہمیت بڑے فلسفیانہ انداز میں بیان کی جاتی ہے۔ یہ تو وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت نظیر اکبرآبادی اس سلسلے کے موجد واحد تھے یا نہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اس کو فروغ دینے میں بڑی مدد کی ہے۔ خود ان کی زندگی ہی میں ان کے نقش قدم پر چلنے والے بہت سے نامور شاگرد مختلف شہروں میں موجود تھے جنھوں نے اپنے اپنے حلقوں میں ان فقیرانہ خیالات ونظریات کی تبلیغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بنارس میں ان کے ایک ممتاز شاگرد ماتیؔ نے بانوا فقیر کا مرتبہ

حاصل کرلیا تھا اور محلّہ شوالہ میں اپنا اکھاڑہ قائم کرر کھا تھا۔ مآئی کے شاگردوں میں ڈومن اور دو بھائی لال محمد اور شاہ محمد تھے جنھوں نے استاد کی روایات کو آگے بڑھانے میں بہت سے کارنامے انجام دیے تھے۔ منشی بیتابؔ اسی سلسلے کے بانوافقیر تھے اور رفتہ رفتہ انھیں اس حلقے میں مرشد کا مقام حاصل ہوگیا تھا۔ منشی صاحب کے ایک ممتاز شاگرد گورو پرشاد نے ایک خمسہ میں اس کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

تکیہ میرا شوالہ ہے سن لے پتا مرا
مآئی ہے نام خاص میرے دادا پیر کا
مرشد ہیں میرے حضرت بیتابؔ با صفا
سب حال و قال مجھ کو انھوں نے کیا عطا
قائل نہیں ہوں میں کسی پیرو فقیر کا

بانوافقیروں کے اکھاڑے میں بلاامتیازِ مذہب و ملت ہر آدمی شریک ہوسکتا تھا۔ ان اکھاڑوں کا آغاز آگرہ میں ہوا لیکن لکھنؤ اور بنارس میں بھی ان کا بہت رواج ہو چلا تھا۔ لکھنؤ میں ایک بانوافقیر پناروؔ کی بڑی شہرت تھی۔ بنارس میں منشی بیتابؔ کا اکھاڑہ بڑی دھوم دھام کا حامل تھا۔ یہ اکھاڑے خاص طور پر ہولیوں میں منعقد ہوتے تھے۔ ساون یا دوسرے تہواروں پر بھی رئیس لوگ منشی جی کو اکھاڑے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ ایک اکھاڑے میں عام طور پر ایک ہی بانوافقیر موجود ہوتا تھا۔ اکھاڑے کے پٹھے بڑی محنت سے خمسے اور مسدس حفظ کر کے شامل ہوتے تھے۔ بنارس میں یہ منظومات پیش کرنا منشی بیتابؔ ہی کا حصہ تھا۔ شروع میں نعت، بسم اللہ، اوم اور کرشن لیلا وغیرہ پڑھی جاتی تھیں۔ بعد ازاں سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ ان کا موضوع طریق بانوائی اس کے نظریات، مختلف اجزائے لباس کی اہمیت، جدید سیاسی اور سماجی

مسائل، وطن دوستی، حکومت برطانیہ کے خلاف شکایات وغیرہ ہوتا تھا۔ طریقِ بانوائی کی وضاحت منشی بیتاؔب کے ایک جوابی خمسہ میں یوں بیان کی گئی ہے۔

عجب طریق ہے دنیا میں بانوائی کا
کہ اک لباس دکھاتا ہے بھائی بھائی کا
اصول دیکھو ذرا اس کی پارسائی کا
نرالا ڈھنگ ہے اس کوچے کی گدائی کا
بجائے اوم کے پڑھنا بجا ہے بسم اللہ

بانوافقیر پیشانی پر کاجل سے ''الف'' کھینچتے تھے جس کو الفا کہتے تھے۔ پشت پر چیتے کی کھال کے ساتھ کفنی، گلے میں مالا، صدری کی طرح الفی، سر پر تاج، کان کے قریب لٹکتے ہوئے ڈورے جن کو رسید کیا جاتا تھا۔ ایک ہاتھ میں کشکول جس کو ''کشتہ'' کہتے تھے اور دوسرے ہاتھ میں چھڑی رکھتے تھے۔ تن پر لنگوٹ کے علاوہ تہبند اور کمر میں تسمہ بندھا رہتا تھا۔ لباس میں کل ملا کر، ۱۷ یا ۱۸ اجزا بنتے تھے۔ ایک دوسرے سے سوال جواب کے وقت ان سب چیزوں کی اہمیت پر بحث ہوتی تھی۔ سوالات اور ان کے جوابات خمسے کی صورت میں پیش کیے جاتے تھے۔ منشی بیتاؔب کے مختلف خمسے ''تاج''، ''کفنی''، فقیر کے ہاتھ میں رہنے والی ''سورج مکھی''، ''چھڑی''، ''چیتے کی کھال''، وغیرہ کی اہمیت پر لکھے گئے ہیں۔ اس قسم کے خمسے جس انداز میں لکھے جاتے تھے اس کا اندازہ بیتاؔب کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہوگا۔ جو ان کے ایک طویل خمسہ سے لیے گئے ہیں۔ ''فقیر'' کے بارے میں فرماتے ہیں۔

کب عالمِ فنا میں ہے عالم فقیر کا
روح القدس ازل سے ہے ہمدم فقیر کا

چوبِ کلیم ہے یہ عصا ہم فقیر کا
عیسیٰ کے قم سے حکم نہیں کم فقیر کا
ارنِی پکارتا ہے سدا دم فقیر کا

دنیا کا رشتہ ناتا گیا ایک دم سے ٹوٹ
ملنے سے خود خدا میں گئی خود نمائی چھوٹ
اے بابا الحق کا بھی کہنا نہیں ہے جھوٹ
شوخی بھری ہے اس میں دو عالم کی کوٹ کوٹ
اللہ نے کیا ہے وہ عالم فقیر کا

مہلت نہیں ٹھہرنے کی ہے ایک دم میاں
جانا ہے مجھ کو دور بہت وقت کم میاں
اپنا نہیں ہے کوئی خدا کی قسم میاں
سب جھوٹ ہے کہ تم کو ہمارا ہے غم میاں
بابا کسے خدا کے سوا غم فقیر کا

کوئی نہیں کسی کا خدا کے سوا کبھی
اللہ اب کسی کی محبت نہیں رہی
مرجائے پہلے مرنے سے فرماتے ہیں نبیؐ
ہم کیوں نہ اپنے آپ کو رو لیویں جیتے جی
اے دوست کون پھر کرے ماتم فقیر کا

دنیا ہمارے واسطے ہر وقت ہے قفس
بیتاب کیا کرے نہیں چلتا ہے کوئی بس
ہم کو گداگری کی نہیں اب کوئی ہوس
منزل جو پیش رہتی ہے اے بابا ہر نفس

کوئی بجز خدا نہیں محرم فقیر کا

بانوا فقیر کے ہاتھ میں ''سورج مکھی'' کا نشان رہتا تھا جو فتحمندی اور کامرانی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اکھاڑے میں سوال و جواب کے وقت اس سورج مکھی کے وقار اور تحفظ کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ کبھی کبھار دوسرے شہروں سے بانوا فقیر آجاتے تو اکھاڑہ خوب ٹھسے سے جمتا۔ مقامی لوگوں سے مسلسل سوال و جواب کے بعد اگر بیرونی فقیر ہار جاتا تو اپنا فقیرانہ لباس اور سورج مکھی انھی کے حوالے کر دیتا اور اگر جیت جاتا تو سورج مکھی لے کر جاتا۔ منشی بیتاب کے ہونہار شاگرد گورو پرشاد اس قسم کے مناظروں میں ہمیشہ غالب رہتے اور اس کا سبب استاد کی مشفقانہ سرپرستی تھی۔ ہر موقع ہر محل کے خمسے شاگردوں میں پہلے سے تقسیم ہو جاتے تھے۔ اگر مخالف شخص فقیر کی کفنی کے لزوم کے بارے میں استفسار کرے تو جواب دے کر فوراً چیتے کی کھال سے متعلق منظوم سوال پیش کر دیا جائے۔ اگر فقیر کے کشکول کا مسئلہ درمیان میں آئے تو پہلو بچا کر کس طرح حریف سے مشکل تر استفسار کیا جا سکتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ان فقیرانہ سرگرمیوں کے علاوہ منشی جی سیاسی مسائل میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ ڈاکٹر بھگوان داس، شیو پرشاد، ڈاکٹر عبدالکریم اور ڈاکٹر شکور کے جمہوری نظریات سے وہ اتفاق رکھتے تھے اور مسلم قوم کو ہندوستانیوں سے الگ سمجھنے کا تصور ان کے نزدیک لغو تھا۔ حکومت برطانیہ کے وہ بڑے سخت مخالف اور نکتہ چیں تھے۔ منشی جی نے اپنی اس مخالفت کا عملی ثبوت بھی بارہا بہم

پہنچایا۔ ہولیوں میں ان کا اکھاڑہ اُٹھتا تو وہ ہزاروں کے اجتماع میں اپنی قومی نظم سنانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے۔ جلیانوالہ باغ کے واقعات ان کے ذہن میں جم کر رہ گئے۔ تھے اپنی نظموں میں انھوں نے اس ظلم وستم کے خلاف احتجاج بلند کیا۔ ترک موالات تحریک میں وہ پوری قوم کے ترجمان بنے، گاندھی جی کے نظریات ان کے نزدیک صداقت پر مبنی تھے۔ ان کے اس قسم کے خیالات اور جذبات ان کے بیشتر خمسوں میں منتشر ہیں جو اس وقت میرے سامنے کرم خوردہ بیاضوں اور بوسیدہ کاغذ کے ٹکڑوں کی صورت میں موجود ہیں۔ انھی میں ان کا کتابچہ ’’پیغام راحت‘‘ کے عنوان سے مطبوعہ صورت میں (لیکن نہایت خستہ حالت میں) میرے پیش نظر ہے جوان کے شاگرد حامد حسین عرف بابو کے نام سے چھپا تھا۔ یہ ’’پیغام راحت‘‘ کا حصہ اول ہے اسی کی پشت پر حصہ دوم کی اشاعت کا اعلان کیا گیا ہے۔ لیکن شاید دوسرا حصہ شایع کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ حصہ اول ناگری رسم الخط میں چھاپا گیا ہے اور اس پر بکرمی سمت ۱۹۷۷ درج ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اسے پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد یعنی ۲۱-۱۹۲۰ء میں شایع کیا گیا ہے۔ پہلے مسدس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

ہوتی اے ہند وہ اگلی سی جو ہمت تیری
بے کسی دیکھتی یوں آج نہ صورت تیری
خوب معلوم ہے دنیا کو حقیقت تیری
کس سے مل کر لٹی جاتی ہے یہ دولت تیری
پھر بھی کچھ دھیان نہیں ہے تجھے بربادی کا
نام دنیا سے مٹا ہے تیری آزادی کا
طوق گردن سے غلامی کا اتارو للّٰہ
چھوڑ دو بیٹھنا اٹھنا بھی اب اس کے ہمراہ

اس سے ملت نہیں اچھی جو ہے اپنا بدخواہ
کرلو اب ترک موالات کہ وہ ہے گمراہ

چاہیے قابو میں انسان کو بس دل کرنا
کچھ بھی مشکل نہیں آزادی کو حاصل کرنا

ترک موالات کی اس ترغیب کے بعد گذشتہ عظمت ہند کو یاد دلا کر اپنے گھر کی حفاظت ایک دوسرے سے برادرانہ تعلقات اور راہ آزادی پر گامزن ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔

یہ کوئی بات نہیں دوستو ہرگز ڈر کی — فرض ہر قوم کا ہے کرنا حفاظت گھر کی
گو ضرورت بھی بڑی اس میں سے مال و زر کی — خیر ہو یا نہ ہو اس کام میں اپنے سر کی

اب زمانے کی بُرائی کو مٹانا ہے ضرور
بات بگڑی ہوئی مدت کی بنانا ہے ضرور

اگلے بھارت کے سپوتوں میں لکھانا ہے نام — رہنا ہم چاہتے دنیا میں نہیں بن کے غلام
اپنے بھائی کو بھی سمجھانا ہمارا ہے کام — جو کہ کرتے ہیں خوشامد میں غلامی بے دام

ان کے صدقے میں غلامی ہوئی حاصل ہم کو
جو پہنچنے نہیں دیتی سرِ منزل ہم کو

اب سرکار والا تبار پر براہ راست حملہ ملاحظہ فرمائیے، طنزیہ انداز میں کہتے ہیں۔

ظلم ڈائر کو جو دکھلاؤں تو باغی ہوں میں
اپنے بچوں کو جو سمجھاؤں تو باغی ہوں میں
راستہ سیدھا جو بتلاؤں تو باغی ہوں میں
اپنے بھائی سے جو مل جاؤں تو باغی ہوں میں

خوب انصاف ہے ان کا جو بڑے عادل ہیں
وہ یہ سمجھے ہیں حکومت کے ہمیں قابل ہیں
تھی گورنمنٹ ہماری تو نہایت عادل
پر تعجب ہے کیوں پاس ہوا رالٹ بل
ہائے کس طرح سے ناشاد نہ ہو میرا دل
کیا خطا تھی کہ جو پنجاب ہوا یوں گھایل
مرنا ان بھائیوں کا جب مجھے یاد آتا ہے
اک اندھیرا سا مری آنکھوں میں چھا جاتا ہے

مسدس کے آخر میں امداد باہمی، عدم تشدد اور دیسی مال بنانے کی باتیں کرتے ہیں۔

جو وطن پر ہیں فدا دوستو ایمان کے ساتھ
ساتھ میں ان کے ہوں اور وہ ہیں مری جان کے ساتھ
میں نہیں چاہتا آزادی کو نقصان کے ساتھ
ظلم کرنا نہیں اچھا کسی انسان کے ساتھ
کیوں یہ کہتے ہو کسی سے میری امداد کرو
تم کو جس شے کی ضرورت ہو خود ایجاد کرو
جو زمانے نے پڑھایا ہے سبق یاد کرو
اپنا گھر اپنے ہی ہاتھوں سے نہ برباد کرو
یہ تو سچ کہتے ہو بیتابؔ وطن اپنا ہے
جس نے برباد کیا ہے وہ چلن اپنا ہے

دوسری نظم خمسہ ہے اور اس کا ماحول بھی مذکورہ مسدس کا سا ہے۔ غیر ملکی حکومت کے خلاف قومی تحریک اب پوری طرح بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ مجاہدان آزادی کی نمائندگی کرتے ہوئے منشی بیتابؔ نے سیدھی سادی ہندوستانی میں اس مخمس کا آغاز یوں کیا ہے۔

جیل لے جانے کو لے جائے حکومت اپنی
ہم سمجھتے ہیں وہاں بھی ہے ضرورت اپنی
پاس گو کچھ نہیں، ہے پاس تو ہمت اپنی
ہم اسہوگ[1] سے دکھلائیں گے جرأت اپنی
توپ بندوق سے بڑھ کر ہے یہ طاقت اپنی
کرنا لازم ہے سودیشی کا ہمیں کل ویوہار
کیوں کہ ہر چیز یہاں ہونے لگی ہے تیار
اپنے ہاتھوں کی بنی چیز ہمیں ہے درکار
ہم نہیں چاہتے اب کرنا ولایتی بیوپار
اب دکھانا ہے ہمیں صنعت وحرفت اپنی

بدیسی حکومت کے خلاف سب سے بڑا حربہ یہ تھا کہ اس کے نظم ونسق کا بائیکاٹ کیا جائے۔ عدم تعاون کا یہ جذبہ منشی جی کے قلم سے یوں جنم لیتا ہے۔

جانا ہے ان کی کچہری میں تباہی کی دلیل
ہو چکے لڑ کے ہم آپس میں بہت خوار و ذلیل
چار پنچوں میں کرو اپنے مقدمے کی سبیل
اپنے حاکم بھی چلے آئیں گے اور اپنے وکیل

---

[1] اسہوگ: عدم تعاون تحریک کی طرف اشارہ ہے۔

روز کا جھگڑا چکا دے گی عدالت اپنی
ہاتھ سے کپڑا بنو اور بنا کر دیکھو
اگلی تعلیم بھی بچوں کو دِلا کر دیکھو
فائدہ صنعت حرفت کا اٹھا کر دیکھو
گاندھی جی کہتے ہیں چرخے کو چلا کر دیکھو
آپ سے آپ بدل جائے گی حالت اپنی

سوراج کے حصول کے لیے مسلسل کوشش کی ضرورت ہے لیکن اس تحریک میں قانون کی پابندی ضروری ہے۔

ہے مثل وقت پہ موقوف ہے اپنے ہر شے
تم سوراج کی کوشش میں رہو پے در پے
دل سے بس کہتے رہو دوستو بھارت کی جے
خوف کچھ بھی نہیں اپنا تو خدا حافظ ہے
وہی کرتا ہے کرے گا بھی حفاظت اپنی
ہے سوراج جو لینا تو یہی کام کریں
کام وہ یہ ہیں کہ سب چیز ولایتی چھوڑیں
بھائی کی طرح بہم ہندو مسلمان ملیں
ہے مناسب ہمیں قانون کے پابند رہیں
تا کہ دنیا میں کہیں ہو نہ شکایت اپنی

کتابچے کے آخیر میں ایک نظم ''چرخے'' کی تعریف میں ہے جو گاندھی جی کے نظریات کی تائید میں یوں شروع ہوتی ہے۔

ہے اسہیوگ کی تلوار کا جو ہر چرخہ
ہم سوراج کو بس لیں گے چلا کر چرخہ
اب تو بھارت میں چلے گا یہ برابر چرخہ
ہم غریبوں کو بنادے گا تو نگر چرخہ
یہ مناسب ہے چلے دوستو گھر گھر چرخہ
توپ بندوق سے دنیا میں ہے بہتر چرخہ

منشی بیتابؔ کے ان اشعار میں قومی تحریک میں شامل ایک ایسے وطن پرست ہندوستانی کے جذبات کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو ملک کے رہنماؤں کی آواز پر لبیک کہتا ہوا غیر ملکی حکومت سے براہ راست ٹکر لینے کے لیے سینہ سپر ہے۔ ان کا سیاسی اور سماجی شعور اپنے معاصرین کے مقابلے میں اس لیے بھی پختہ نظر آتا ہے کہ انھوں نے سب کو ساتھ لے کے چلنے کا جمہوری نظریہ اپنے سامنے رکھا ہے۔ مذہب وملت کے امتیازات سے بالاتر ہو کر سوچنے کا یہ انداز بیتابؔ کے ان منظوم اقتباسات میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان اشعار کی زبان سے بھی یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ یہ نظمیں عوام کو خطاب کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ فارسی اور عربی تراکیب کا یہاں گزر نہیں بلکہ عام فہم ہندی الفاظ کا استعمال جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ عدم تعاون کی جگہ ''اسہیوگ'' اور آزادی کی بجائے ''سوراج'' کے الفاظ ملتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ منشی بیتابؔ فن کو مقصدیت کے لیے استعمال کرنے کے اس گُر سے بخوبی واقف تھے جس کو آج کسی ملک کے زندہ ادب کا بنیادی اصول مانا جا رہا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں صنعت گری کو بھی

چھٹی دے رکھی ہے۔ ان کی تمام تر کوشش یہی دکھائی دیتی ہے کہ جو موضوع زیر بحث ہے اس کو سیدھے سادے الفاظ میں منظوم کر دیا جائے اس انداز میں کہ حقیقت نگاری کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے اور اُن سے سامعین بھی پورے طور پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں۔ یہاں ایک بات اور جو قاری کے ذہن کو ستایش و تحسین پر آمادہ کرتی ہے ان منظومات کا دلیرانہ لب ولہجہ ہے۔ جس ماحول میں ان کو لکھنے کا خیال شاعر کے ذہن میں پیدا ہوا ہوگا وہ آج کے ماحول سے بہت کچھ مختلف ہوگا۔ انگریز پرستی کے دور میں ایسے خیالات کے اظہار کا کیا نتیجہ ہوتا تھا اس کو ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ بیتابؔ کو بھی اس سلسلے میں بخشا نہیں گیا۔ جب وہ قومی نظمیں سُنانے کی کوشش کرتے انھیں محتاط رہنے کی بار بار تنبیہ کی جاتی۔ انھیں اس جرم میں جیل کی ہوا بھی کھانا پڑی لیکن اپنی خودداری کے پیش نظر وہ ٹوٹنے پر تو تیار تھے لچک نہیں سکتے تھے۔ اس گیر و دار میں ان کا اکھاڑہ بھی بند ہوا۔ مذہب کے ٹھیکیداروں کی مدد سے ساری برادری کو ان کے خلاف اکسایا گیا لیکن بیتابؔ ایسی مٹی کے بنے تھے کہ ٹس سے مس نہ ہوئے ان کے فقیرانہ مزاج نے انھیں ہر قسم کی مصلحت سے بے نیاز کر رکھا تھا۔

منشی بیتابؔ موجد تھے اور ان کا کیش ترک رسوم تھا۔ غالبؔ کی طرح ملّتیں مٹ کر ان کے لیے اجزائے ایمان بن چکی تھیں۔ وہ ایک ایسے بادہ فروش تھے جو کسی عارف کامل کی رہنمائی کے بغیر سر خدا سے واقف ہو جائے اور پھر تمام خراباتیوں کو اس راز سے باخبر کر دے۔ ان کا عارفانہ مزاج حیات و کائنات کی وسعتوں کو نغمات توحید سے معمور پاتا تھا اور وہ خود بھی اسی کیفیت کی ترجمانی میں محو ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر بھگوان داس کو انھوں نے اس موضوع پر جو نظم لکھ کر دی تھی اس میں یہی کیفیت موجزن ہے۔ اپنی گنگا جمنی زبان میں فرماتے ہیں:-

منتری کوئی ہے اس کا نہ سبھا کرتا ہے　　وہ الکھ[1] روپ میں ہے سب کو لکھا[2] کرتا ہے

---

[1] الکھ روپ میں ہے = یعنی نظر نہیں آتا۔

[2] لکھا کرتا ہے = چھپ کے دیکھتا ہے۔

جل میں تھل میں وہی سُدھ سب کی لیا کرتا ہے   بے کہے پنچھی پکھیرو کی سنا کرتا ہے
جو شکر کھاتا ہے اس کو وہ شکر دیتا ہے
موتی کھاتا ہے منہ موتی سے بھر دیتا ہے

اس نے کیا کیا کیے بے تھاہ سمندر پیدا   لیکن اس پانی سے ہوتے نہیں گوہر پیدا
''موتیابند'' کرے آنکھ کے اندر پیدا   دیکھتے دیکھتے پانی میں ہو پتھر پیدا
آس بے آس کی مظلوم کی ڈھارس ہو جائے
آنکھ رونے سے جو پتھرائے تو پارس ہو جائے

وستر بے وستر کا محتاج کا دینے والا   راجہ مہاراجہ کا محتاج کا دینے والا
بیوہ اور کنواری کو سرتاج کا دینے والا   ہے وہی لاج پتی لاج کا دینے والا
چیونٹی کو پر دے پکھیرو کو وہ بے پنکھ کرے
ایک کوڑی سے جو چاہے تو کئی سنکھ کرے

ڈانواڈول پھرا کرتے ہیں مورکھ نادان   سب کا ان داتا ہے وہ لوگ ہیں ناحق میلان
مکڑی جالے میں رہا کرتی ہے بااطمینان   سب کو روزی وہ دیا کرتا ہے بے سان وگمان
مکھی کیوں اڑ کے نہ خود جالے کے اندر پہنچے
پر لگا دیتا ہے روزی کو کہ اڑ کر پہنچے

بیتابؔ اپنے وطن بنارس کے سنتوں سادھوؤں کی طرح آزاد اور سیلانی تھے۔ دیر و حرم کی کشمکش سے بے نیاز انھوں نے صبح بنارس کے روح پرور ماحول سے اپنی روحانی طہارت کا سامان فراہم کر لیا تھا۔ کبیر اور تلسی سے ہم خیال ہو کر انھوں نے بھی گھاٹ پر پڑے ہوئے پتھروں کے تقدس اور گنگا کے خوشگوار پانی کی لطافت محسوس کی ہے۔ گنگا کے گھاٹ پر وہ ایک

خالص ہندوستانی کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں جو روحانی تسکین کی تلاش میں ہے۔

کاشی کاشی ہے نہیں ایسا کوئی دیس نگر ہے یہاں مورتی پتھر کی الکھ روپیشور[۱]
اسّی [۲] سنگم بھی ہے بے کنٹھ بھی پنچ گنگا بھی پورا ہوتا ہے یہیں آواگون کا چکّر
تڑکے سورج کی کرن بڑھتی ہے دھیرے دھیرے لہر گنگا کی بنی جاتی ہے سونے کی ڈھر [۳]
دور سے دیکھنے والے یہی کہہ دیتے ہیں گنگا جی اوڑھ کے نکلی ہیں سنہری چادر
کوئی چندن ہے رگڑتا کوئی کرتا ہے پاٹھ گھاٹیے گھاٹ پہ بیٹھے ہیں لگا کر چھپر
چاندنی رات میں لیلا ہے یہ گنگا جی کی چاند ہی دیکھیے گا پانی کے نیچے اوپر
گھاٹ پکّے میں جلا کرتی ہے بجلی بتی گھاٹیے بیٹھے ہیں[۴] تروا ہیں لگا کر چھپر
رات کو تین بجے کو اربدی ایکم سے دیویاں چل دیں نہانے کے لیے نور اتر
ہاتھ میں پوجا کی ڈلیا [۵] میں ہے جلتا ڈیئنا[۶] نولکھا ہار سے ہے موتی کی مالا بڑھ کر
آرتی ہوتی ہے مندر میں کہیں چار بجے بم مہادیو کوئی کہتا ہے کوئی ہر ہر

کاشی کی مہما سننے کے بعد اب منشی جی کو ساون بھادوں کی پھواریں بھیگتے ہوئے دیکھیے۔ ان کے اشعار میں بھاشا کی شیرینی اور گھاٹ سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

گھٹا ہے گھنگھور رات کالی یہ کون سیر و شکار میں ہے
ہر ایک جگنو جلا کے مشعل رواں دواں سبزہ زار میں ہے

ہوا کے جھونکے سے تالیاں سب شجر کے پتے بجا رہے ہیں
ملار گاتا ہے ابر باراں عجب سماں کوہسار میں ہے

---

[۱] روپیشور= ایشور کا روپ۔
[۲] بنارس کے ایک مشہور گھاٹ کا نام۔
[۳] پگڈنڈی۔
[۴] کنارے پر۔
[۵] ٹوکری۔
[۶] چھوٹا چراغ۔

ہوائیں چلتی ہیں ہلکی ہلکی پھوار پڑتی ہے دھیمی دھیمی
تلی ہوئی ہر شجر کی ڈالی حسین پتوں کے ہار میں ہے

زمیں خزانہ اگل رہی ہے گلوں کی مٹھی بھری ہے زر سے
فلک سے موتی برس رہے ہیں بہار اپنے سنگار میں ہے

وہ بات کرتے تھے کچھ ہنسی کی فلک پر اتنے میں برق چمکی
لو ہنس کے کہنے لگے یہ بجلی ہماری ”گویاں گھار[1] میں ہے

اندھیری بھادوں کی رات کالی نہ چاند آکاش پر نہ تارے
تڑپ کے بجلی جو دوڑتی ہے کوئی حسین رہگزار میں ہے

کچھ ایسا خود رفتہ کر دیا ہے فریب حسن ازل نے مجھ کو
گلوں کے پہلو میں ہے تو خوشبو، مگر نہیں اختیار میں ہے

منشی بیتاب کی شاعری کا سب سے بڑا عیب یا سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اکثر و بیشتر فی البدیہہ لکھا ہے۔ اس میں وہ مجبور بھی تھے، اور مختار بھی۔ اکھاڑہ جما ہوا ہے، مخالفین نے کوئی منظوم سوال کر دیا جس کا جواب منشی جی کے شاگردوں کے پاس موجود نہیں۔ فوراً ایک آدمی دوڑا ہوا منشی جی کے پاس پہنچا اور منشی جی نے قلم برداشتہ اس سوال کا منظوم جواب پیش کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس رواروی میں جو کچھ کہا جائے گا اس میں غور و فکر کا عنصر موجود ہونے کا امکان کم ہوگا۔ یہاں تو شاعری کا مقصد یہی تھا کہ زیر بحث موضوع کا بھرپور جواب نظم کر دیا جائے اور پڑھنے والے کا لب و لہجہ ایسا ہو کہ ہر سطح کا سامع اسے فوراً سمجھ جائے۔ بیتاب پڑھے لکھے آدمی تھے ان کے علم و فضل کا احترام کیا جاتا تھا۔ علمی مباحثوں اور دینی

---

[1] سہیلیاں، سکھیاں۔

مناظروں میں وہ اپنی علمیت اور ذہانت کے بل بوتے پر بڑے بڑوں کو قایل کر دیتے تھے لیکن ان کی شاعری عام طور پر ان کی شخصیت کے اس پہلو کی عکاس نہیں۔ عوام نے انھیں اس انداز میں اپنا لیا تھا کہ وہ اب خواص کے ہو کر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں پر شکوہ الفاظ کے شیش محل سجانے کی بجائے عوامی زبان کے روزمرہ کا سیدھا سادہ نقشہ پیش کر دیا ہے۔ وہ شب و روز عوام میں گھرے رہتے تھے۔ اسی عوامی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ کسی کی ہجو کسی کی تعریف، عوامی تہواروں کی ہنگامہ خیزیاں، ہولیوں کی رنگ رلیاں غرض اجتماعی سرگرمیوں اور اپنے دور کی سماجی اور سیاسی دلچسپیوں کو دلچسپ اور موثر ڈھنگ سے اپنے کلام میں پیش کرنا ہی بیتاب کا مشغلہ تھا۔ اپنی غزلوں میں البتہ وہ کسی قدر سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ یہاں ان کی شوخی بھی خندۂ زیر لب سے آگے نہیں بڑھتی۔ خمسوں کا پھکڑپن اور ''بانوائی'' کی آزاد خیالی اس بزم میں بار بار نہیں پا سکتی۔ کہیں کہیں وہ ندرت پیدا کرنے کی شعوری کوششوں میں بھی مصروف نظر آتے ہیں۔ فقیرانہ مزاج یہاں ہاؤ ہو کا نعرہ بلند کرنے کی بجائے حیات و کائنات کی گونا گوں کیفیتوں اور فکر انگیز جلوؤں سے حکیمانہ اور عارفانہ نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

گنجائش جمال حقیقت نہ ہو سکی   کافی جہان تنگ کی وسعت نہ ہو سکی
گل کے ورق ورق پہ تیری داستان ہے   تحریر پھر بھی تیری حکایت نہ ہو سکی
دیکھا تمام عمر جمال جہاں نما   آگاہ پھر بھی چشم بصیرت نہ ہو سکی
گو مجھ میں تجھ میں ربط ہے مانند بو و گل   تو پھر بھی پا سکے گی نہ عمر رواں مجھے
قید حیات سے کہیں باہر نہ جا سکا   تارِ نفس ملے کہ ملیں بیڑیاں مجھے
دشمن کو بھی خدا نہ غریب الوطن کرے

کھٹکے کی نیند کہتی ہے بستر اٹھائیے

ہر اک موج سے کہتا ہے ساحل ہستی
جو آیا سر کو پٹکتا ہوا روانہ ہوا
بڑھ کے غربت سے جہاں میں کوئی آزار نہیں
خار تک میرے ٹھہرنے کا روادار نہیں
پوچھتے کیا ہو کہ کل ہوگی ملاقات کہاں
ہم مسافر ہیں ہمارا کہیں گھر بار نہیں
کیوں عندلیب رہ نہ گئی من کی من میں آج
کل کی فضا نصیب نہیں اس چمن میں آج
بادشاہوں کو کفن غیر کے ہاتھوں سے ملا
دیکھنے والوں نے دنیا کا یہ ساماں دیکھا

بیتابؔ کے تغزل میں ان کے درویشانہ جذبات جگہ جگہ جھلکتے ہیں۔ بے سروسامانی، قناعت، خودداری، دنیا کے گرم وسرد پر مستقل نظر۔ ہمیشہ خوش رہنے کی عادت وغیرہ کے مضامین ان کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔

چراغ تک نہیں گھر میں مرے زمانہ ہوا
جو برق چمکی تو روشن غریب خانہ ہوا
تن پر ملے ہو خاک تو کمبل ہے دوش پر
بیتابؔ تم کو دیکھا عجب پیرہن میں آج
جب چاہتا ہوں کام لوں دست سوال سے
پہلے جواب دیتی ہے میری زباں مجھے

آنکھوں میں میری خواب اجل کا خمار تھا
کتنا پکارتا جرس کارواں مجھے

عاشقِ مرحوم کو کوئی کفن دے یا نہ دے
جامۂ ہستی جب اترا شرم عریانی گئی

آ کر صبا نے کان میں غنچوں کے کیا کہا
ہر پنکھڑی زمین چمن پر بکھر گئی

گھر میں ہمارے حرص و ہوا کا گزر نہیں
یہ جھونپڑی فقیر کی دارالامان ہے

دیکھیں گل اپنے منہ کو گریباں میں ڈال کر
خوشبو نکل گئی تو کوئی پوچھتا نہیں

زمانہ کیا کہے گا پوچھ لے سارے زمانے سے
مجھے مت پھیر خالی ہاتھ اپنے آستانے سے

دیکھے نگاہ کرم سے کیوں باغباں مجھے
تو اے بہار پھیر دے میری خزاں مجھے

اے دل تجھے پسند ہے اس باغ کی ہوا
خانہ خراب تو بھی ہمارا سلام لے

اب انھیں ''ہمہ اوست'' اور ''انا الحق'' کے ماحول میں دیکھیے :-

بھیڑ میں تو نظر آتا نہیں چہرا تیرا   چڑھ کے اب دار پہ دیکھیں گے تماشا تیرا

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کرشما تیرا   تیری بے پردگی رکھ لیتی ہے پردہ تیرا
ہم سُن چکے ہیں پہلے ہی منصور کا قصہ   سولی پہ چڑھا دیتے ہو مستانہ بنا کر
دن رات پھر رہے ہو زمانہ کی آنکھ میں   پھر کیوں نئے لباس میں شام و سحر نہ ہو
آدمی دیر میں یا خانۂ داور میں رہے   سر رہے دوست کے سجدے میں کسی گھر میں رہے
دونوں عال کا تماشا نظر آتا ہے مجھے   میری آنکھوں میں وہ دن رات پھرا کرتے ہیں

مجموعی حیثیت سے منشی بیتابؔ کے رنگ تغزل کا اندازہ پڑھنے والوں کو مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی ہو سکے گا۔

اجاڑنے کا ارادہ ہو یا بسانے کا   جدھر پھرے وہ ادھر رخ پھرا زمانے کا
بنا دیا تجھے اہل کرم فقیروں نے   بتا بتا کے پتہ تیرے آستانے کا
بہار آئی ہے تنکے چنیں گے مرغ چمن   ہمیں تو شوق نہیں آشیاں بنانے کا
مسکتے ہیں میرے کپڑے تو شکر کرتا ہوں   مجھے طریق سکھاتے ہیں مسکرانے کا

کفن سے عیب تو ڈھکتا نہیں ہے اے بیتابؔ
فقط پہ پردہ ہے دنیا سے منہ چھپانے کا

……

وہاں تک جو میری رسائی ہوئی   زمانے سے کیا کیا بُرائی ہوئی
جلا کرتی ہے شمع محفل میں روز   یہ ہے آگ کس کی لگائی ہوئی
زمانے میں دستور ہے بات کا   جہاں منہ سے نکلی پرائی ہوئی
نہ پوچھو کہ دل دے کے کیا کیا ہوا   رسائی ہوئی نارسائی ہوئی

……

دلِ بیتاب کہا مان کہاں جاتا ہے کو
تجھ کو بھاری ہوئی ہے جان کہاں جاتا ہے
سر رہے یا نہ رہے دوش پہ اپنے لیکن
سر سے اس تیغ کا احسان کہاں جاتا ہے
جاں نثاروں کا اگر آج وہاں ہے مجمع
اپنے ہاتھوں سے یہ میدان کہاں جاتا ہے
دور سے دیکھتے ہی ان کے نگہباں بولے
ٹھہر تو جان نہ پہچان کہاں جاتا ہے
روز میں دیکھتا ہوں تجھ کو پہر رات ڈھلے
تیرے صدقے تیرے قرباں کہاں جاتا ہے
اب تو آیا ہے میرے ہاتھ میں دامن ان کا
جب تلک جان میں ہے جان کہاں جاتا ہے
خیر دامن کا جو ہونا تھا ہوا یہ دیکھو
آج ہاتھوں سے گریبان کہاں جاتا ہے
جب سے اس شوخ نے کھینچوائی ہے تصویر اپنی
کیا کہوں تب سے مرا دھیان کہاں جاتا ہے
دلِ مضطر پہ عبث ہاتھ دھرے ہو بیتابؔ
ہے جب اللہ نگہبان کہاں جاتا ہے

……

تم سے اغیار زمانے کا گلا کرتے ہیں
دے خدا تم کو سمجھ ہم یہ دعا کرتے ہیں
صاف ہر طرح سے ہے آئینۂ دل اپنا
تم جہاں چاہو رہو دیکھ لیا کرتے ہیں
دیکھا کرتے ہیں ہم آنکھوں سے تماشا ان کا
اور کانوں سے زمانے کی سُنا کرتے ہیں
یہ نصیحت بھی نصیحت ہے کوئی اے ناصح!
آپ تو گوشت سے ناخن کو جدا کرتے ہیں
پیچھے رکھتے ہیں قدم اپنا ترے کوچے میں
پہلے تقدیر کو ہم ٹھونک لیا کرتے ہیں
اے صنم دیکھنے کو تیری ادائیں اکثر
متقی لوگ نماز اپنی قضا کرتے ہیں

……

ان کے نزدیک بھی میری ہی خطا رہتی ہے
ساری دنیا مری صورت سے خفا رہتی ہے
دیکھو اس خط و کتابت کا نتیجہ کیا ہو
جان ہی جاتی ہے اس پھیر میں یا رہتی ہے
لوگ سمجھا کے تھکے مجھ کو تو یہ کہنے لگے
اس کو گھیرے ہوئے خود اس کی قضا رہتی ہے

……

راز و نیازِ عشق جو پنہاں نہیں رہا
پردہ پسند جلوۂ جاناں نہیں رہا
جو کچھ کہو بجا ہے گنہگار عشق ہوں
میں قابل نجات بھی جی ہاں نہیں رہا
بیتابؔ بزم یار میں پہنچا تو کس طرح
درباں نہیں رہا کہ نگہباں نہیں رہا

……

غریبی نے کیا غربت میں ایسا ناتواں مجھ کو
اٹھاتا ہے بٹھاتا ہے غبارِ کارواں مجھ کو
وہ میرا ڈوبنا ہی اک طلاطم خیز تھا ورنہ
پکڑتی دوڑ کر کیا خاک ہر موجِ رواں مُجھ کو

جو شے تیری نظر پہ چڑھی یا اُتر گئی
دونوں طرح سے بس مجھے برباد کر گئی

ظالم کہاں ہیں اب تیری محشر ستانیاں
کوچے سے تیرے اٹھ کے قیامت کدھر گئی

بیمارِ غم کو حال پہ اپنے سکوت ہے
وہ جانتے ہیں یہ کہ طبیعت ٹھہر گئی

لڑتے تھے جس ادا پہ حریفانِ بادہ کش
عشق آفریں نگہ کی وہ شوخی کدھر گئی

کیا آنکھیں کھولوں موردِ الزام ہو چکا
ان کھڑکیوں سے جھانک کے بدنام ہو چکا

دل میں مرے آ بیٹھے ہو کاشانہ بنا کر
اک روز چلے جاؤ گے ویرانہ بنا کر

فلک پہ قوسِ قزح کا نمود کیا معنیٰ؟
تلاش کرتا ہے کوئی کماں بدوش مجھے

باکمالوں کو زمانے نے اُبھرنے نہ دیا
صورت آئینہ ڈوبے ہوے جوہر میں رہے

ساری دنیا ہو چکی آباد اے ذرّہ نواز
ایک ملکِ دل مرا ویراں کا ویراں رہ گیا

پڑ جاتی ہے بلبل کی نظر آتش گل پر
جھونکا کوئی آ جاتا ہے جب سرد ہوا کا

تیری گلی سے اٹھ کے کہیں جا نہ سکا میں
کیسا حِصار تیری محبت نے کر دیا

کمال دیکھیے ساقی کے اک اشارے کا
نگاہ پھر نہ اٹھی جانبِ سبو مری

رخ جانبِ صیاد پھرا ہے دمِ رم بھی
مارا ہے ہرن کس نگہ ہوش ربا کا

جب اتنی بے زبانی پر قیامت ڈھا رہا ہے تو
ترے منہ میں زباں ہوتی دلِ مضطر تو کیا ہوتا

اللہ رے تیرے عارضِ پرنور کی ضیا
قدرت نے رکھ دیا مہ کامل تراش کے

سوالِ قبر کا انجام ہوگا کیا خدا جانے
پرائے دیس کی بولی میں ہم دعویٰ نہیں کرتے

عریاں پڑی تھی لاش غریب الدیار کی
بادِ صبا نے ڈال دی چادر غبار کی

....

موت کی جان کو نہ ہم روتے
نیند آتی اگر جدائی میں
اُٹھ گیا اعتبار دنیا سے
کیا ملا تجھ کو بے وفائی میں

تجھ کو بن دیکھے لوگ کہتے ہیں
کوئی تجھ سا نہیں خدائی میں
ہائے کیا تجھ کو ہو گیا بیتابؔ
فرد تھا تو تو پارسائی میں

……

لوگ ناحق مجھے الزام دیے جاتے ہیں
کوئی مجرم ہو ہمیں پیش کیے جاتے ہیں
میرے زخموں میں دیے جاتے ہیں ٹانکے بیتابؔ
بے زبانوں کے بھی منہ آج سیے جاتے ہیں

……

تیری ہی جستجو میں تو میں در بدر گیا
پھر کیا ہوا کہ تیری نظر سے اُتر گیا
جو کشتگانِ خنجرِ تسلیمِ یار ہیں
وہ یہ بھی پوچھتے نہیں قاتل کدھر گیا
بیتابؔ بیٹھ، پی بھی لے پگڑی میں چھان کے
مسجد میں جا کے دھوئیو دھبہ شراب کا

……

ان کا دامن اور میری چشم دریا بار ہے
آج میرا فیصلہ اس پار یا اس پار ہے

کبھی ہم سے بھی ان کا اس طرح کا دوستانہ تھا
کہ ہم وہ اک طرف تھے اک طرف سارا زمانہ تھا

محوِ حیرت ہو کے ہم ہر دم انھیں دیکھا کریں
ہم کو دیکھے سارا عالم ہم انھیں دیکھا کریں

منشی بیتابؔ کی پر گوئی اور زود گوئی ضرب المثل ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ انھوں نے خود ہی اپنا بیشتر کلام صرف کر دیا۔ شاگردوں کے لیے سینکڑوں خمسے اور غزلیں لکھ کر تقسیم کر دیں۔ ایسی چیزیں اگر ملتی بھی ہیں تو پڑھنے والا مایوس ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ اکثر یہ منظومات منشی جی کی قلم برداشتہ شعر سازی کا کرشمہ ہیں۔ ان کے شاگردوں اور مداحوں کو آج بھی ان کی بیسیوں چیزیں سینہ بہ سینہ حفظ ہیں لیکن ان میں سے اسی فی صدی کلام کی صورت مسخ ہو چکی ہے۔ دہن بہ دہن نقل ہوتے ہوتے ان کا کلام اب منظوم سے زیادہ منثور دکھائی دیتا ہے۔ اس مضمون میں ان کا جس قدر کلام فراہم کیا گیا ہے وہ ریت سے تیل نچوڑنے کا نتیجہ ہے۔

منشی بیتابؔ کا انتقال ۱۹۴۴ء میں ہوا۔ انتقال سے ایک روز پہلے وہ اپنے سب عزیزوں، شاگردوں اور مداحوں سے ملاقات کے لیے نکلے تھے اور سب کو اطلاع دی تھی کہ یہ ان کا آخری ''آنا'' ہے۔ اس کے بعد سب کو ان کے لیے آنا ہوگا۔ اکثر احباب نے اسے منشی جی کی شوخی جانا لیکن دوسرے دن یعنی ۶ / اکتوبر کو منشی جی کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ انتقال سے ایک آدھ گھنٹہ پہلے لوگوں نے سورہ یٰسین پڑھنا چاہا لیکن منشی جی کی زندہ دلی نے یہ بات گوارا نہیں فرمائی۔ ہنس کے کہنے لگے یہ سورہ پڑھیے گا تو پڑوسی سمجھیں گے کہ منشی بیتابؔ کا دم نہیں نکل رہا ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ کسی قسم کی تکلیف ہی نہیں۔ آخری وقت میں بڑے اطمئنان سے ایک پیالہ سبز چائے کا نوش فرمایا۔ حقے کے دو ایک کش لیے اور مطمئن ہو کے گہری نیند سو گئے۔ ان

کے ہونہار بھائی حضرت نذیؔر بنارسی نے درج ذیل مصرعے سے مادہ تاریخ نکالا۔

چل بسے ہائے حضرت بیتاؔب

؁۱۹۴۴ء

منشی جی ریوڑی تالاب پر دفن ہیں۔

فرؔخ بنارسی

بیسویں صدی کے آغاز میں وقت کے دریودھن کے ہاتھوں غزل کی دروپدی کی لاج بچانے میں جن شعرا نے مہابھارت کے کرشن کنہیا کا سا کارنامہ انجام دیا تھا۔ ان میں اصغؔر و جگرؔ اور حسرتؔ و فانیؔ کے نام اکثر میکانکی انداز میں اس طرح دھرادے جاتے ہیں گویا صرف یہی چار پانڈو اس کے مستقل مالک و مختار ہوکر رہ گئے ہیں۔ ان بزرگوں کی کوششیں مستحسن و مُسلّم ، لیکن ایوان غزل کے آئینہ خانے میں ان لوگوں کے علاوہ بھی بہت سی ایسی شخصیات کے نورانی عکس ابھرتے ڈوبتے نظر آتے ہیں جن کو زمانے نے بہت کم پہچانا ہے اور جو اس صنف سخن کے ہراول دستے میں نہ سہی اس کے محافظ دستے میں مناسب جگہ پانے کے مستحق ضرور ہیں۔ غزل کو ایہام گوئی اور لفظی صنعت گری کی دلدل سے نکالنے اور واردات قلبیہ، دقائق حکیمیہ، نفسیاتِ حُسن و عشق اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے روشناس کرانے میں آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے جن لوگوں نے مجاہدانہ سرفروشی کا مظاہرہ کیا تھا بنارس کے سید واجد علی فرؔخ انھیں میں سے ایک ہیں۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے لسانی ماحول میں اصغؔر اور فانیؔ کے انداز میں صوفیانہ اور فلسفیانہ نازک بینی اور نازک کاری فرؔخ بنارسی کے کلام کا اساسی جوہر ہے۔ فلسفہ زندگی و موت پر وہ ہر جگہ ایسی عارفانہ نظر ڈالتے ہیں کہ فانیؔ کا مر مر کے جیے جانے کا قصّہ سچا معلوم ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ عملی طور پر دونوں شاعروں کی زندگی مختلف حالات میں بسر ہوئی ہے۔ فانیؔ حسن و عشق

کے معاملات میں عملی زندگی میں عالمِ بے عمل نظر آتے ہیں لیکن فرؔخ نے اس سلسلے میں ہنستے بولتے سینکڑوں مرحلے اس آسانی سے طے کیے ہیں کہ ؎

چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

کے مصداق ہو کر رہ گئے ہیں۔

ماں کی طرف سے فرؔخ کا خاندانی سلسلہ میر قاسم نواب بنگالہ سے ملتا تھا۔ یہ لوگ بنارس میں کب آئے اور کب یہاں مستقل طور پر مقیم ہوئے اس کا تو پتہ نہیں لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ شاعری کا شوق فرؔخ کو وراثت میں ملا تھا۔ دادا میر امداد علی بحرؔ خود شاعر تھے اور گھر میں شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ فرؔخ کے والد محمد تقی فرؔخ کی ولادت (۱۸۷۵ء) کے فوراً بعد انتقال کر گئے تھے اس لیے ان کی تعلیم و تربیت اپنے نانا نواب حاتم علی خاں صاحب کے زیر سایہ ہوئی۔ نواب صاحب برٹش گونمنٹ کے خطاب یافتہ رئیس اور اگلے وقتوں کی شرافت اور وضعداری کا نمونہ تھے۔ اسی ماحول میں فرؔخ نے ہریشچندر کالج، بنارس سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد مراد آباد سے پولیس سب انسپکٹر کی ٹریننگ لیکر اسی محکمے میں ملازم ہو گئے۔ زندگی کا بیشتر حصہ انھوں نے بنارس سے باہر مختلف شہروں میں کورٹ انسپکٹر کی حیثیت سے گزارا۔ ریٹائر ہونے کے بعد اپنے مرکز کو لوٹ آئے اور ۱۹۴۵ء میں بنارس میں انتقال فرمایا۔

حضرت فرؔخ کی شخصیت کا روشن پہلو ان کی زندہ دلی ہے۔ وہ اس شعر کی تفسیر تھے کہ

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگی تو عبادت ہے تیرے جینے سے

محکمۂ پولیس کی طلسمی اور پراسرار مصروفیات میں بھی وہ حضرت نیاز فتحپوری کی طرح اپنے ادبی ذوق کو نکھارنے اور سنوارنے میں عمر بھر اس انداز میں مشغول رہے کہ ان کے سرکاری

پیشے کی خشکی ایک ضمنی حیثیت میں محدود رہی۔ حسن پرستی میں یکتائے روزگار تھے۔ بھنورے کی طرح کسی ایک خوشنما پھول پر قیام انھیں پسند نہ تھا۔ شہر بہ شہر اور کو بکو گلشنِ حسن کی گلگشت میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے دوستوں کے خیال میں اسی گل چینی نے ان کے تغزل اور شعریت کو جوان رکھا اور وہ بڑھاپے میں بھی نکاح در نکاح کی فکر میں رہے۔ فرخ کو فنِ موسیقی سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ استاد معزالدین خاں اس دور میں ٹھمری کے بنارسی انگ کو پیش کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ فرخ کا اس گھرانے میں بہت آنا جانا تھا۔ استاد کی ہمشیرہ رحیم النساء کے فن اور شخصیت میں کچھ ایسی دلربائی موجود تھی کہ فرخ ہزار جان سے فریفتہ ہو گئے اور پھر ایک دن ہزار مخالفتوں کے باوجود اس غیرت ناہید کو جس کی ہر تان بقول مومن دیپک تھی اپنے گھر لے آئے۔ اہل خانہ اس پیوند سے کبھی خوش نہیں رہے اور فرخ کو اس جرم کی پاداش میں بہت سی ذہنی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں لیکن رحیم النساء گویا فرخ کی ہستی کا ایک مستقل جزو بن کر رہ گئی تھی۔ انھیں خانہ بدر بھی کیا گیا، لیکن وہاں تو

ہے ہر صدا صدائے بیاباں ترے بغیر　　فریاد ہو کہ نغمہ ہو فرخ اثر کہاں

رحیم النساء اپنے بھائی استاد معزالدین خاں کی مانند بہت بڑی موسیقار مانی جاتی تھیں۔ اس بیگم سے فرخ کی کوئی اولاد نہیں۔ اگرچہ اس کے بعد بھی فرخ نے بہت سے نکاح اور متعہ کیے لیکن رحیم النساء کا احترام ہمیشہ پیش نظر رہا اور ان کی دوسری بیگمات کا درجہ ہمیشہ کم تر رہا۔

فرخ شیعہ مذہب کے پیروکار تھے اور اپنے عقاید کے عالم باعمل تھے۔ اہل بیت سے ان کی محبت اور وابستگی قابل احترام ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ سنیے۔ فرخ نے ایک دفعہ بنارس کے مضافات میں چکیہ کے قصبے کی ایک عورت سے متعہ کیا اور اُسے بنارس لے آئے۔ احباب میں حکیم کاظم بنارسی، محشر بنارسی، میر ریاض علی ریاض وغیرہ نے ان کے اس بیاہ

کے جشن پذیرائی میں ایک ادبی نشست منعقد کی جس میں فرخ کا نہایت مناسب طریقے سے استقبال کیا گیا۔ بعد میں اسی ''مشاعرہ'' میں ایک صاحب نے ایک لمبی غزل نما نظم سنائی جس کے ایک ایک شعر پر فرخ تڑپ تڑپ اٹھے۔ مطلع تھا۔

آج ان کا بیاہ ہے پیارے
وہ جنھیں ضعف ...... ہے پیارے

فرخ کے چراغ پا ہونے کے باوجود پڑھنے والے نے پوری نظم پڑھ ڈالی اور سننے والوں نے ممدوح کے ہزار احتجاج پر بھی اسے پورے انہماک سے سُنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محفل برخاست ہوتے ہوتے فرخ نے حضرت عباس کی قسم کھائی کہ کبھی مشاعروں میں شریک نہ ہوں گے اور اس قسم کا اس قدر احترام کیا کہ ادبی اجتماعوں میں شریک ہونا قطعی بند کر دیا۔

اب یارانِ طریقت کو فکر ہوئی، ایک صاحب ایک مجتہد کی خدمت میں استفتا کے لیے حاضر ہوئے کہ اگر عالم جذبات میں کوئی مومن حضرت عباس کی قسم کھائے تو کیا یہ قسم مستقل حیثیت رکھتی ہے؟ مجتہد نے اس کے جواب میں ایک تحریری سند فرخ کے لیے روانہ کی۔ احباب ان کی دولت کدے پر پہنچے۔ مشاعرے میں شرکت کے لیے اصرار کیا۔ جب کسی صورت نہ مانے اور کہا کہ میں نے حضرت عباس کی قسم کھائی ہے تو دوستوں نے وہ تحریر دکھا دی جس کو دیکھتے ہی فرخ مشاعروں میں شرکت کے لیے تیار ہو گئے۔ اس واقعہ سے اہل بیت سے فرخ کے عقیدت بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔

فرخ کو پان کھانے کا بہت شوق تھا۔ اس شوق میں ان کے سارے دانت داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ مصنوعی دانت بنوانے کے بعد بھی پان ہر وقت منہ میں رہتا تھا۔ ایک صاحب نے پوچھا ''حضرت آپ پان چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔'' جواب دیا، ''پان نے ہمارے

دانت نہیں چھوڑے، ہم پان کو کیوں چھوڑ دیں؟''

فرخ کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ حضرت اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، فانی بدایونی، آثر لکھنوی، رضی بدایونی، خبیر لکھنوی وغیرہ سے بہت بے تکلفی تھی۔ مشاعروں میں شرکت کے لیے بھی اکثر تشریف لے جاتے تھے لیکن قدرت نے انھیں ایک بہت بڑی نعمت سے محروم کر رکھا تھا۔ فرخ جس قدر اچھا کہتے تھے اسی قدر برا پڑھتے تھے۔ وہ بچپن سے ہکلاتے تھے اس لیے ان کے اچھے اچھے اشعار بھی ہوٹنگ کی نذر ہو جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ فرخ نے غزل شروع کی اور مشاعرے میں ہنگامہ شروع ہوا۔ بعد میں جب وہی غزل کسی اور سے پڑھوائی گئی تو فرخ بنارسی زندہ باد ہو گئے اور مشاعرہ انھی کے ہاتھ رہا۔

فرخ اپنا کلام مرزا فائز کو دکھاتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاگرد کو استاد سے کوئی نسبت نہیں۔ استاد اگر کنگھی چوٹی کے عاشق تھے تو شاگرد کو دار و رسن کی تلاش رہتی تھی۔ استاد چاہِ ذقن میں ڈوب ڈوب کر ابھرتے تھے لیکن شاگرد فنا فی اللہ میں بقا باللہ کا منظر دیکھ رہا تھا۔ استاد فرضی معشوق کے لیے مصنوعی عاشق کا سوانگ بھرتے تھے لیکن شاگرد بتوں کے زبردست پرستار ہونے کے باوجود محبوبِ حقیقی کو پہنچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید یہ استادی شاگردی صرف فن اور اس کے رموز و نکات کی آشنائی تک محدود تھی۔

فرخ بہت پرگو اور زود فکر شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی غیر شاعرانہ مصروفیات کے باوجود مختلف اصناف سخن میں بہت سا سرمایۂ شعری یادگار چھوڑا تھا۔ ایک مختصر مجموعۂ کلام ''تجلیاتِ فرخ'' کے عنوان سے انھوں نے ۱۹۳۰ء میں شایع کیا تھا۔ کتاب کے شروع میں رضی بدایونی اور ضیا احمد بدایونی کے لکھے ہوئے دو مقدمے شامل ہیں۔ چھوٹی تقطیع کے اس مجموعۂ کلام میں ایک طویل قصیدہ، چند نظمیں اور بہت سی غزلوں کے علاوہ کچھ رباعیات بھی پیش کی گئی

ہیں۔ فرخ نے اپنا دوسرا مجموعۂ کلام ''آئینہ فرخ'' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت سے پہلے وہ خود راہی ملک عدم ہوے، ان کے انتقال کے بعد ''آئینۂ فرخ'' اور بہت سا کلام جس میں قصائد، رباعیات، سلام، غزلیات، مرثیے وغیرہ بھی موجود تھے دست بدست اور لب بہ لب غائب ہونا شروع ہوا۔ کچھ لوگوں نے طاق نسیاں پر رکھ دیا اور کچھ اہل ذوق نے مشاعروں میں صرف کر کے اپنی جھولیاں داد و تحسین سے بھرلیں۔ اب جن لوگوں کے پاس یہ گراپڑا مال غنیمت موجود ہے وہ اس کو روزِ روشن میں دکھاتے ہوئے شرماتے ہیں۔

فرخ قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کے قصیدے اور رباعیاں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان کا دل ان کی غزلوں میں دھڑکتا ہے۔ یہ صنف شاعری انھیں محبوب تھی اور اسی میں انھوں نے اپنے واردات قلبی اور کیفیات واحساسات ذہنی کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ ان کی غزل میں سطحیت ڈھونڈھنے والے ناکام رہتے تھے۔ اسی لیے عوام کے مجمع میں ان کی غزل ناکام رہتی تھی۔ خواص ان کے کلام کو پسند کرتے تھے۔ جگر کی صاحب نظری نے پہچان لیا تھا کہ فرخ کی غزل میں وہ جوہر موجود ہیں جو روشنی طبع کی دین ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود انھیں بہت کم تسلیم کیا گیا۔ خود اہل بنارس نے انھیں مشکل گو سمجھ کر بالاے طاق رکھ دیا۔ چنانچہ راقم الحروف نے جب ایک صاحب فن سے فرخ کا کلام طلب کیا تو انھوں نے جس انداز سے وہ کلام فراہم کیا اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کوہ کنی سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بہر حال آپ اپنا کاہ براری کا شوق پورا کر لیجیے۔

فرخ گذشتہ دور کے جدید غزل گو تھے۔ انھوں نے طرحی زمینوں میں مصرعوں پر مصرعے نہیں لگائے ہیں بلکہ غزل کو اپنے افکار و جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان کے افکار میں فانی کی طرح قنوطیت کا گھن لگا ہو یا اصغر کی مانند اُنھوں نے تصوف کا بے وقت راگ

چھیڑا ہو، اس سے بحث نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری دروغ گوئی نہیں، یہ ان کے اخلاقی نفسیاتی اور صوفیانہ مشاہدات کی مظہر ہے۔ ایک فلسفی کی طرح وہ حیات ومما ت کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں تو حکیمانہ طرز فکر سے بڑے موثر اور معلوماتی مضامین سامنے لاتے ہیں۔ وہ ذرے میں آفتاب دکھا سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ذوق نظر کی تکمیل چاہیے۔ یہی وہ راستہ ہے جو انسان کو اعلیٰ اور بلند اخلاقی وروحانی اقدار کی طرف لے جاتا ہے۔ فرؔخ ان ہی اقدار سے اپنی شخصیت کی تشکیل چاہتے ہیں۔ ان کی غزل گوئی میں یہی تصوف اور یہی اخلاقی نظریات جاری وساری ہیں۔ فرؔخ شیعی عقاید رکھتے تھے۔ صوفیانہ متقدات ان کے شاعرانہ مزاج کی تخلیق تھی۔ یہاں ان کی دو شخصیتیں نظر آنے لگتی ہیں اور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ فرؔخ کے یہ شاعرانہ نظریات کہیں گرمیٔ محفل برقرار رکھنے کے لیے تو نہیں اختیار کیے گیے لیکن فوراً اس کی تکذیب بھی ہو جاتی ہے۔ یہ خیالات اتنی کثرت سے اور اتنے پرخلوص انداز میں نظم کیے گئے ہیں کہ شاعر کی روح کی آواز معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی ایک مسلسل جستجو ہے۔ دنیا اک پرتو حسن رنگیں کے سوا کچھ نہیں۔ وجود بشر محض ایک وہم ہے۔ اس وہم کا طلسم اس وقت ٹوٹتا ہے جب ہستی ہنگامہ ساز کا پردہ اٹھ جاتا ہے وگرنہ عمر بھر یہ معمہ سمجھنے کا ہے نہ سمجھانے کا۔

ازل سے گرم رو راہ جستجو ہوں میں
ہنوز منزلِ مقصود کا پتہ نہ ملا
طلسلم دہر میں اک وہم ہے وجود بشر
ہمیں تلاش سے اپنا بھی کچھ پتہ نہ ملا

☆..................☆

شوخیِ واہمہ ہے عالمِ ایجاد کہیں
کہ بجز نقشِ تصور کوئی بنیاد نہیں

یہ فقط واہمہ قیس کی خلاقی تھی
ورنہ محمل تھا نہ تھا صاحب محمل کوئی

جلوۂ دہر ہے اک پرتو حُسنِ رنگیں
کچھ نہیں ورنہ پس پردۂ ایوانِ حیات

پردہ اُٹھا جو ہستیٔ ہنگامہ ساز کا
سب کھل گیا فریب طلسمِ مجاز کا

میری ہستی بھی اک معمّا ہے
خود ہی جو یائے راز و پردۂ راز

محبوب حقیقی کا حسن ذرے ذرے میں نمایاں ہے۔ عارف کے لیے دیر و حرم کی کوئی قید نہیں اور جب یہ جلوۂ جاناں کسی پر عیاں ہو جائے تو دیکھنے والا خود اس میں گم ہو کر رہ جائے۔ ان مراحل کو طے کرنے کے لیے مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہے۔

شوق جلوہ ہے تو کر ذوقِ نظر کی تکمیل
کون سا ذرہ ہے جو آئینہ بردوش نہیں

جھکتی ہے ذرے ذرے کی جانب جبینِ شوق
کیا کہیے جوشِ سجدۂ بے اختیار کو

ذرہ فروغِ مہر کا آئینہ دار ہے
ہستی مری دلیل ہے تیرے ظہور کی

میں حقیقت اسے سمجھوں کہ نگاہوں کا فریب
کوئی پردہ میں بھی عریاں نظر آتا ہے مجھے

کثرت میں بھی وحدت کا جلوہ نظر آتا ہے
محفل میں کوئی ہم کو تنہا نظر آتا ہے

ہے ذرہ ذرہ حسن حقیقت کا آئینہ
اب آگے کام ہے نظر امتیاز کا

حجاباتِ مظاہر اور خود حیرانی نظر حریم حقیقت کے جلووں کو نظر سے اوجھل کر رہے ہیں۔

الجھ کر رہ گئی فرخ حجابات مظاہر میں
نگاہِ نارسا پہنچی نہ حسنِ بے تماشا تک

جلوہ اتنا بھی نہ ہو عام خود آرائی کا
کوئی مرکز نہ رہا چشم تماشائی کا

جلوہ کیسا نہیں احساسِ نظر تک باقی
ایسا بھی کیا کسی مشتاق کو حیراں کرنا

یاد اتنا ہے فقط برق سی اک چمکی تھی
پھر مرا حال ہوا کیا مجھے کچھ ہوش نہیں

اس جلوہ گاہِ ناز کی اللہ رے دل کشی
حیرانِ نظر ہے تماشا کہیں جسے

ہرگام پر ہے جلوۂ رنگیں کی دلکشی
کیا کیا فریب دیتی ہے میری نظر مجھے

تو ہی بتا قریب ہوں یا تجھ سے دور ہوں
کچھ ذوق جستجو میں نہیں اب خبر مجھے

دیدار کی مانع ہے جلووں کی فراوانی
جو پردہ اٹھاتا ہوں پردہ نظر آتا ہے

جرس کی آتی ہے کانوں میں دور سے آواز
تلاش میں ہوں مگر کارواں نہیں ملتا

جبر و اختیار کا فلسفہ حکیم عمر خیام سے لے کر اب تک ہر شاعر کا موضوع رہا ہے۔ اسی پر جزا و سزا اور جنت و جہنم کا دار و مدار سمجھا جاتا ہے۔ فانؔی کی طرح فرخؔ بھی انسان کو مجبور محض سمجھتے ہیں لیکن اس مسئلے پر عقل و فکر سے استدلال کی بجائے نہایت شاعرانہ انداز اور دل نشین پیرائے میں روشنی ڈالتے ہیں۔ یہاں وہ فلسفی کم اور شاعر زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس خشک مبحث قدیم میں شعریت پیدا کرنا فرخؔ کی شاعرانہ معراج ہے۔ فرماتے ہیں۔

کیا شکوہ مجبوری اتنا بھی غنیمت ہے
زنجیر کی وسعت تک قیدی کو ہے آزادی

پر کشادہ ہیں مگر طاقت پرواز نہیں
اتنا مجبور بھی یارب کوئی آزاد نہ ہو

مجبوریوں پہ دعویٰ آزادی خیال
اپنے ہی دل پہ مجھ کو نہیں اختیار دیکھ

مختار کر کے اور بھی مٹی خراب کی
مجبوریوں میں ڈال دیا اختیار کو

پرواز کی طاقت بھی تا حدِ معین ہے
سمجھو اسے مجبوری کہنے کو ہے آزادی

ترک بھی قید ہے اک تارک دنیا کے لیے
سچ تو یہ ہے کہ جہاں میں کوئی آزاد نہیں

فرؔخ کی نظر میں حیات فانی کا حاصل صرف موت ہے۔ نفس کی گرم روی برق کا تبسم ہے۔ زندگی ایک مسلسل قید ہے جو شخص انجام سے غافل ہو اس پر یہ قید بہت آسان ہو جاتی ہے لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ موت کے بعد بھی اس قید ہستی سے نجات نہیں کیوں کہ جس کو موت کہتے ہیں وہ ایک قیدِ حیات ابدی کی تمہید ہے۔

مرگ ہے قید حیات ابدی کی تمہید
بند ہستی سے کوئی چھٹ کے بھی آزاد نہیں

موت ہے زندگی کا دورِ جدید
میرا انجام ہے مرا آغاز

بے پری رشتۂ پا جلوۂ گلِ دام نظر
آشیاں ہو کہ قفس دونوں ہیں زندانِ حیات

مجموعہ حوادثِ پیہم تھی زندگی
تھا جو نفس وہ نغمۂ سازِ شکست تھا

غفلت میں سہل ہوگئی قیدِ غمِ حیات
وجہ سکوں اسیروں کو خوابِ گراں ہوا

اپنے دیوانے کو پابندِ سلاسل نہ کرو
زندگی خود ہی اسیری ہے تو زنداں کیسا

سُن لب گور سے رودادِ مآل ہستی
آخری ہے یہی ٹکڑا مرے افسانے کا

کب تک او بے خبرِ مرگ یہ غفلت کب تک
اُٹھ بہت دیکھ چکا خوابِ پریشانِ حیات

نفس کی گرم روی برق کا تبسم تھی
ملی بھی فرصت ہستی تو کس قدر محدود

حقیقت میں انھیں کی زندگی ہے زندگی فرؔخ
اجل کو ہستی فانی کا جو حاصل سمجھتے ہیں

نفسیات حسن و عشق میں ایک مسلمہ امر یہ بھی ہے کہ حسن جلوہ دکھانے کے لیے بیتاب ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے میں جمال ازلی خودنمائی کے لیے بے قرار ہے۔ اس جلوۂ بیتاب کو سمیٹنے کے لیے عشق کا عکس العمل کیا ہونا چاہیے وہ فرؔخ کی زبان سے سنیے۔

جمال خود نما کا دعوت ذوقِ طلب دینا
دو عالم کا سمٹ کر حلقۂ آغوش ہو جانا

جمالِ یار خود بیتاب ذوق گرم جوشی سے
تجھے اے دل مگر آتا نہیں آغوش ہو جانا

ان کا محفل میں اٹھانا رخ رنگیں سے نقاب
نگہہ شوق کا فردوس بداماں ہوتا

آئینہ وجود میں اک پرتو جمال
اس طرح جلوہ گر ہے کہ دیکھا کرے کوئی

فرؔخ بنارسی فانؔی بدایونی کے ہمعصر اور ایک حد تک ان سے متاثر بھی ہیں۔ انھوں نے فانؔی کی زمینوں میں اور فانؔی ہی کے شاعرانہ ماحول میں شعر بھی کہے ہیں۔ ''تجلیات فرؔخ'' کی

پہلی غزل فانؔی کی زمین میں ہے۔ فارسی تراکیب کی اختراع اور مشکل سے مشکل مضامین کو نہایت آسانی سے شاعرانہ پیرایوں میں بیان کردینے میں وہ فانؔی کے دوش بدوش چلتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ صرف میت بے گوروکفن نہیں ہیں۔ وہ عبرت کے لیے روداد مال ہستی کو لب گور سے سنتے ہیں لیکن کفن سرکا کر کو خود اپنی بے زبانی سے دہشت اور تنفر پیدا کرنا نہیں جانتے۔ وہ زندگی کے انجام سے مایوس تو ہیں لیکن زندگی کا ماتم کرنے میں مصروف نہیں رہتے۔ قنوطیت کا گھن فرخؔ کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے لیکن اک کیف بے خودی نے ان کے کلام کو متنوع بھی بنا رکھا ہے۔ ان کی مایوسیوں میں ایک ایسا جذبہ ہے جو پڑھنے والے کو متاثر تو کرتا ہے لیکن ''محشر سکوت'' کا ماحول پیدا نہیں کرتا۔ یہاں نامرادی حد سے گزر کر ہر نفس کو آہ بے تاثیر کا ایک جنازہ نہیں بنا دیتی۔ لذت فنا کی چاٹ میں دل موت کی دعا کر کے ٹھہر نہیں جاتا بلکہ مایوسیوں اور نامرادیوں کے عالم میں شاعر کے لہجے میں ایک فریاد کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے کلام کو اور زیادہ موثر بنانے میں مدد دیتی ہے۔ فرخؔ کی قنوطیت دوسروں کو قنوطی بننے کی ترغیب نہیں دیتی۔

رہے قفس میں تو صیاد کے ستم دیکھے
چمن میں آئے تو اب آشیاں نہیں ملتا

فرخؔ اک آہ کھینچ کے خاموش ہوگیا
پھر بھی انھیں گلہ ہے کہ قصہ دراز تھا

اجل نے قصۂ غم ناتمام چھوڑ دیا
یہیں سے سلسلۂ داستاں نہیں ملتا

کوششِ برباد یعنی آہ نکلی کام کی
ایک جھونکے میں چراغِ زندگی خاموش تھا

☆............☆

خوگرِ غم کے لیے عیش کا ساماں کیسا
لذتِ درد سلامت ہے تو درماں کیساں

☆............☆

نوک ہر خار سے کہتا ہے مرا ذوقِ خلش
لے مبارک تجھے پیوست رگ جاں ہونا

☆............☆

قفس کی یاد ستاتی ہے اب نشیمن میں
قفس میں تھے تو تڑپتے تھے آشیاں کے لیے
اسیر بات بھی آپس میں کر نہیں سکتے
قفس میں قید قیامت کی ہے زباں کے لیے
اب آگے دیکھیے تقدیر کیا دکھاتی ہے
چمن میں طرح تو ڈالی ہے آشیانے کی
دیا تا حدِ منزل ساتھ ضعف و بے قراری نے
اُٹھے ہم درد دل ہو کر تو بیٹھے نقشِ پا ہو کر
خندۂ گل نغمہ سازِ شکست رنگ ہے
ہے عیاں آغاز میں تاثیرِ پایان بہار

گلچیں کا خوف برق کا کھٹکا خزاں کا ڈر
کیا کیا مصیبتیں رہیں فصل بہار تک

دوسرے اہل دل کی طرح فرخ بنارسی کبھی کبھی گور غریباں کی بھی سیر کر لیتے ہیں لیکن یہاں پہنچ کر مصنوعی تصور غم انھیں محض گور و کفن اور شکستہ و ریختہ ہڈیوں کا داستان گو نہیں بنا دیتا۔ ان کی غزل میں بوئے کفن نہیں بس جاتی اور وہ فانی کی مانند اپنے خود ساختہ غم گیتی کو نظریاتی مباحث کا موضوع نہیں بنا لیتے۔ وہ افسردہ دل ضرور ہیں لیکن ساری انجمن کو افسردہ نہیں بناتے۔ وہ اس افسردگی سے ایک رومانی فضا قایم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کی شکستہ پری انھیں خودکشی پر آمادہ نہیں کرتی بلکہ وہ اس عالم میں بھی اپنے ماحول ہی میں آسودگی کی تلاش میں رہتے ہیں۔

صبا شکستہ پروں کی دعائیں لیتی جا
جھکا دے اور ذرا شاخ آشیانے کی

وہ اس حقیقت سے بھی باخبر ہیں کہ نشاط و غم کا سرچشمہ خود انسان کی اپنی ذات ہے۔ چنانچہ اگر آنکھیں حسین ہوں تو خزاں میں بھی بہار کا عالم دکھائی دے سکتا ہے۔ یہی نظریہ ہے جس نے فرخ کو نومیدی جاوید سے بچا لیا ہے۔

کیفیت نظر پہ ہے منظر کی دل کشی
پیدا خزاں میں کیجیے رنگِ بہار کو

رنگینی مذاق تصور ترے نثار
کب گوشۂ قفس میں گلستاں نہیں رہا

یہی مذاقِ تصور کی رنگینی ہے جوان کے مزاج کو قنوطیت کے باوجود نشاط و سرمستی اور

جذباتی وفور بخشی ہے اور وہ خوش آہنگی پیدا ہو جاتی ہے جو ان کو رومانی شعرا کے زمرے میں لے آتی ہے۔

موج مے دیکھ کے جذبات میں لہریں اٹھیں
پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

کیفیت بہار کی اللہ رے مستیاں
جو پھول تھا چمن میں وہ ساغر بدست تھا

ساقی کی نگاہوں سے چھلکنے لگی مستی
لبریز ابھی ساغر صہبا نہ ہوا تھا

جامِ گل میں چل رہا ہے بادۂ شبنم کا دور
جوش مستی سے گلستاں ہے خمستانِ بہار

اللہ رے چشم مست کی کیف آفرینیاں
رگ گ میں روح دوڑ رہی ہے سرور کی

کیفیتِ تبسم رنگیں لبوں پہ ہے
یا موج اٹھ رہی ہے شراب طہور کی

ہنگام سیہ مستی رحمت جو سہارا دے
ایمان چمک اٹھے رعنائی عصیاں سے

فرؔخ بنارسی کی شاعری کے اس غمناک رومانی ماحول میں ایک اور خاص بات جو قاری کو شدت سے محسوس ہوتی ہے، ان کی اسرار پرستی ہے۔ اصؔغر کی طرح وہ بھی ماورائیت کے دھندلکوں میں اس طرح ڈھکے چھپے نظر آتے ہیں کہ عصری زندگی کی پرچھائیاں بہت مبہم ہو کر رہ

جاتی ہیں۔ یہاں وہ تخیل پرستی کی اُس دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں ہر شے ایک معمہ لانیحل معلوم ہوتی ہے۔ زندگی ایک حقیقت نیرنگ دکھائی دیتی ہے اور ہستی کا آئینہ ایسے متاع جلوہ سے لبریز نظر آتا ہے جس کی ایک صورت سے ہزاروں صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں بیخودی جمال روئے دوست کی آئینہ دار بن جاتی ہے اور ہوش آنا تمہید وداع جلوہ ثابت ہوتا ہے۔ فرخ کے اس قصر تصور میں عشقِ وحشت آفریں کا حسن حیرت ساز سے اتصال باہمی شورش کونین کا سبب بنتا ہے۔ یہ رنگ ان کی طبیعت پر اتنا گہرا چڑھا ہے کہ ان کے بیشتر کلام پر اس کے چھینٹے نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آئینہ ہستی کا لبریز متاع جلوہ ہے
زندگی کہتے ہیں جس کو اجتماع جلوہ ہے

ایک صورت سے نمایاں ہیں ہزاروں صورتیں
آئینہ خانے میں کیا کیا اختراعِ جلوہ ہے

بیخودی ہے آئینہ دار جمال روئے دوست
ہوش کا آنا ہی تمہید وداعِ جلوہ ہے

ذرہ ذرہ ضوفگن ہے کائنات دہر کا
جس طرف اٹھتی ہیں آنکھیں اجتماع جلوہ ہے

کثرتِ انوار ہے ذوقِ نظر کو اک حجاب
اجتماع جلوہ شرح انقطاعِ جلوہ ہے

قطرۂ شبنم ہے جذب مہر سے بیتاب شوق
عشق کم مایہ خریدار متاعِ جلوہ ہے

اہتمامِ خود نمائی اتنا کیوں اے برق حسن
ہوش کھو دینے کو کافی اک شعاع جلوہ ہے

☆............☆

پردہ کس سے اب نکل آؤ حریم ناز سے
آشنا سارا زمانہ ہو چکا آواز سے
شورشِ کونین ہے اک اتصال باہمی
عشق وحشت آفریں کا حسنِ حیرت ساز سے
تیز رفتار تماشا سست پرواز نظر
کیا توازن ہو مرے انجام کا آغاز سے
ہوش پھر آنے لگا اے مطرب صبح ازل
پھر کوئی نغمہ اسی کیف آفریں آواز سے
ٹوٹنا دل کا تھا اک تمہید بزم انبساط
جاگ اُٹھے نغمے شکست ساز کی آواز سے

☆............☆

بحیثیت مجموعی فرخ کی غزل گوئی کا ماحول بہت پاکیزہ اور رومانی ہے۔ ان کی عشق پیشگی، اسرار پرستی، غمناک رومانیت، فلسفیانہ مزاج، کہیں کہیں جذباتی وفور سے پیدا ہونے والی سرمستی اور خوش آہنگی، عارفانہ انداز میں اخلاقی اور رومانی نکات کی تشریح، صوفیانہ تخلیل پرستی وغیرہ کے امتزاج سے ان کے تغزل کا مجموعی تاثر بہت خوشگوار محسوس ہوتا ہے۔ ان کے انداز بیان کی شعریت اور ندرت، پیچیدہ اور مفصل مضامین کے اظہار کے لیے الفاظ وتراکیب کی

معنی خیز اور نئی بندشیں اور تشبیہات و استعارات میں اجتہاد بھی انھیں اپنے دور کے غزل گویوں میں ایک ممتاز حیثیت بخشتے ہیں۔

فرخ کا ایک مختصر سا دیوان تقریباً چالیس برس پہلے شایع ہوا تھا لیکن ”تجلیاتِ فرخ“ کے یہ جلوے بھی اب تقریباً روپوش ہو چکے ہیں۔ کلامِ فرخ کی اس کم یابی کے پیشِ نظر آخر میں ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام سے ایک مختصر سا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

دل میں ہو کیف تو گلزار بھی میخانہ بنے
جنبشِ موجِ صبا لغزشِ مستانہ بنے
ہے غرض سوزِ محبت سے کسی رنگ میں ہو
دل اگر بن نہ سکے شمع تو پروانہ بنے
قصۂ دار و رسن چھیڑتے جی ڈرتا ہے
بات منہ سے نہ نکل کر کہیں افسانہ بنے
نہیں ممکن کہ مئے عشق سے خالی رہے دل
یہ وہ شیشہ ہے جو ٹوٹے بھی تو پیمانہ بنے
دل کو برباد ہی کرنا ہے تو اس رنگ سے کر
دو جہاں جس میں سما جائیں وہ ویرانہ بنے
جستجو جس کی ہے وہ دل میں ہے محمل میں کہاں
قیس سے کوئی یہ کہہ دے کہ نہ دیوانہ بنے

☆……☆

اک طرف کعبہ ہے اک سمت صنم خانہ ہے
سالکِ راہِ طلب بیچ میں دیوانہ ہے

نیرنگِ خیال لاہور مارچ 1939 بشک
صبح بہارش۔ مرزا عبدالغنی محمد بہارش

حسن پردے میں ہے دل عشق میں دیوانہ ہے
شمع فانوس میں ہے رقص میں دیوانہ ہے

حشر تک خاک کا ہر ذرہ کرے گا فریاد
یہ نہ سمجھو کہ یہیں تک مرا افسانہ ہے

نشہ میں کھلتی ہے ہر عقدۂ مشکل کی گرہ
شرح اسرارِ حقیقت خطِ پیمانہ ہے

مستِ فطرت کو ہے سامانِ خدا ساز نصیب
ساقی صبح کا ہر پھول میں میخانہ ہے

ہے فریب نگہِ چشم تصور فرخ
ورنہ کعبہ ہے حقیقت میں نہ بتخانہ ہے

☆............☆

نہ ہوئی پردہ دری چاک گریبانوں کی
آبرو خاک نے رکھ لی ترے عریانوں کی

چھوٹنے والے ہیں زنداں سے اسیرانِ جنوں
اب چمک جائے گی تقدیر بیابانوں کی

نیند آتی نہیں زنداں میں مجھے وحشت سے
آنکھ لگتی نہیں کیوں میرے نگہبانوں کی

ہیں رہا ہو کے بھی پابند اسیرانِ جنوں
دھجیاں پاؤں سے لپٹی ہیں گریبانوں کی

شاد ہوں وعدۂ فردائے جزا پر فرخؔ
کتنی محدود ہے دنیا مرے ارمانوں کی

☆............☆

شمع کے ساتھ رہا تذکرہ پروانے کا
طول دیکھے کوئی اس مختصر افسانے کا
جو ترے ذوقِ سماعت کو پسند آجائے
بس وہی ٹکڑا ہے حاصل مرے افسانے کا
جس طرف دیکھتا ہے دیکھتا رہ جاتا ہے
کچھ عجب اب تو ہے عالم ترے دیوانے کا
کسی کم ظرف کو دینا نہ شراب اے ساقی
راز میخانے سے باہر نہ ہو میخانے کا
سن لبِ گور سے رودادِ مآل ہستی
آخری ہے یہی ٹکڑا مرے افسانے کا
لامکاں کہتے ہیں فرخؔ جسے دنیا والے
ہے وہ اک چھوٹا سا گوشہ مرے ویرانے کا

☆............☆

چمکی حریم دل میں کرن برق طور کی
جب روشنی رہی نہ چراغِ شعور کی
ہر چند جانتے تھے کہ ملنا محال ہے
پھر بھی تلاش ہم نے تری دور دور کی

ذرہ فروغِ مہر کا آئینہ دار ہے
ہستی مری دلیل ہے تیرے ظہور کی

یہ بھی ہے کوئی سامنے آنا خطا معاف
آنکھوں کے آگے کوند گئی برق طور کی

اللہ رے چشم مست کی کیف آفرینیاں
رگ رگ میں روح دوڑ رہی ہے سرور کی

جلوے جُدا جُدا ہیں مظاہر جُدا جُدا
ہر شان مختلف ہے کرم کے ظہور کی

کیفیت تبسم رنگیں لبوں پہ ہے
یا موج اُٹھ رہی ہے شراب طہور کی

فرٓخ جنوں میں رازِ نشاطِ حیات ہے
پھنسنا نہ کشمکش میں فریب شعور کی

☆..........☆

جذب ہو کر رہ گئیں اُٹھیں جو نظریں سوئے دوست
کس قدر نظارہ پرور ہے جمالِ روئے دوست

اس کی مرگِ نامرادی پر فدا عیشِ حیات
جس کے ماتم میں پریشاں ہو گئے گیسوے دوست

کرتے ہیں طے خامشی سے منزلِ دشوار عشق
آنسوؤں سے کچھ سبق لیں رہروانِ کوئے دوست

بے نیازی التفات ناز پر مایل ہوئی
میری وارستہ مزاجی نے بدل دی خوئے دوست

دین و دنیا کی خبر ہے کچھ نہ اپنا ہوش ہے
بے نیاز ماسوا ہے محوِ حسن روئے دوست

کعبۂ نو کی بِنا ڈالی جبین شوق نے
کردیا آباد سجدوں سے حریمِ کوئے دوست

روح پرور ہے بہارِ جلوہ رنگ چمن
فرؔخ ایک اک پھول سے آتی ہے مجھ کو بوئے دوست

☆…………☆

جب تک گزر آنکھوں میں حیا کا نہ ہوا تھا
فتنہ نگہِ ناز سے برپا نہ ہوا تھا

خود دیتی تھیں پیغامِ محبت وہ نگاہیں
جب تک میرا آغوش طلب وا نہ ہوا تھا

افسانۂ دل بارِ سماعت ہوا اُن کو
پورا ابھی اک حرفِ تمنّا نہ ہوا تھا

ساقی کی نگاہوں سے چھلکنے لگی مستی
لبریز ابھی ساغرِ صہبا نہ ہوا تھا

اس وقت سے میں بادیہ پیمائے جنوں ہوں
مجنوں بھی جب آوارۂ صحرا نہ ہوا تھا

ہر طالب دیدار تھا اک نقش تحیّر
بے پردا ابھی جلوۂ زیبا نہ ہوا تھا

کب زخم نہ تھا دل کا نمک زار تبسم
کب نذرِ ادا خونِ تمنّا نہ ہوا تھا

غربت کی بہاروں کے مزے یاد ہیں فرؔخ
جب رشکِ چمن پاؤں کا چھالا نہ ہوا تھا

☆..........☆

ذوقِ آزار پسندی کا یہ حاصل ٹھہرا
جب اٹھا درد جگر میں تو ذرا دل ٹھہرا

اپنے مرکز سے بہت دور ہوا جاتا ہوں
اب کہیں جلد مجھے اے تپشِ دل ٹھہرا

یہی کیا کم ہے کہ وہ مجھ پہ جفا کرتے ہیں
شکر کرتا ہوں کہ میں بھی کسی قابل ٹھہرا

نہ رہا ہوش اٹھی جب رُخِ روشن سے نقاب
کچھ نہ حیرت کے سوا دید کا حاصل ٹھہرا

غور سے اپنی حقیقت کو جو دیکھا فرؔخ
اصل ہستی کا میں اک پردۂ حایل ٹھہرا

☆..........☆

قابل دید ہے عالم تری رعنائی کا
آئینے پر ہے گماں چشم تماشائی کا

جلوہ اتنا بھی نہ ہو عام خود آرائی کا
کوئی مرکز نہ رہا چشم تماشائی کا
عمر بھر وضع اسیری کو نبھایا کیسا
پاؤں زنداں سے نہ نکلا ترے سودائی کا
وہ بھی کیا دن تھے زمانے کی نظر پڑتی تھی
کتنا پر کیف تھا منظر میری رسوائی کا
موج مے دیکھ کے جذبات میں لہریں اٹھیں
پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا
ایک سجدے سے غرض ہے کہیں ہو جائے ادا
نہیں پابندِ حرم شوق جبیں سائی کا
حسرت دید یہ ہے اور نہ کچھ آئے نظر
آنکھ ہو اور تماشا تری رعنائی کا
کیا ڈرے موت سے خو کردۂ ہجراں فرؔخ
دوسرا نام ہے وہ بھی غمِ تنہائی کا

☆..........☆

تھا حصولِ آرزو ہی اختتامِ آرزو
زیست کی لذت رہی جب تک خلش کا جوش تھا
میں وہ لذت کشِ ذوق اسیری ہوں کہ اے فرؔخ
اٹھایا سر پر زنداں جب نگہبانوں کو خواب آیا

لرزتا ہے ابھی سے دل مزاجِ یار برہم ہے
یہ عالم ہے تو کیا گزرے گی اظہارِ تمنّا تک
منزل پہ بھی پہنچ کے ہیں سرگرم جستجو
آگے بڑھے ہوئے ہیں بہت رہنما سے ہم
الٰہی اضطراب دل کا آخر حشر کیا ہوگا
جسد میں روح ہے یا کوئی دیوانہ ہے زنداں میں
نشیمن سے بچھڑنے کا وہ عالم اے معاذ اللہ
نگاہیں رہ گئیں اٹھ اٹھ کے سوئے آسماں میری
آؤ آپس میں کریں چاند کے حصے تقسیم
روشنی تم میں رہے داغ مرے دل میں رہے
حشر میں دیکھتے ہی سب مجھے پہچان گئے
طول کھینچا ہے کہاں تک میری رسوائی نے

☆............☆

آفاق بنارسی

منشی غلام حسین خاں آفاق بنارسی فصاحت جنگ جلیل کے چہیتے شاگرد اور اپنے دور کے دُور دُور تک چھپے والے شعرا میں سے تھے۔ بقول امیر بنارسی ''ہندوستان کا شاید ہی کوئی ممتاز گلدستہ ایسا ہوگا جس میں حضرت آفاق مرحوم کا کلام قدر و منزلت سے شایع نہ ہوتا رہا ہو۔'' دو دیوان مرتب فرمائے تھے ''شہرہ آفاق'' اور ''مشہور آفاق'' دونوں پر استاد کی اصلاح موجود تھی۔ ''شہرۂ آفاق'' شاعر کی زندگی میں چھپ گیا تھا لیکن ''مشہور آفاق'' کی اشاعت سے پہلے آفاق کا جامِ حیات لبریز ہو گیا اور اس طرح ''مشہور آفاق'' گوشۂ گمنامی میں مستور ہو کر رہ گیا۔ آفاق اگرچہ بنارس دربار کے بے حد مصروف ملازمین میں سے تھے اس کے باوجود انھوں نے اپنی سرکاری مصروفیات سے وقت نکال کر اپنی زندگی کا ایک وافر حصہ علمی و ادبی سرگرمیوں میں بسر کیا۔ تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے تھے۔ ان کی پانچ تالیفات اور تین تصانیف کا ذکر ان کے بھانجے حضرت امیر بنارسی نے ''معین الشعرا'' کے مقدمے میں کیا ہے۔ یہ کتاب جس کا مکمل نام ''معین الادب معروف بہ معین الشعرا'' ہے۔ آفاق بنارسی کا ایک قابل ذکر کارنامہ ہے۔

غلام حسین خاں آفاق کو بے تکلف احباب نہ غلام حسین کہتے تھے اور نہ آفاق۔ اُن کے بائیں ہاتھ میں ایک خفیف نشان چھٹی انگلی کا تھا۔ اس وجہ سے وہ چھنگا خاں کے نام سے

پکارے جاتے تھے۔ ایک کمسن غزل کے مقطع میں منہ سے بے ساختہ نکل گیا ہے کہ

عبث تقدیر کا شکوہ ہے چھنگا
دکھائے جو تمہیں تقدیر دیکھو

آفاق کے بزرگ دہلی سے بنارس آئے تھے۔ محلّہ کبیر چورہ میں ان کے دادا منشی غلام نبی خاں کا جنم ہوا۔ والد مولوی میاں جان خاں اپنے باپ کے انتقال کے بعد گنگا پار رام نگر میں بس گئے تھے۔ ان کے ماموں امیر علی خاں مہاراجہ بنارس کے ملازمین میں سے تھے۔ ماموں کی وفات کے بعد بھانجے کو باستحقاق وراثت دربار بنارس کے ملازمین میں شامل کرلیا گیا۔ اگرچہ محلّہ کبیر چورہ میں ان کے عزیز بہت دیر تک مقیم رہے لیکن مولوی میاں جان خاں اب ہمیشہ کے لیے بنارس اسٹیٹ کی راجدھانی رام نگر میں سکونت پذیر ہوگئے۔ یہیں روز پنج شنبہ ۱۴ر جمادی الثانی ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۸ء) کو آفاق پیدا ہوئے۔ مناسب تعلیم کے بعد ۱۸۸۹ء میں وہ بھی اپنے بزرگوں کی طرح مہاراجہ بنارس کے نمک خوار ہوگئے۔ لیاقت اور حسن تدبر نے آفاق کو اپنے معاصرین میں بہت جلد ممتاز کردیا۔ ۱۸۹۲ء میں سرکارِ عالیہ بنارس کی جانب سے انھیں ریاست کی ایک تحصیل کا مختار عام بنادیا گیا۔ ۱۹۱۱ء تک وہ ریاست کے مختلف عہدوں پر سرفراز رہے اور ۱۹۱۲ء میں قلعہ رام نگر کے اکاؤنٹنٹ جنرل آفس میں جانچ نویس مقرر ہوئے۔ یہاں ان کی ماہانہ تنخواہ مبلغ چالیس روپیہ تھی۔ پنشن پانے کے ٹھیک ایک سال بعد ۶ر اکتوبر ۱۹۳۴ء کو رحلت فرمائی۔

آفاق کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ ان کے دو صاحبزادوں کی موت تھی۔ چھوٹے بیٹے تجمل حسین خاں کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ آفاق نے شدت غم سے تمام ادبی سرگرمیوں کو ترک کردیا اور اس سانحہ کے بارہ سال بعد تک کوئی شعر نہیں کہا۔ ابھی یہ غم فراموش نہ ہونے پایا تھا کہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو دوسرے نوجوان بیٹے تفضّل حسین خاں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

یہ صاحبزادہ اردو، ہندی، فارسی، عربی اور انگریزی میں معقول استعداد رکھتا تھا۔ یہ داغِ مفارقت آفاقؔ کے لیے غم جانکاہ ثابت ہوا۔ اس کا اثر ان کی شاعری پر بھی جابجا نظر آتا ہے۔

غمِ فرزند نے آفاقؔ دل کو کر دیا مردہ
غزل خوانی نہیں ہے یہ ہماری نوحہ خوانی ہے

آفاقؔ بڑے خوش اخلاق بزرگ تھے۔ دوست نوازی اور مہمان نوازی میں وہ اگلے وقتوں کی یادگار کہلاتے تھے۔ ان کی خاکساری اور سادگی کو لوگ احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنے معاصرین سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ مرزا فائزؔ بنارسی کی طرح وہ بھی خاندان مصحفیؔ کے شاگرد تھے لیکن فائزؔ کی عزت اپنے استاد کی طرح کرتے تھے۔ فائزؔ کی بزرگی کا اعتراف اپنے کلام میں بھی کیا ہے۔

لکھ چکے ہیں اس طرح میں حضرت فائزؔ غزل
کیا کوئی باندھے گا آفاقؔ اس سے بہتر کاسی

حضرات مہرؔ گوالیاری، محشرؔ لکھنوی، نوحؔ ناروی، احسنؔ مارہروی، ریاضؔ خیرآبادی، رحمتؔ بنارسی، صفدرؔ مرزاپوری وغیرہ آفاقؔ کے دوستوں مداحوں اور قدردانوں میں سے تھے اور انھیں جلیلؔ مانک پوری کے برگزیدہ شاگردوں میں تسلیم کرتے تھے۔ آفاقؔ کے شاگردوں میں اشرفؔ بنارسی، اشفاقؔ بنارسی، منشی جالپا پرشاد جالپاؔ، حسرتؔ بنارسی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آفاقؔ کو اوائل عمر ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ ابتدا میں مولوی منگل خاں مرحوم سے اصلاح لی۔ بعد ازاں مولوی اللہ رکھے خاں مشتاقؔ فیض آبادی سے ملاقات ہوئی جو حضرت مونسؔ لکھنوی کے شاگرد تھے اور فن عروض کے ماہر تھے۔ مشتاقؔ کی صحبت کے فیض سے ان کا ادبی ذوق اور بھی نکھر گیا۔ آفاقؔ تخلص مشتاقؔ نے تجویز کیا۔ حضرت جلیلؔ سے تلمذ کے سلسلے میں

امیر بنارسی، ’’مُعین الشعرا‘‘ کے دیباچے میں لکھتے ہیں ’’حضرت آفاق کی شروع ہی سے آرزو تھی کہ براہ راست یا کسی واسطہ سے حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل کریں لیکن آپ کی اس آرزو کے پورا ہونے کے پہلے ہی حضرت امیر مینائی کا جام حیات لبریز ہوگیا۔ جب قبلہ جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل مدظلہ العالی حضرت امیر مینائی کے جانشین ہوئے تو آفاق مرحوم نے اپنی دیرینہ آرزو کے مطابق حضرت جلیل مدظلہٗ کے تلمذ کا شرف حاصل کیا۔ حضرت جلیل کے فیض اصلاح نے آفاق کو آفاق میں مشہور کردیا۔ [1] جلیل سے کسب فیض کا اعتراف آفاق نے اپنے متعدد اشعار میں کیا ہے۔

کجا آفاق ناچیز اور کجا آفاق میں شہرت
جلیل القدر کا صدقہ ہے ان کی مہربانی ہے

آفاق فیض ہے یہ جناب جلیل کا
گلدستے میں غزل مری چوٹی ہے طور کی

زمانہ کہتا ہے آفاق ہی پہ کیا موقوف
جلیل مثل تمہارا کوئی جہاں میں نہیں

آفاق کی علمی اور ادبی تخلیقات و تالیفات میں درج ذیل کتابوں اور رسالوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) شہرۂ آفاق، (۲) مشہور آفاق، (۳) تذکرہ حزیں، (۴) الاختلاف، (۵) ماتم تفضّل حسین، (۶) سفرنامہ اجمیر، (۷) ریاض التحقیق، (۸) معین الشعرا۔

پہلا دیوان ’’شہرۂ آفاق‘‘ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا، دوسرا دیوان ’’مشہور آفاق‘‘

---

[1] دیباچہ ’’معین الشعرا‘‘ صفحہ: ب، ج

انقلاب زمانہ کی نذر ہوا۔ ''تذکرہ حزیںؔ'' ایک مختصر رسالہ شیخ علی حزیں اصفہانی کے حالات زندگی پر مشتمل لکھنؤ کے رسالہ ''الناظر'' میں اشاعت پذیر ہوا۔ ''الاختلاف'' میرٹھ کے ایک ممتاز گلدستہ ''جلوۂ یار'' میں شائع ہوا۔ اس رسالہ میں ان الفاظ سے بحث کی گئی ہے جن کی تذکیرو تانیث کے بارے میں دہلی اور لکھنؤ میں اختلاف ہے۔ سند کے طور پر مختلف شعرائے کرام کا کلام پیش کیا گیا ہے۔ ''ماتم تفضّل حسین'' ان قطعات و رباعیات و منظومات کا مجموعہ ہے جو ممتاز شعرا نے تفضّل حسین کی وفات پر لکھے تھے۔

سفرنامہ اجمیر میں آفاقؔ نے اجمیر شریف کے سفر کے حالات و واقعات اور وہاں کی زیارت گاہوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ رسالہ چھپ نہیں سکا۔ ''ریاض التحقیق'' کا دوسرا نام ''حدیقۃ الصفا'' ہے۔ اس تاریخ اسلام میں آفاقؔ نے خاندان بنوامیہ اور خاندان بنی ہاشم کے نفاق پر مختلف کتب تاریخ مثلاً روضۃ الصفا، روضۃ الاحباب، تاریخ طبری ترجمہ ابن خلدون، قصص العجائب وغیرہ سے استفادہ کر کے مختلف حالات پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ کتاب بھی چھپ نہیں سکی۔

معین الاداب معروف بہ معین الشعرا اردو زبان کے مروجہ الفاظ کا ایک ایسا لغت ہے جس میں الفاظ کے معانی کے علاوہ ہر لفظ کے اعدادِ ملفوظی درج کر دیے گئے ہیں اور زیر بحث لفظ کے بارے میں یہ بھی درج ہے کہ وہ کس زبان کا ہے اور مذکر ہے یا مونث۔ الفاظ کی تذکیرو تانیث کی وضاحت کے لیے اساتذہ ماضی و حال کے کلام سے سند بھی پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب صدیق بک ڈپو، لکھنؤ نے شایع کی تھی۔ آفاقؔ کے استاد جلیلؔ نے اس مصرع سے تاریخ طباعت نکالی ہے۔

''یہ تالیف بھی نسخۂ کیمیا بھی''

آفاقؔ کو آخری ایام میں زندگی کا بھروسہ نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اپنی وفات کی یہ تاریخ

اپنے قلم سے لکھ کر رکھ دی تھی۔

تاب وتواں کے بدلے ہے ضعف وناتوانی
آفاق شاعری کو دو آخری نشانی

آثار کہہ رہے ہیں حالت بتا رہی ہے
تاریخ موت ہوگی ''تاریخ زندگانی''

؁۱۳۵۳ ھجری

اپنے دیوان ''شہرہ آفاق'' میں آفاق بنارسی نے اپنے آپ کو ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے مرتبہ اس دیوان میں ۲۰۵ غزلیں، دو قصیدے اور چند رباعیات وقطعات ومفردات شامل ہیں۔ غزلیات اکثر طرحی زمینوں میں کہی گئی ہیں یا دوستوں کی فرمائش کی تعمیل وتکمیل میں لکھی گئی ہیں۔

کہیں افکار میں فکر سخن آفاق ہوتی ہے
فقط تعمیل کر دی ہے یہ ہم نے حکم افسر کی

ہے فرمائش وسیم مہرباں کی
غزل آفاق لکھنا جی لگا کے

گلچیں کی بزم شعر میں یہ ٹوٹے پھوٹے شعر
لکھے ہیں انتشار میں آفاق زار نے

لکھے جناب عیش کی خاطر سے چند شعر
آفاق ورنہ ان دنوں فرصت ذرا نہیں

اساتذہ کی زمینوں میں استادانہ کرتب دکھانے کے علاوہ آفاق نے اپنے قدامت

پسند معاصرین کی تقلید اور اپنے دیوان کی تکمیل میں ''خنجر کاغذ''، ''مسطر کاغذ'' اور ''پھولوں کی چھڑی آنچ ہوتی ہے کڑی آنچ'' وغیرہ کی قسم کے اشعار بھی بکثرت گڑھے ہیں۔ اصل میں وہ اسی ماحول کے شعر ساز ہیں جس میں مستری لوگ ردیف وقافیہ کے گارے چونے سے شعر کی عمارت اٹھاتے ہیں۔ موضوعات شعری نہایت آسان اور عام فہم رہتے ہیں۔ معشوق کی شوخی ہر شاعر کے گلے پر خنجر پھیر دیتی ہے۔ اس کی زلف معنبر کی ہوا ہندوستان سے ملکِ ختن تک کو معطر کر رہی ہے۔ اس ستمگر کی پلکوں کا خیال تک عاشق کے دل میں رہ رہ کر نشتر لگاتا ہے۔ مشق تصور سے شاعر ہر دم وصل معشوق کا لطف اٹھاتا ہے۔ سر فروشوں کی بھیڑ میں وہ شوخ جب تیغ نظر کا جوہر دکھاتا ہوا نکلتا ہے تو کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اردو شاعری کے اسٹیج کے اس گوشے میں ردیف و قافیہ تو تھرکتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن شاعر ہمیشہ نظر سے اوجھل رہتا ہے۔

ہردم آنکھوں کا دکھانا نہیں بہتر اے شوخ
پھیر دے لا کے گلے پر مرے خنجر اے شوخ

کھول دے تو جو کبھی زلف معنبر اے شوخ
ہند سے ملک ختن تک ہو معطر اے شوخ

ہو رہا ہے دل بیتاب مرا دیوانہ
پڑھ کے تو پھونک گیا کون سا منتر اے شوخ

تجھ سے کیا کم ہے ستمگر ترے مژگاں کا خیال
دل میں آ آ کے چبھو دیتا ہے نشتر اے شوخ

توڑ کر دلِ عشاق نہ بن خانہ بدوش
یاد رکھ تیرے ہی رہنے کا ہے یہ گھر اے شوخ

وصل کا لطف مجھے مشق تصور نے دیا
اب جدا تجھ سے نہیں رہتا ہوں دم بھرا ے شوخ

دیکھوں ہوتا نہیں کب تک ترا دیدار نصیب
اب تو بیٹھا ہوں میں جم کر ترے در پرا ے شوخ

سرفروشوں کی ہے اک بھیڑ گلی میں تیری
ان کو دکھلا دے ذرا تیغ کا جوہرا ے شوخ

دیکھنا مدِ نظر ہو جو کلامِ آفاق
''پاٹانالہ''[1] سے منگا پرچہ ''منظر''[2] اے شوخ

فی گھنٹہ پچاس شعر والی غزلیں آفاق کے دیوان میں بہت ہیں۔ ان بحروں میں ان کی سطحیت اور زیادہ ابھرتی ہے۔ کہیں کہیں غوطہ زن بھی ہوتے ہیں تو درِ خوش آب کی بجائے ایسے سنگریزے اٹھالاتے ہیں جن کو دوسروں نے بارہا مصرف میں لاکر اب بے کار سمجھ کر پھینک دیا ہے۔ آفاق کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ انھیں بھلے بُرے میں امتیاز نہیں۔ قافیہ ان سے جو چاہے کہلوالے۔ ان کے لیے بلندی پستی سب ایک ہے۔ ان کی غزل ایک ایسا اصطبل ہے جس میں گدھوں کی بھیڑ میں کہیں کہیں کوئی گھوڑا بھی نظر آتا ہے تو وہ بھی گدھوں میں شمار ہوجاتا ہے۔

بڑے مزے کی کہانی ہے مہرباں میری
سنو تو مجھ سے کسی روز داستاں میری

بڑھائی ضبط نے یہ سوزشِ نہاں میری
کہ خاک ہوگئیں جل جل کے ہڈیاں میری

---

[1] پاٹانالہ۔ لکھنؤ کے ایک محلّہ کا نام ہے۔ [2] منظر۔ لکھنؤ کا ایک ماہنامہ رسالہ

سنائے کس کو کوئی حالتِ نہاں میری
کبھی وہ سنتے بھی ہیں دل سے داستاں میری
یہ میرا ذمہ جو دل آپ کا نہ ہل جائے
میری زبان سے سنیئے تو داستاں میری
اثر کیا ہے جو رگ رگ میں سوز الفت نے
برنگ شمع سلگتی ہیں ہڈیاں میری
مچل مچل کے یہ آتی ہے کم سنوں ہی پر
شباب کھو کے طبیعت ہوئی جواں میری
تمہاری سُرمگیں آنکھوں نے جو غضب ڈھایا
بیان کر نہیں سکتی اُسے زباں میری
میں عشق موئے میانِ بتاں کا محرم ہوں
ہوں ہلکی ہلکی سی حداد بیڑیاں میری
وہ بزم غیر سے بھی اُٹھ گئے خفا ہوکر
جو گفتگو بھی کبھی آ گئی وہاں میری
وطن میں کوئی تمہیں یاد کر رہا ہے آج
یہ آ کے کہتی ہیں غربت میں ہچکیاں میری
کہیں گیا نہ بنارس کو چھوڑ کر آفاق
مگر پہنچ گئی شہرت کہاں کہاں میری

آفاق مہاراجہ بنارس کے نمک خوار تھے۔ بنارس ان کا آبائی وطن تھا۔ وہ اپنے آپ کو ملازم قدیم دربار بنارس لکھنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ مہاراجہ پربھو نارائن سنگھ کی مدح میں

قصیدہ بھی لکھا ہے۔ جا بجا مقطعوں میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن جب کہیں ضرورت پڑتی ہے تو بنارس کو محض اس لیے برا کہتے ہیں اور اس سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں کہ اس سے ان کی شاعری میں رعایتِ لفظی کی خوبی پیدا ہو جائے۔ یہ شعر جھوٹ اور بناوٹ کی بہترین مثال ہیں۔

آفاق ستایا ہے بنارس میں بتوں نے
اللہ نکالے ہمیں اب رام نگر سے

چھوٹتا اب نظر آتا ہے بنارس مجھ سے
ہے بتوں نے بہت آفاق ستایا مجھ کو

یہ اشعار محض اس لیے کہے گئے ہیں کہ شاعر کو بنارس بتوں اور اللہ میں رعایت لفظی دکھانا منظور تھی۔ یہ بناوٹ آفاق کے مزاج میں ایسی رچ بس گئی ہے کہ کہیں اگر وہ سچ بھی بولنا چاہیں تو وہ بھی تصنع معلوم ہوتا ہے۔

نہیں ہے ترا کوئی ہمسر بنارس میں
تو ہے ہند میں سب سے بہتر بنارس

ملا تجھ کو پربھو نرائن سا والی
نصیبہ ہے ترا سکندر بنارس

آفاق کے مندرجہ ذیل اشعار ایسے ہیں جن کو شاید اگلے وقتوں کے لوگ دلچسپی سے سنتے ہوں گے۔

ہٹو سونے بھی دو چھیڑو نہ ہم کو نیند آئی ہے
یہ کہہ کر ہائے ان کا منہ چھپا لینا دلائی سے

دربان کو بھی اپنے یہ سکھا رکھا ہے اس نے
جب جاتا ہوں کہتا ہے ابھی نکلے ہیں گھر سے

منہ ڈوپٹہ میں چھا کر ناز سے
ذبح کرتے ہیں نئے انداز سے

صاف کھلتا نہیں دل ہے مرا یا ہے کچھ اور؟
ہیں جو آنچل سے وہ ہر بار چھپاتے جاتے

طالبِ شربت دیدار نہ ہو اے آفاق
سنکھیا اس میں حسینوں نے ملا رکھی ہے

تم جیب میں رکھے ہو گھڑی جس کو بنا کر
دیکھوں کہیں میرا دلِ مضطر تو نہیں ہے

وصل میں لپٹا جو میں بولے بگڑ کر ناز سے
نچلے بیٹھو اک ذرا یہ بھی کوئی انداز ہے

ہاتھا پائی سے وہ گھبرا کے یہ فرماتے ہیں
وصل سے تھا ہمیں انکار اسی ڈر سے پہلے

ابھاراان کو ہم نے آج اے آفاق یہ کہہ کر
بہارِ گل ہے جوبن پر چلو سیر گلستاں کو

باہیں جو ڈالیں میں نے گلے میں شبِ وصال
بولے کہ چل تو میرے گلے کا نہ ہار ہو

اس قسم کے اشعار ظاہر ہے کہ زندگی اور اس کے مظاہر سے نسبت رکھنے کی بجائے ذہنی

عیاشی کے مظہر ہیں۔ امانت لکھنوی کے دور میں تو ان کی قدر و قیمت ہوسکتی تھی لیکن اقبال، جوش، چکبست اور فراق کے زمانے میں ان کی اہمیت کیا ہوسکتی ہے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ آفاق کا کلام عام طور پر تخیل اور جذبے سے خالی ہے اور تک بندی، قافیہ پیمائی اور سستے جذبات کی تسکین کے سامان سے پر ہے۔ اُن کا تمام تر سامایۂ نشاط امید وصل ہے اور انتہائی مایوسی کا باعث غم ہجر ہے۔ اگر یہ جذبات بھی سچے ہوتے تو جذبے کی شدت اور فکر کی روشنی سے ان کا کلام موثر ہوجاتا لیکن چونکہ استاد لوگ اس قسم کی شاعری سے بے نیاز ہوتے ہیں اس لیے شاعری بھی ان سے بے نیاز ہوجاتی ہے۔ آفاق کا سلسلہ تلمذ جلیل، امیر اور اسیر سے ہوتا ہوا مصحفی تک پہنچتا ہے۔ خاندان مصحفی کا ایک فرد ہونا اُن کے لیے باعث افتخار ہے۔ فصاحت جنگ جلیل سے نسبت نے انھیں اپنے معاصرین کے لیے قابل رشک چیز بنادیا لیکن خود انھوں نے اپنی پیدائشی موزونیت پر اپنی محنت اور لگن سے کیا اضافے کیے اس کا پتہ بہت کم چلتا ہے۔ عروض، صناعی، لفظی ہیر پھیر اور شاہد بازی کے اس ہنگامے میں آفاق کی تخلیقی شخصیت کہیں نظر نہیں آتی۔ ان کے یہ اشعار نسبتاً گوارا ہیں۔

کیا نظر آئے مری آنکھ میں خود نور نہیں
اس سے میں دور ہوں وہ مجھ سے کبھی دور نہیں

ہائے کمبخت اضطرابِ دل
کہہ دیا اُن سے مدعا دل کا

آتا نہیں جو پردے سے باہر نہ آئے دوست
پردے سے باہر آ تو رہی ہے صدائے دوست

اے مہروش ترے رُخِ روشن کے سامنے
ایسے ہے جیسے دھوپ میں کوئی جلائے شمع

مطلب عدم سے آنے کا اپنے نہ تھا کچھ اور
آئے تھے صرف جامۂ ہستی اتارنے

ممکن نہیں کہ ٹوٹے مرے آنسوؤں کا تار
کیا عہد آپ کا ہے کہ ناپائدار ہے

میں نے کہا جو وعدہ ترا معتبر نہیں
بولا کہ زندگی ہی کا کیا اعتبار ہے

پروا نہیں بگڑا ہے اگر ہم سے زمانہ
آفاقؔ کوئی میرا مقدر تو نہیں ہے

اس قدر بادہ کشوں پر نہ برس اے واعظ
تیرے حصے کی بھی اے مردِ خدا رکھی ہے

طالب مغفرت اللہ سے ہو پیری میں
صبح کے وقت کی مقبول دعا ہوتی ہے

شیخ جی ہیں ابھی کم نوش بہک جاتے ہیں
ایک چلو سے ذرا بھی جو سوا ہوتی ہے

نفس کی آمد وشد پر مدارِ زندگانی ہے
ہماری کشتیِ عمرِ رواں بھی بادبانی ہے

ساتھ جاتی ہے نہ دولت نہ ہنر جاتا ہے
وہی جاتا ہے بشر جو یہاں کر جاتا ہے

ہماری توبہ مروت سے ٹوٹ جاتی ہے
جب اشکبار یہ ابرِ بہار ہوتا ہے

گھٹائیں کہتی ہیں آفاق مجھ سے آ آ کر
کہ میکدے میں ترا انتظار ہوتا ہے

ڈر سے میں کنج لحد میں جو چھپا ہوں جا کر
ڈھونڈتی پھرتی ہے مجھ کو شبِ فرقت میری

آفاق تم نے کچھ نہ جوانی کی قدر کی
اب کھو کے ڈھونڈتے ہو کہ وہ دن کدھر گئے

شاہوں سے پوچھتی ہے اداسی مزار کی
وہ شان وہ شکوہ وہ شوکت کہاں ہے اب

مہینوں سے خبر دل ربا نہیں آتی
صبا بھی بھول گئی رات نہیں آتی

☆............☆

بلند اڑ کے زمیں سے غبار ہوتا ہے
جو مٹ چکے ہیں انھیں کا وقار ہوتا ہے

جو داغِ عشق سے دل داغدار ہوتا ہے
وہ بعدِ مرگ چراغِ مزار ہوتا ہے

مقابل آکے جو ابرِ بہار ہوتا ہے
تو چشمِ تر سے مری شرمسار ہوتا ہے

پھری ہوئی تری آنکھیں نظر جب آتی ہیں
خیالِ گردشِ لیل و نہار ہوتا ہے

کبھی ٹھہرتے نہ عہدِ شباب کو دیکھا
ہوا کے گھوڑے پہ گویا سوار ہوتا ہے
یہ کیسے کہہ دیں کہ رہتے ہیں ہجر میں تنہا
ہمارے ساتھ غمِ انتظار ہوتا ہے

☆............☆

اس شوخ کی محفل میں نہ پایا گذر اب تک
تقدیر ہی اپنی نہ ہوئی راہبر اب تک
بالوں کی سیاہی پہ سفیدی نظر آئی
لیکن شبِ فرقت کی نہ آئی سحر اب تک
ماتم کی صدا آتی ہے سینے سے ہمارے
ہے غم میں جوانی کے یہ دل نوحہ گر اب تک
تاریکیٔ مرقد سے ہوا مجھ کو یہ روشن
باقی ہے سیہ بختی کا میری اثر اب تک
کل ساتھ تھے جو دوست گئے آج کدھر وہ
معلوم ہوئی کچھ نہ کسی کی خبر اب تک
کیسے ہیں کڑے کوس رہِ ملکِ عدم کے
ہم تھک گئے لیکن نہ ہوا طے سفر اب تک
باقی نہ رہی رات سحر ہوگئی آفاقؔ
تم خواب سے غفلت کے نہ چونکے مگر اب تک

☆............☆

دم رفتار یہ پازیب صدا دیتی ہے
میری جھنکار قیامت کو اٹھا دیتی ہے
ایسی ڈوبی ہے ابھارے سے ابھرتی ہی نہیں
چھینٹے کیا کیا مری توبہ کو گھٹا دیتی ہے
نظر آجاتی ہے جب چاندسی صورت ان کی
میری حیرت مجھے دیوانہ بنادیتی ہے
حرص دنیا کی بھی وہ ہے کہ الٰہی توبہ
ہوش مندوں کو بھی دیوانہ بنادیتی ہے
کس قیامت کی تری چال ہے اے فتنۂ حشر
دم میں سوتے ہوئے فتنوں کو جگادیتی ہے
یاد اچھی نہیں ان شعلہ رخوں کی آفاقؔ
خرمنِ عقل میں یہ آگ لگادیتی ہے

☆..........☆

ہر کسی کو اپنا دشمن جان کر
سخت نادانی ہے کرنا احتراز
یا کہ بے سمجھے سمجھ کر سب کو دوست
بیوقوفی ہے جو کہہ دے دل کا راز
ایک سے ہوتے نہیں دنیا میں سب
دل شکن ہیں سب نہ سب ہیں دلنواز
ہے اگر آفاقؔ کچھ عقل و شعور
دوست اور دشمن میں کرلے امتیاز

ریاضؔ بنارسی

سید ریاض علی ریاضؔ بنارسی بڑی شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک تھے لیکن فکر دنیا سے زیادہ انھیں فکر عقبیٰ نے مصروف رکھا۔ مختلف اصناف سخن میں وہ شعریت اور غنائیت کی روح کو تبسم کرنے کی تخلیقی قوت رکھتے تھے لیکن انھوں نے اپنی ادبی سرگرمیوں کو زیادہ تر وہیں تک محدود رکھا جہاں تک ان کی دینی معتقدات کی وسعت نے اجازت دی۔ ان کی تاریخی معلومات بہت اچھی تھیں، خاص طور پر تاریخ اسلام ان کا محبوب موضوع تھا۔ اسی لگن نے ان سے حضرت علی بن ابی طالب کی سوانح عمری ''الکرار'' اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی حیات ''شہید اعظم'' کے عنوان سے لکھوائی۔ اپنے معاصرین میں صاحب امتیاز ہونے کا فخر انھیں اس لیے بھی حاصل تھا کہ ان کے علم و فضل نے ان کو ایک فصیح مقرر کی ساری خوبیاں عطا کر رکھی تھیں۔ محفلِ احباب میں وہ صاحب صدر سمجھے جاتے تھے اور محفل نور میں صاحب منبر۔ ریاضؔ کے بزرگ اصفہان سے آئے تھے لیکن اپنی خاندانی وجاہت اور علمی وقار کی بدولت اودھ کے برگزیدہ خاندانوں سے ان کا پیوند ہوا۔ جد امجد میر نار علی بنارس کے مشہور محلّہ چاہ مہماں میں ایک مسجد اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ انھی میر صاحب کی ہمشیرہ کا عقد میر انیسؔ کے چھوٹے بھائی میر نواب صاحب مونسؔ سے ہوا تھا۔ میر مونسؔ مرحوم کا بنارس میں آنا جانا اسی سبب سے تھا۔

ریاضؔ کا سال ولادت ۱۸۸۰ء ہے۔ ان کے والد میر فدا علی کا انتقال ۱۸۸۹ء میں

ہوا اور اس کے بعد وہ چار سال تک اپنے دادا کے زیر سایہ تعلیم پاتے رہے۔ فارسی کی درسی کتب ختم کرنے کے بعد ریاضؔ نے بنگالی ٹولہ ہائی اسکول بنارس سے انٹرنس کا امتحان پاس کرلیا اور بنارس ہی میں کمشنر کی پیشکاری کو اپنا ذریعہ معاش قرار دیا۔ ریاضؔ دبلے پتلے چھریرے بدن کے بڑے نفاست پسند اور کم گو انسان تھے۔ زود آشنائی ان کی طبیعت میں نہیں تھی۔ اسی لیے کچھ لوگ ان کو مغرور سمجھتے تھے۔ مناظر فطرت سے لطف اندوز ہونے کا بہت شوق تھا۔ اکثر سیر وتفریح کے لیے نکل جاتے۔ ان کے کلام میں قدرتی نظاروں کے جلوے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ مطالعہ بہت سنجیدگی سے کرتے اور اکثر کتابوں کی دنیا میں کھوئے رہتے۔ انھیں قریب سے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ریاضؔ ادبی دیانت داری کے جی جان سے قایل تھے۔ دوسروں کے علم وفضل کو تسلیم کرنے میں وہ بہت مُنصف مزاجی سے کام لیتے تھے۔ شاید انصاف پسندی کی اسی خوبی کے باعث اہل بنارس کے ہر طبقے میں ان کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ مشاعروں میں مقاصدوں میں ادبی نشستوں میں لوگ ہمیشہ انھیں سرآنکھوں پر بٹھاتے تھے اور ان کا کلام منظوم ومنثور سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ ریاضؔ کی چائے نوشی بھی ایک قابلِ ذکر عادت ہے۔ خلوت ہو یا جلوت ریاض اس آتش پر رنگ سے اپنی پیاس برابر بجھاتے رہتے۔ منبر پر تقریر کے لیے تشریف فرمائیں، چائے کی پیالی بغل میں رکھی ہے۔ ادھر تقریر کا دور چل رہا ہے ادھر چائے کا۔

حضرات فرخؔ بنارسی، نسیم بنارسی اور محشرؔ بنارسی ریاضؔ کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ اکثر محفلیں منعقد ہوتیں۔ شعر خوانی علم وادب کو موضوع بنایا جاتا اور بعد ازاں گنگا میں کشتی کی سیر یا راج گھاٹ کے پرانے قلعے میں تفریح کے پروگرام بنتے۔ ہوش کی آنکھیں کھولنے کے ساتھ ہی ریاضؔ کو شعر وشاعری سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ خواجہ نعیم اللہ معروف بہ خواجہ بنو صاحب بنارس کے مشہور تحت اللفظ خواں بزرگ تھے۔ ریاضؔ کے جد امجد جب خواجہ

صاحب کی مجالس میں شرکت کے لیے تشریف لے جاتے تو ریاضؔ کو بھی اپنے ہمراہ لے جاتے۔ خواجہ صاحب کے مرثیے سن سن کر ریاضؔ کے دل میں بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان کی شاعری کی ابتدا مرثیہ گوئی سے ہوئی اور انتہا قصیدہ سازی پر۔ اس فن میں ان کی رہنمائی کے فرائض مرزا محمد حسن فائزؔ بنارسی نے انجام دیے۔

ریاضؔ کی منثور تالیفات میں ''کیا الہام و وحی ممکن ہے؟'' اور ''مشاہیر عالم اور حسین'' غیر مطبوعہ ہیں۔ ''حیات حضرت فاطمہ زہرا'' الجواد بنارس میں بالاقساط شایع ہو چکی ہے۔ ان کے اوراق پریشاں سے ''تاریخ عزاداری'' کو مرتب کرنے کا دقت طلب کام پروفیسر بدرالحسن صاحب عابدی بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے انجام دے رہے ہیں۔ ریاضؔ غزل بھی کہتے تھے اور قصیدہ بھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے قصاید میں ان کی غزلوں سے زیادہ انفرادیت ہے۔ ان کا مجموعہ کلام اُن کے نواسے سید ریاضؔ باقر پاکستان لے گئے تھے۔ بڑی دوڑ دھوپ سے جو سرمایہ راقم الحروف کے ڈاکٹر بدرالحسن صاحب عابدی سے مستعار لیا ہے وہ تبرکاً یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ ریاضؔ کے زیرِ نظر قصیدہ کی تشبیب سے اندازہ ہوگا کہ شاعر نے کیسے بانکپن سے شاہدِ فطرت کے رُخ سے نقاب اٹھایا ہے۔

صبحِ کاذب کا ہوا جانب دریا جو گزر
سامنے معرفت حق کا کھُلا تھا دفتر
اک طرف سبزۂ خوابیدہ تھا اور ایک طرف
دور تک آب مصفا کی بچھی تھی چادر
فرشِ دریا پہ وہ لہروں کی سبک رفتاری
جس طرح چاند سے چہرے پہ تبسم کا گزر

کبھی موجوں کی روانی سے خوش اوقاتی میں
مچھلیوں کا وہ تڑپ کو نکل آنا باہر
رنگ پانی کا وہ گہرائی سے نیلا نیلا
صاف ایسا کہ نظر آئے زمین کا کنکر
صاف بالو پہ وہ گزرے ہوئے پانی کا نشاں
جیسے آنسو کا اثر پھول سے رخساروں پر
بزمِ قدرت میں چمکتی ہیں کہیں قندیلیں
آسماں صاف ہے ایسا کہ نہ میلی ہو نظر
چرخِ نیلی میں کہیں ڈوب رہے ہیں تارے
کوئی چمکا تو کوئی کانپ رہا ہے تھر تھر
عکس پانی میں چمکتے ہوئے سیاروں کا
شان صانع کی ہے یا غیر مرتب منظر

ریاضؔ مناظر قدرت کے بہت اچھے مصور ہیں۔ منظر کشی ان کو بہت پسند بھی ہے۔ اکثر قصاید کی تشبیب میں وہ صحیفۂ فطرت کے اوراق بڑی دلکشی سے اُلٹتے نظر آتے ہیں۔ لطیف تشبیہات ان کے محاکاتی انداز کو اور بھی زیادہ نکھار دیتی ہیں۔ یہ تشبیہات اتنی پیچیدہ یا بھاری بھرکم نہیں ہوتیں کہ اپنے آپ میں ایک مقصد بن کر رہ جائیں اور پڑھنے والے کا ذہن منظر کی بجائے تشبیہ میں اُلجھ کر یا دب کر رہ جائے۔ حضرت محشرؔ بنارسی کی طرح ریاضؔ بھی شاہدِ فطرت کے عاشق ہیں لیکن اس عشق میں متانت کو بہت کچھ دخل ہے۔ وہ فطرت کے شیدائی اور کامیاب عکاس ضرور ہیں لیکن اس محبوب سے ہم آغوشی کا انھیں وہ افتخار حاصل نہیں جو محشرؔ کو نصیب ہے۔ ریاضؔ قدرتی مناظر اور چرندوں پرندوں کو پیش کر کے مفید اخلاقی نتائج بھی مرتب کرتے ہیں،

ان کا یہ اندازِ فکر ان کو حالی، آزاد، اسمٰعیل اور سرور جہان آبادی کا ہمنوا بنا دیتا ہے۔ ایک قصیدے میں شام کا منظر پیش کر کے پرندوں کی کیفیت اور آفتاب کے زوال سے چند اخلاقی نتائج یوں اخذ کیے ہیں۔

شام کی دھوم مچادی جو ابابیلوں نے
بھنبھناتے ہوئے پھولوں سے اُٹھ آئے زنبور
کوئی دیکھے تو ذرا ان کا بسیرا لینا
اڑتے منڈلاتے نشیمن کی طرف آئے طیور
الٹے سیدھے کبھی آ آ کے چلے جاتے ہیں
گھرے ڈوبے جو ہوا دور کا جانا منظور
تاجِ قیصر ہو تو منقار سے یہ مس نہ کریں
پنجے ٹیکیں نہ بچھا بھی ہو جو تختِ فغفور
ان میں طاؤس خرامی ہے نوا سنجی ہے
نہ فضا تنگ انھیں ہے نہ تصنع کا شعور
شاخِ سرسبز پہ کس شان سے جا بیٹھے ہیں
سینے تانے ہوئے گردن کو اٹھائے مغرور
جُھک کے شاخوں سے لگے پونچھنے منقاروں کو
ہوا گرتے ہوئے پر کا جو پکڑنا منظور
کبھی چہکار کے تنہا کوئی خاموش ہوا
گونجی اس طرح سے آواز کہ دل ہو مسرور
ایک سُر میں کبھی مل جل کے وہ سب گاتے ہیں
جیسے ہر وقت چھریں سینکڑوں تارِ طنبور

بچے سینوں میں ڈبوتے ہیں جو منقاروں کو
مائیں چوں چوں کی صدا دیتی ہیں ہو کر مسرور
تھرتھرانے لگے کھولے ہوئے منقاروں کو
بچے چگنے کا نہ آیا تھا ابھی جن کو شعور
چونچ سے چونچ میں وہ ماں نے انڈیلا کیونکر
دیکھ لو ہو جو محبت کا سمجھنا منظور
رچ گئی شام کی متوالی صدا چار طرف
ہو گئے لحن سے طبقات اثیری معمور
دیکھ لو دیکھ لو سورج کی شکستہ عظمت
ہو ترقی و تنزل جو سمجھنا منظور
وہ جلالت نہ رہی اور وہ حدت نہ رہی
نہ کہیں شان ہے پہلی نہ کہیں کبر و غرور
چپکے مدفن کی طرف اپنے چلا جاتا ہے
تھرتھراتا ہوا افق یاس کا عالم بے نور
ڈوبتے ڈوبتے سورج کے نکل آیا چاند
اور یہ زہرہ ہے کہ قندیل ہے یا دیدۂ حور

ریاضؔ کی غزلوں میں سوز و گداز کا عنصر نمایاں ہے۔ ان کی چشم پرنم محبوب حقیقی کے لیے بھی برستی ہے اور محبوب مجازی کے لیے بھی۔ ان کی غزل خوانی میں شبنم کی سی اشکباری زیادہ ہے اور پھولوں کی سی شگفتگی کم۔ بحروں زمینوں اور لفظوں کے انتخاب میں ان کا ذوق سلیم بڑی نفاست اور لطافت سے کام لیتا ہے لیکن طبیعت کی وہ اپج جو ان کے قصاید کی تشبیب کو روشنی بخشتی

ہے ان کی غزلوں میں کم نظر آتی ہے۔ انھوں نے غزل کی طرف سنجیدگی سے توجہ بھی نہیں دی۔ مٹھی بھر غزلیں جواب یادگاری حیثیت رکھتی ہیں شاید انھوں ں ے اپنے احباب کی فرمائش میں یا مشاعروں میں شرکت کی غرض سے تفنن طبع کے لیے کہیں ہوں گی۔ ریاضؔ کی غزل گوئی کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

قانونِ زمانہ ہے اگر غم کی کہانی
پھر تو ہے یہ اک لذتِ پیہم کی کہانی
پھر ہوگئی موثر نہ کوئی غم کی کہانی
سُن لوگے اگر دیدۂ پُرنم کی کہانی
تم سوئے چمن لالہ و گل دیکھتے رہنا
کہتے رہیں ہم قطرۂ شبنم کی کہانی
آنکھوں کو ذرا اپنی سنبھالے تو رہو تم
کہنے دو ہمیں دیدۂ پرنم کی کہانی
پگھلا دئے دل دہر کے طوفانِ اثر نے
اللہ رے مرے جذبۂ ماتم کی کہانی
کہتا ہے ریاضؔ اپنا ہر اک عشق کا قصہ
لیکن نہ سُنی حُسن مجسّم کی کہانی

☆…………☆

کون سمجھا تھا کہ خاموشی زباں ہوجائے گی
اک ذراسی بات بڑھ کر داستاں ہوجائے گی

میں رہا خاموش لیکن کس کو یہ معلوم تھا
میری خاموشی تمہاری داستاں ہو جائے گی

شمع گل کر دے اٹھا لے پھول گیسو باندھ لے
ورنہ میری قبر تیری داستاں ہو جائے گی

اہلِ دل بیٹھے ہیں ہر جانب جگر تھامے ہوے
آج برق طور کیا پھر مہرباں ہو جائے گی

لطفِ سوز و ساز آئے گا جو کچھ بولا ریاضؔ
بزم محوِ رقص و مصروفِ نغاں ہو جائے گی

☆............☆

نغمۂ لطف کوئی زمزمہ پرداز نہ چھیڑ
جس میں کچھ کیف نہ ہو سوز کا وہ ساز نہ چھیڑ

بال و پر ٹوٹ چکے ایک زمانہ گذرا
اب تصور میں بھی اے حسرت پرواز نہ چھیڑ

خوگرِ غم کو نوحے میں مزا ہے مطرب
جس سے نغمے کی صدا آتی ہو وہ ساز نہ چھیڑ

حسن کی سیل میں ڈوبا ہے تصور اپنا
غرق رہنے دے نگاہِ غلط انداز نہ چھیڑ

☆............☆

قفس میں یہ ستم مجھ پر مرے صیاد کرتے ہیں
گرفتاروں کو میرے سامنے آزاد کرتے ہیں

خوشا قسمت کہ پھر اس درد کے آثار پیدا ہیں
کہ جس کی لذتیں تسکین میں ہم یاد کرتے ہیں

☆...........☆

بس یہی کائنات میری تھی   ہستیِ بے ثبات میری تھی
ایک ذرے کو گر سمجھ جاتا   پھر تو سب کائنات میری تھی
جان کر بھی جسے سمجھ نہ سکا   داستانِ حیات میری تھی
لے اُڑی جس کو بلبلِ نالاں   مختصر سی وہ بات میری تھی
ہر نفس موت کا مزہ چکھ کر   آرزوئے حیات میری تھی
موت کو زندگی بنا ڈالا   ایک وہ بھی حیات میری تھی

☆...........☆

تم اپنی تیغ دیکھ کے مغرور ہو گئے
ہم اپنی موت جان کے مسرور ہو گئے

جب تک حواس میں تھے ترے پردہ دار تھے
جب گم ہوئے حواس تو مجبور ہو گئے

یہ بھی رہا نہ یاد کہ محوِ جمال تھے
تجھ سے قریب ہو کے بہت دور ہو گئے

کیوں چپ ہوئے ریاضؔ سبب تو بتائیے
موت آ گئی تو اور بھی مغرور ہو گئے

☆...........☆

ریاضؔ کی رباعیات کا نمونہ یہ ہے:-

بگڑے جاتے ہیں حُسن صورت یہ ہے
کمزور پر شیر ہوں شجاعت یہ ہے
الفت معدوم پاس قویِ در گور
بالو کی طرح جدا ہیں ملت یہ ہے

☆............☆

ریاضؔ کا انتقال ۱۹۴۲ء میں ہوا۔ فاطمان کے قریب اپنے باغ میں محوِ استراحت ہیں۔

اسد بنارسی

خواجہ اسد اللہ اسد بنارسی خوش گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب صحافی بھی تھے۔ شاعری میں وہ فائز کے شاگرد تھے لیکن صحافت میں انھوں نے خود اپنا مکت فکر قایم کیا تھا جس میں آزادی فکر اور استقلال قلم کی کچھ ایسی بیباک مثالیں ملتی ہیں جو تقسیم ملک سے پہلے کے صحافی ماحول میں کم نظیر ہیں۔ اسد کا سیاسی اور سماجی شعور انھیں نااہل اور ستمگر کے خلاف قلم اٹھانے پر مجبور کرتا تھا۔ نظم ونثر میں ان کا محبوب موضوع یہی تھا۔ حق گوئی کے جرم کی پاداش میں انھوں نے حکومت کی سختیاں بھی برداشت کیں اور مالی نقصانات بھی اٹھائے لیکن وہ ہمیشہ اسم بامسمیٰ رہے۔

اسد کے بزرگ کچہری کے ملازمین میں سے تھے۔ جدِ امجد خواجہ نعیم اللہ کلکٹر بنارس کی عدالت میں ناظر تھے۔ والد خواجہ عصمت اللہ سشن جج کی پیشکاری میں منسلک تھے۔ اسد بھی تعلیم سے فارغ ہوکر بنارس کی دیوانی عدالت میں ملازم ہوگئے لیکن یہ دیوانی ملازمت ان کے لیے حلقۂ زنجیئر نہ بن سکی۔ تحریک عدم تعاون سے متاثر ہوکر انھوں نے اس سرکاری اور درباری ماحول کو ہمیشہ کے لیے ترک کردیا اور صحافت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ ابتدائی دور میں کچھ دیر تک کلکتہ کے روزنامہ ''عصر جدید'' میں ملازم رہے۔ پھر روزنامہ ''ہمدم'' لکھنؤ کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہوے۔ اس کے بعد ''سرفراز'' لکھنؤ کے ایڈیٹر بنادیے گئے۔

''سرفراز'' نے اسؔد کی زیر نگرانی کافی ترقی کی لیکن ''سرفراز'' بورڈ سے اختلاف پیدا ہو جانے کے سبب اسؔد کو اس سے بھی جدا ہونا پڑا۔ آخر میں انھوں نے ''اسد'' کے نام سے خود اپنا اخبار لکھنؤ سے جاری کیا۔ یہ ''اسدؔ'' ایڈیٹر اسؔد کی شہرت کے لیے بام عروج ثابت ہوا۔

اسؔد نے مختلف اصنافِ شعری میں طبع آزمائی کی ہے لیکن کلام کی کمیابی کے باعث وہ پوری طرح میرے سامنے نہیں ہیں۔ ان کے مداحوں کا بیان ہے کہ ان کی قومی نظمیں رباعیات اور قصاید بھی بڑے زندہ و تابندہ ہوتے تھے۔ میں بڑی جد و جہد کے بعد ان کی چند غزلیات اور متفرقات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔ پڑھنے والے محسوس کریں گے کہ ان اشعار میں بھی جہاں جہاں اسؔد ردیف و قافیہ کے پردے ہٹا کر خود سامنے آگئے ہیں۔ ان کی باتیں بڑی دل پذیر اور موثر معلوم ہوتی ہیں۔ شیخ علی حزیںؔ اصفہانی کا شعر ہے۔

من از حیرت تو از تمکین نہ ایمای نہ تقریری
چناں ماند کہ ہم بزم است تصویری بہ تصویری

فانیؔ فرماتے ہیں

حُسن حیرت تو میسر ہے تماشا نہ سہی
اس کی محفل میں ہیں گو نقش بدیور ہیں ہم

اسؔد اپنی آپ بیتی اسی ماحول میں یوں بیان کرتے ہیں۔

اک طرف نادم ہے دنیا اک طرف ساکت ہیں ہم
بات کر سکتی ہیں تصویروں سے تصویریں کہیں

حوادثِ زمانہ نے اسؔد کے ساتھ جو سلوک کیا اور جو غم انھیں عطا کیے انھیں وہ اس شکل میں لوٹاتے ہیں۔

میں کہیں ہوں قتل کی ہوتی ہیں تدبیریں کہیں
ہے رگِ گردن کہیں چلتی ہیں شمشیریں کہیں

اب یہ عالم ہے کہ خود اپنے مرقعے دیکھ کر
سوچتا رہتا ہوں دیکھی تھیں یہ تصویریں کہیں

جذبۂ حسنِ عمل اک انقلاب اک انقلاب
دل کی دنیا کو بدل سکتی ہیں تقریریں کہیں؟

اب نہ ہے رفتار پر قابو نہ دل پر اختیار
میں کہیں جاتا ہوں لے جاتی ہیں زنجیریں کہیں

حال پر اپنے بہت افسوس ہوتا ہے اسدؔ
دیکھتا ہوں مہربانی کی جو تصویریں کہیں

☆............☆

غمِ عشق اور غمِ روزگار کا امتزاج دیکھیے :-

کل جس پہ زمانہ ہنستا تھا آج اس کی لحد پہ روتا ہے
اب سونے والے جاگے ہیں جب جاگنے والا سوتا ہے

مانا کہ وہ مجھ سے غافل ہے اور فکر اس کی لاحاصل ہے
اتنی ہی محبت بڑھتی ہے جتنا کہ تغافل ہوتا ہے

یہ عشق کا غم ہے میرے خدا تو صبر کی مجھ کو طاقت دے
خوددار بھلا کیا خاک بنوں میں ہنستا ہوں دل روتا ہے

☆............☆

محسوس کر کے گردشِ لیل ونہار کو
دیکھا مجھے بہار نے میں نے بہار کو

اہلِ دول کی نخوت و ناز و غرور نے
خوددار کردیا مری مشتِ غبار کو

اب اشتیاق سیرو تماشا نہیں رہا
میں اور اتنی دور سے دیکھوں بہار کو

اے کاش اس نگاہ سے دنیا بھی دیکھتی
میں جس نظر سے دیکھ رہا ہوں بہار کو

عبرت کہ اب ہے لوح ولحد میں بھی فاصلہ
سنگ مزار ڈھونڈ رہا ہے مزار کو

☆..........☆

آسد بڑے خوددار آدمی تھے۔ انھوں نے جھکنا نہیں سیکھا تھا۔ ہزار مخالفتوں کے باوجود وہ راہِ خودداری سے نہیں ہٹتے۔ یہی جذبۂ غیرت ان کے کلام میں بھی رواں دواں ہے۔ ان کا دلیرانہ لہجہ اور حوصلہ مندی قابل تعریف ہے۔

میں اس فضا میں اب ہوں کہ پستی جہاں نہیں
بانگ جرس ہوں گردِ رہِ کارواں نہیں

شاید فلک کو حوصلۂ امتحاں نہیں
خنجر وہاں ہے اب رگِ گردن جہاں نہیں

احساس اس کا ہے جہاں تھا وہاں نہیں
اس کی خبر نہیں کہ کہاں ہوں کہاں نہیں

دنیا مجھے نگاہِ حقارت سے یوں نہ دیکھ
اب بھی زمیں نہیں ہوں اگر آسماں نہیں
اک مشغلہ ہے فکرِ نتائج سے بے نیاز
ترتیب آشیاں سے غرض آشیاں نہیں
میں ہنس رہا ہوں آگ ہے دل میں لگی ہوئی
دنیا سمجھ رہی ہے غم آشیاں نہیں

☆............☆

مذاق صبر کو رسوا نہ بادہ خوار کریں
شراب رہنے دیں ساقی کا انتظار کریں
ستم ظریفی دنیا اسدؔ سے یہ خواہش
یقین آئے نہ آئے اور اعتبار کریں

درجِ ذیل اشعار قدیم ماحول کے ہیں اور اسدؔ کی روایتی شاعری کا نمونہ ہیں۔

نشانِ ہستی ناپائیدار رہنے دے
مرا مزار بشکل مزار رہنے دے
صبا وہ آئیں گے شمع مزار رہنے دے
یقیں کے حد پہ مرا اعتبار رہنے دے
جو جانتا ہو نہ چھوڑے گی خاک تار کفن
وہ کیوں پھر اپنے گریباں میں تار رہنے دے
ہوا فلک پہ نہ لے جا زمیں پر نہ گرا
جہاں یہ ہے مری مشتِ غبار رہنے دے

اسدؔ کے کتبہ لوحِ مزار کو نہ مٹا
یہ زندگی کا ہے اک شاہکار رہنے دے

☆…………☆

بُت نامہرباں کچھ مہرباں معلوم ہوتا ہے
مجھے یہ بھی فریب آسماں معلوم ہوتا ہے
نہیں اک تارِ پیراہن مگر یہ بھی غنیمت ہے
کہ گردن میں گریباں کا نشاں معلوم ہوتا ہے
میرے سجدوں سے ہے دنیا میں رسم بندگی قایم
کسی کا آستاں اب آستاں معلوم ہوتا ہے
تجھے اے آشیاں اللہ رکھے رہتی دنیا تک
جلا سو بار پھر بھی آشیاں معلوم ہوتا ہے

اسدؔ کے یہ متفرق اشعار بھی قابل توجہ ہیں:-

اُف کتنی سخت جان یہ شمعِ حیات ہے
ہراک سے پوچھتا ہوں ابھی کتنی رات ہے

☆…………☆

ٹوٹی ہوئی ناؤ دیکھتا ہوں
دریا کا بہاؤ دیکھتا ہوں

☆…………☆

تذکرہ میرے نشیمن کا کہیں ہوتا نہیں
طور کے جلنے کا دنیا بھر میں افسانہ ہوا

☆…………☆

مٹی کا ایک ڈھیر زمیں سے ذرا بلند
یہ مختصر سا حاصلِ نام و نشاں ہے اب

☆..........☆

یہ کہہ کے ہم کسی کے مرتبے کو کم نہیں کرتے
بلندی آسماں کی دیکھ کر سر خم نہیں کرتے
طلائی بت کے آگے سر جھکائیں طمع دنیا میں؟
خدا کو بھی تو سجدہ اس نظر سے ہم نہیں کرتے

☆..........☆

اسد کا انتقال ۳/مارچ ۱۹۵۳ء کو لکھنؤ میں ہوا اور وہیں امام باڑہ ''غفران مآب'' میں دفن کیے گئے۔

مرزا طاہر بخش طاؔہر

مرزا طاہر بخش طاؔہر بنارس میں دہلی کی یادگار تھے۔ ایک غزل کے مقطع میں انھوں نے خود اس کی تشریح کی ہے۔

دلی سے بزرگ اپنے آئے تھے بنارس میں
اردو مری اے طاہر اردوئے معلے ہے

مزار فائؔز کے شاگردوں میں ان کا انتقال سب سے آخر میں ہوا۔ جوانی میں بڑے حسین وجمیل آدمی تھے۔ ڈرامہ کھیلنے کا شوق تھا۔ کبھی کبھار زنانہ پارٹ بھی نہایت خوبی سے ادا کرتے تھے۔ آخری عمر میں صرف مشاعروں اور ادبی محفلوں کی صدارت کے لیے گھر سے نکلتے تھے۔ زیادہ عمر ہونے کے سبب تبرک بن کر رہ گئے تھے۔ ان کے والد غالباً صاحب عالم مرزا قادر بخش صابر دہلوی کے ساتھ بناس آئے تھے۔ دلی کی بربادی کے بعد ان لوگوں نے بنارس کے مشہور محلہ شوالہ کو آباد کیا تھا۔ طاؔہر کی ولادت بنارس ہی میں ۱۸۶۸ء میں ہوئی۔ ان کے والد مرزا احمد بخش پڑھے لکھے آدمی تھے۔ انھوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم کے لیے حافظ محمد حسین کو طاہر کا معلم مقرر کیا۔ بنگالی ٹولہ ہائی اسکول میں انٹرنس تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۹۵ء میں مزار طاہر، مرزا فائؔز کے شاگرد ہو گئے اور دم آخر تک مشق سخن کی مشقت میں مصروف رہے۔ فکر معاش کے سلسلے میں وہ پہلے باغ فاطمان کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ بعد ازاں آخری عمر میں مدن پورہ کے مدرسہ اسلامیہ میں متعلمی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ طاؔہر کا انتقال ۸۴ سال کی

عمر میں ۱۰ر نومبر ۱۹۵۲ء کو ہوا۔ وہ لنکا کے شاہی قبرستان میں اپنی اہلیہ کی تربت کے پہلو میں دفن ہیں ہفت روزہ ’’نمائندہ‘‘ بنارس میں حضرت جوہر صدیقی بنارسی نے عیسوی اور ہجری تاریخیں اس انداز سے نکالی ہیں۔

وداعِ حضرت مرزا طاہر

۱۹۵۲ء

یادگارِ فائز والا تبار شاعرِ خوش فکر و شائستہ نگار
ہست برہم محفل شعروادب شد بجنت طاہر کامل وقار

۱۳۷۲ ہجری

مرزا طاہر کی اُردو کے معلیٰ ہونے میں شک نہیں لیکن ان کے یہاں مضامین معلیٰ نہیں ہیں۔ ان کا غیر مطبوعہ دیوان حروف تہجی کی ترتیب میں میرے سامنے ہے۔ ان کی پرگوئی نے استادوں کی کوئی زمین چھوڑی نہیں ہے لیکن ان زمینوں میں غور وفکر اور مشاہدے سے محروم وہ اتنے سرسری نظر آتے ہیں کہ ان کی شاعری کا کوئی گہرا نقش پڑھنے والے کے ذہن میں باقی نہیں رہتا۔ ان کے دیوان میں چند قصاید کچھ رباعیات، بہت سے سہرے اور تہنیت وتعزیت کے قطعات تاریخ بھی موجود ہیں لیکن یہ مجموعی حیثیت سے ان کا مجموعہ غزلیات ہے۔ عام طور پر طاہر نے اپنی غزلیات میں مروجہ مضامین کو مروجہ اسلوب میں بیان کیا ہے لیکن کہیں کہیں ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جو ان کی شاعری کی عمومی روش کے لحاظ سے غیر معمولی معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے اشعار کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن یہ قابل تحسین ضرور ہیں۔ اپنے معاصرین کے مقابلے میں ان کے کلام میں سلاست اور سادگی زیادہ ہے لیکن یہی سادگی اکثر ان کے اشعار کو ایسا سپاٹ اور پھیکا بنا دیتی ہے کہ وہ مرزا قادر بخش صابر کے صحیح جانشین نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے باوجود مجموعی حیثیت سے ان کی شاعری کا تاثر ان کے استاد مرزا فائز اور خاندانی سرپرست

شہزادہ قادر بخش صابؔر کی شاعری کے تاثر سے بہتر ہے کیونکہ وہ امانتؔ کی تقلید میں ایہام پروری پر آمادہ نہیں ہوتے اور صرف کنگھی چوٹی کے قصیدہ سرا نہیں ہیں۔ طاہؔر کی غزل گوئی عام طور پر ردیف وقافیہ سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ ان کی مضمون بندی کا دارومدار قوافی کی نوعیت پر ہے۔ اسی لیے کوئی مستقل رنگ وہ پیدا نہیں کرسکتے۔ ان کی اچھی غزلیں اس قسم کی ہیں۔

ہر ادا پر آپ کی مرنے کی حسرت دل میں ہے
اک عجب شانِ محبت آپ کے بسمل میں ہے
راہ کھینچ آتی ہے اتنی جذب جتنا دل میں ہے
فی الحقیقت منزل مقصود ہر منزل میں ہے
مجھ کو آداب محبت نے نہ کچھ کہنے دیا
کاش مجھ سے پوچھتے وہ کیا تمہارے دل میں ہے
ہم کو مرنا ہے محبت میں تری مرجائیں گے
کچھ نہ آسانی میں وقت ہے نہ کچھ مشکل میں ہے
باندھ ہمت اٹھ روانہ ہو خدا کا نام لے
جانے والے کیوں خیال دوریٔ منزل میں ہے
چھوڑ دے کشتی بھروسہ پر خدا کے ناخدا
خوف طوفاں کس لیے ہے کیوں غم ساحل میں ہے
ہیں کرم پر آپ کے موقوف ساری حسرتیں
کچھ نہیں ہے اور پھر سب کچھ ہمارے دل میں ہے
زندگی تو زندگی ہے مرگ طاہؔر بھی حیات
وہ نہیں مرتا محبت جس کے آب و گل میں ہے

☆..........☆

آمد ہے اب بہار کی رخصت خزاں کی ہے
ہم بے پروں کو فکر نئے آشیاں کی ہے

ہمت بہت بلند ترے ناتواں کی ہے
ہر حال میں طلب ستمِ جاوداں کی ہے

ہم ساتھ ساتھ ہیں مگر اب تک پتہ نہیں
منزل کہاں درازیٔ عمر رواں کی ہے

اک موت ہے اسیر محبت کی زندگی
رونے کا حکم ہے نہ اجازت فغاں کی ہے

تنہائی قفس میں اکیلے نہیں ہیں ہم
تسکین دل کے واسطے یاد آشیاں کی ہے

آئے ہیں دیکھنے وہ دم واپسیں ہمیں
یہ آخری بہار ہماری خزاں کی ہے

ناکام زندگی ہوں کہوں اور حال کیا
یہ مختصر سی شرح مری داستاں کی ہے

جوہر شناس جمع ہیں طاؔہر غزل پڑھو
یہ بزم فیض فائز معجز بیاں کی ہے

☆………..☆

انتخاب میں کچھ ایسے اشعار بھی نکل آئیں گے:-

صیاد کا کرم ہے اسیروں کے حال پر
دہشت خزاں کی ہے نہ تمنّا بہار کی

جھکاتی ہے اسے جتنا ہی میری بے پر دبا دلی
ہوئی جاتی ہے اونچی اور شاخِ آشیاں میری

کوئی بے بال و پر شاید قفس سے آج چھوٹا ہے
جھکی جاتی ہے کیوں سوئے زمیں شاخ آشیانے کی

صورت نہ دیکھی زیست نے جب اعتبار کی
مجبور ہو کے موت کی شکل اختیار کی

سو رہا ہے شمع کے سائے میں کس آرام سے
زندگی کی شان مرنے پر بھی پروانے میں ہے

☆………..☆

حسن کہتے ہیں جسے یہ حسن کی تنویر ہے   چاند میرے چاند کی تصویر کی تصویر ہے
ہوں تصور میں کسی سے ہم کلام   اس خموشی میں ہے گویائی بہت
صبح تک دنیا سے ہے کس کا سفر   رو رہی ہے شامِ تنہائی بہت
اے مری غربت بتا یہ کیا ہوا؟   دے رہا ہے کیوں مجھے صحرا جواب

☆............☆

جب تک کہ کچھ بھی خونِ تمنا جگر میں تھا
سرمایۂ بہار مری چشم تر میں تھا

چار پھولوں سے بدل دی آ کے دنیا آپ نے
اور ہی کچھ عالم گورِ غریباں ہوگیا

غمِ پیہم سے میرا ہم کلام دشت و در ہونا
خود اپنا حال کہنا خود ہی سننا نوحہ گر ہونا

محبت میں مرا جینا نہ جینا دونوں یکساں ہیں
نہ جینا کام آتا ہے نہ مرنا کام آتا ہے

یہ حسرت ہے وہ اس انداز سے ہم پر جفا کرتے
پہنچتے انتہا پر جب تو پھر سے ابتدا کرتے

☆............☆

نذیرؔ بنارسی

نذیرؔ بنارسی اُس وقت سے شعر کہتے ہیں جب وہ لکھنا تک نہیں جانتے تھے۔ اُن کے کم سِن ہمجولی اُن کے اشعار ٹیڑھے میڑھے الفاظ میں قلم بند کر کے سناتے تھے۔ خود ہنستے تھے اوروں کو بھی ہنساتے تھے۔ اس حساب سے اُن کی عمر شاعری ۴۸ سال ہے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے لے کر آج تک انھوں نے اپنے ماحول کے انفرادی اور اجتماعی تصورات کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکثر وہ اپنے کلام میں ایسے رچ بس گئے ہیں کہ انھیں پہچاننے میں مشکل نہیں ہوتی۔ ان کی شاعری کا منفرد لب ولہجہ ایک ایسی شخصیت کی نشان دہی کرتا ہے جو ایک مخصوص سماجی قالب میں ڈھلی ہے وہ اپنے آپ کو شنکر کی نگری کا سفیر اور کاشی کا فقیر لکھتے ہیں۔

ان کا مسلک وطن دوستی اور ان کا دھرم دیش پیار ہے۔ قدیم ہندوستانی کلچر کے وہ شیدائی ہیں۔ گنگا جمنی تہذیب کا رکھ رکھاؤ ان کا ادبی ایمان ہے۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے خیالات ونظریات نذیرؔ کے کلام کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اور ان کی تشکیل نذیرؔ کی زندگی کے مختلف واقعات وتجربات، ذاتی غور وفکر اور شعوری کوششوں کا نتیجہ ہے۔

نذیر احمد نذیرؔ بنارسی ۱۹۱۱ء میں بنارس کے ایک متوسط مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا واجداد کا پیشہ طبابت تھا۔ اس فن شریف میں ان کے والد حکیم نور محمد مرحوم نے بھی کافی

دستگاہ بہم پہونچائی تھی اور اپنے زمانے کے جانے پہچانے اطبا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ نذیر نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو گھر میں صوفیانہ ماحول پایا۔ حکیم نور محمد مرحوم مشہور طبیب ہونے کے علاوہ ایک بلند مرتبہ صوفی بھی تھے۔ پھلواری شریف کے سجادہ نشین حضرت مولانا عبیداللہ شاہ صاحبؒ سے ان کا گہرا رابطہ تھا۔ وہ بھی اہل حال وقال میں ایک شیخ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہر مذہب وملت کے لوگ ان سے عقیدت رکھتے تھے اور عرفانیات میں ان کے ارشادات کو مشعل راہ تصور کرتے تھے۔ موصوف کبھی کبھی محفل سماع میں بھی شرکت فرماتے تھے۔ ان کے اپنے گھر بھی اکثر ایسے اجتماع ہوتے تھے جن میں ذکر واذکار اور وظیفہ و وظائف کے علاوہ مولانا رومی اور حافظ شیراز کے اشعار بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے۔ شوق مطالعہ نے موصوف کے ذخیرۂ کتب کو بھی بہت متنوع بنادیا تھا۔ خصوصاً روحانیات پر ان کے پاس بہت نادر نادر کتابیں تھیں۔ ان میں سے کچھ تو ان کے مریدان تبرک سمجھ کر لے گئے کچھ گھر میں موجود ہیں اور کچھ ان کی وصیت کے مطابق گنگا میں بہادی گئیں۔

حکیم نور محمد صاحب موصوف دونوں صاحبزادوں (نذیر احمد اور ان کے بڑے بھائی محمد یٰسین) کو اپنا صحیح جانشین دیکھنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے شروع سے ہی انھیں طبابت کی طرف راغب کرنا چاہا۔ لیکن چھوٹے لڑکے کا فطری میلان طب سے کہیں زیادہ شاعری کی طرف تھا اس لیے انھیں اپنے مقصد میں پچاس فی صدی سے زیادہ کامیابی نہ حاصل ہوسکی [1]

نذیر ابتدائی تعلیم کے لیے پاس ہی کے ایک پرائمری اسکول میں بھیجے گئے تھے۔ ابھی یہاں ایک سال بھی پورا نہ ہونے پایا تھا کہ ایک روز نذیر کی حرکتوں سے تنگ آکر ان کے منشی جی

---

[1] نذیر صاحب کے بڑے بھائی قبلہ حکیم محمد یٰسین صاحب مسیح بنارسی، بنارس کے مشہور طبیب ہیں۔ اس فن میں وہ اپنے والد مرحوم کے وارث کامل ہیں۔

کو اپنی چھڑی سے ان کی خوب تواضع کرنا پڑی۔ نذیؔر نے منشی جی کی اس گرما گرم تواضع سے متاثر ہو کر ان کی ہجو میں کچھ ٹیڑھے سیدھے اشعار کہہ دئے۔ اس وقت ان کو لکھنا نہیں آتا تھا اس لیے دوسرے لڑکے کو بول کر ایک کاغذ کے ٹکڑے پر اپنے اشعار لکھوائے۔ دستخط کی جگہ اپنا انگوٹھا لگا دیا اور موقع پا کر چپکے سے منشی جی کی جیب میں ڈال دیا۔ دوسرے دن منشی جی اسکول کے وقت سے کچھ پہلے نذیؔر کے والد کی خدمت میں پہنچے اور انگوٹھے کے نشان والا کاغذ جیب سے نکال کر حکیم صاحب کے سامنے رکھ کر دست بستہ عرض پرداز ہوئے کہ حکیم صاحب صاحبزادے کو پڑھانا میرے بس کی بات نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن اسکول سے نام کٹ گیا پھر تو کچھ نہ پوچھیے نذیؔر کی جتنی تواضع اسکول میں منشی جی نے کی تھی اس سے کہیں زیادہ مدارات ان کے گھر میں ان کے والد بزرگوار نے کی۔ اسکول سے نام کٹ جانے کے کئی ہفتہ بعد مدرسہ رحمانیہ میں ان کا نام لکھایا گیا۔ یہاں صفوۃ المصادر اور گلزار دبستاں ختم کر کے اپنے استاذ مکرم کی سخت علالت کے باعث نذیؔر کو محمود المدارس میں منتقل ہونا پڑا۔ یہاں سے گلستاں بوستاں، مامقیماں، اخلاق محسنی اور انوار سہیلی ختم کرنے کے بعد میزان منشعب شروع کی۔ ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ شعر و شاعری کے چکر میں پڑ کر اس مدرسے کو بھی خیرباد کہنا پڑا۔ اس کے کئی مہینے کے بعد اپنے بڑے بھائی حکیم محمد یٰسین صاحب سے طب پڑھنا شروع کیا۔ گھر پر دواخانہ کا کام اور پڑھائی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ گھر کی پڑھائی میں بھی نذیؔر کی شاعری برابر خلل انداز ہوتی رہی۔ محنت اور مشقت کے بل پر کسی طرح نذیؔر طبیہ کالج الہ آباد کے سندیافتہ طبیب تو قرار پا گئے لیکن شعر و شاعری میں ہمہ تن مصروفیت کے باعث طبابت کو اپنا ذریعۂ معاش نہ بنا سکے۔ خاندانی روایت سے اس انحراف کا سبب ان کی افتاد طبع اور شاعرانہ ماحول تھا۔

نذیؔر کو ادبی شعور ورثے میں ملا تھا۔ انھوں نے ادبی تعلیم مکتب کی بجائے اپنے گھریلو

ماحول سے حاصل کی۔ فارسی میں وسعت مطالعہ نہ ہونے کے باوجود وہ جب اپنے والد اور ان کے صوفی مشرب احباب کو مولانا رومی اور حافظ شیراز کے کلام کو پڑھ پڑھ کر جھومتے دیکھتے تو ان کی روح کو بھی بالیدگی کا احساس ہونے لگتا۔ اس گھریلو چشمۂ فیض سے سیرابی کے بعد جب وہ باہر نکلے تو اپنے شہر میں بھی انھیں اسی قسم کا ماحول میسر آیا۔ بنارس زمانۂ قدیم سے ہی علم وفن کا مرکز رہا ہے۔ البیرونی سے لے کر شیخ علی حزیںؔ اصفہانی تک سینکڑوں باکمال اس سرچشمۂ ادب سے سرشار ہوئے ہیں۔ لکھنؤ اور دہلی کی بربادی اس دیار دلبراں کی معموری کا باعث ہوئی ہے۔ لکھنؤ کے نواب زادوں اور دہلی کے شاہزادوں کے قیام نے اس شنکر کی راج دھانی کو گنگا جمنی کلچر کا بہترین نمونہ بنا دیا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز کا بنارس اس لحاظ سے اور بھی قابل رشک ہے کہ یہاں سے کچھ ایسی علمی اور ادبی تحریکیں اٹھیں جنھوں نے پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔ ہندی ادب کے پہلو بہ پہلو یہاں اردو ادب نے بھی ارتقا کے بہت سے مدارج طے کئے ہیں۔ رجب علی بیگ سرورؔ سے پریم چند تک اردو نثر نے بہت بڑا ارتقائی مرحلہ اسی سرزمین پر طے کیا ہے۔ اردو ہندی ڈرامے نے یہیں ہوش سنبھالا ہے۔ طالبؔ، رونقؔ، بیتابؔ، بھارتیندوؔ ہریشچند اور آغا حشر کاشمیری اسی خاک سے اٹھے ہیں۔ اس سرزمین حسن وعشق کی دلکشی فقط اپنوں تک ہی محدود نہیں رہی بیگانے بھی بنارس کی کشش محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ کچھ تو ایسے ہیں کہ یہاں آنے کے بعد یہاں سے واپس نہیں گئے اور یہیں کی خاک کے پیوند ہو کر رہ گئے۔ کچھ ایسے تھے جو جانے کو تو چلے گئے لیکن نظم ونثر کی صورت میں اپنے دھڑکتے ہوئے دل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہیں چھوڑ گئے۔ پہلی قسم کے لوگوں میں شیخ علی حزیںؔ اصفہانی اور دوسرے گروہ میں مرزا غالبؔ کے نام سرفہرست ہیں۔ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی کے بنارسی شعرا اور مقیمان بنارس میں بہت سی شخصیتیں ایسی تھیں جن کی شہرت ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان

سخنوروں میں سید اسمٰعیل حسین نیّر اکبرآبادی، مرزا عباس بیگ محشرؔ بنارسی اور منشی عبدالرزاق صاحب بیتابؔ بنارسی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نیّر اکبرآبادی منیر شکوہ آبادی کے بھانجے تھے اور بنارس ریلوے اسٹیشن پر ملازم تھے۔ ان کا خاندان اپنی زبان دانی اور شستہ کلامی کے لیے مشہور تھا۔ ان کے دونوں صاحبزادے شاعر تھے اور نیرؔ صاحب کی والدہ بھی شعر وسخن کا بہت پاکیزہ مذاق رکھتی تھیں۔ زبان و بیان کی صحت کا یہ لوگ بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کا گھر بنارس کی علمی اور ادبی صحبتوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔ مرزا عباس بیگ محشرؔ مرحوم شہر کے مشہور مختار (ایڈوکیٹ) تھے۔ چوک[۱] کے شعرا میں وہ گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے ان کا خاص میلان فطرت نگاری کی طرف تھا۔ ان کی موضوعاتی نظموں کی بہت شہرت ہو چلی تھی۔ بڑے قادر الکلام شاعر تھے پرندوں اور موسموں پر ان کی منظومات بڑی دلکش ہیں اکثر کالی داس کے جذبات کو اردو نظم کا لباس پہنایا ہے۔ ہندوستانی کلچر کی روح کو اپنے کلام میں سمونے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ شعرائے بنارس کا ایک تذکرہ بھی انھوں نے مرتب کیا تھا جس کا مخطوطہ غالباً اب تک ان کے خاندان میں موجود ہے۔ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ ڈاکٹر وزیر آغا کے مقدمہ کے ساتھ پاکستان میں شایع ہوا ہے۔

یادگار خاندان مصحفیؔ منشی عبدالرزاق بیتابؔ بنارسی کی شخصیت اس دور کے بنارسی شعرا میں بے حد کم نظیر دکھائی دیتی ہے۔ بڑی آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ ساری عمر تجرد میں بسر کی۔ محلہ مدنپورہ میں تن تنہا ایک مختصر سے مکان میں قیام تھا۔ دن بھر لوگ ان کو گھیرے رہتے تھے۔ خیال، ٹھمری، دوہے، کجری اور خمسے ان سے لکھواتے تھے۔ یہ بھی ایسے مشاق اور پر گو تھے کہ سب کی فرمائشیں چشم زدن میں پوری کر دیتے تھے۔ مذکورہ بالا اصناف سخن کے استاد ہونے کے

---

[۱] بنارس کا وہ محلہ جو کبھی بڑا شاعر خیز سمجھا جاتا تھا۔

ناتے کلکتہ، بمبئی، سورت ہر جگہ ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جن کے کلام پر اصلاح کا کام بھی بڑی جانفشانی سے انجام دیتے تھے۔ مقرر بھی بہت اچھے تھے۔ بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں بہت کم لوگ ان کے حریف ہو سکتے تھے۔ مناظروں اور مباحثوں میں بھی لوگ انھیں کھینچ کر لے جاتے تھے۔ ایسے موقعوں پر ان کی ذہانت اور چمکتی تھی۔ ایک دو جملے میں مخالف کو لاجواب کر دینا ان کے لیے شکل بات نہ تھی۔ کبھی کبھار احباب کو محظوظ کرنے کے لیے دینی مناظروں میں بھی شامل ہو جاتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک پادری صاحب کو لاجواب کر دینے کا ان کا لطیفہ بنارس میں بہت مشہور ہے۔ منشی جی کی وسیع المشربی سارے شہر میں ضرب المثل تھی۔ ان کا صوفیانہ مزاج سب کو بہت بھاتا تھا۔ وہ اپنے کو بانوا فقیر کہا کرتے تھے۔ ارباب نشاط سے لے کر بڑے بڑے مہاجن اور کوٹھی والے ان کے ارادت مندوں میں تھے۔ ہندو مسلم میں امتیاز نہ کرتے تھے۔ اگلے وقتوں کی جیتی جاگتی یادگار تھے۔ ہندوؤں کے تہواروں اور میلوں ٹھیلوں میں بڑے ٹھاٹھ سے اپنی امّت سمیت شرکت فرماتے تھے۔ خاص کر ہولیوں میں منشی جی کا اکھاڑہ دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ ہفتوں پہلے تیاریاں ہوتی تھیں۔ مظلوم ان کے دربار میں فریاد لے کر آتے تھے منشی جی سب کی شکائتیں بڑے غور سے سنتے جاتے، اس مہاجن نے بنکروں پر یہ ظلم کیا، اس کوٹھی والے نے فلاں غریب کی اجرت مار لی، فلاں بیوپاری فلاں کاریگر کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آیا وغیرہ وغیرہ۔ سب کی سننے کے بعد منشی جی اپنے خمسوں میں مناسب مقامات پر یہ تمام شکایتیں مزاحیہ انداز میں منظوم فرماتے اور موقع کی تلاش میں رہتے جب ہولی کا اکھاڑہ اٹھتا اور اپنے پرانے ٹیکروں پر پہونچتا ہزاروں کی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی تب منشی جی اپنے مخصوص انداز میں خمسے پڑھتے اور اپنے شاگردوں سے بھی پڑھواتے۔ اس دوران میں اگر مخاطب نظر آ جاتا تو اس سے براہ راست خطاب کر کے ہزاروں آدمی کے روبرو اس کی

کمزوریاں مزاحیہ پیرائے میں مزے لے لے کر بیان فرماتے۔ منشی جی کا یہ انداز اکثر مؤثر ثابت ہوتا۔ بدنامی کے ڈر سے لوگ پہلے ہی نذر نذرانہ لے کران کی خدمت میں پہنچ جاتے اور اس طرح بہت سے خوشگوار جھگڑے منشی جی کے فیض سے بہ آسانی طے ہوجاتے۔ منشی بے تاب مرحوم صاحبِ نظر تھے۔ دیر وحرم ان کے لئے برابر تھے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک مطلع ملاحظہ فرمائیے:

سر رہے دوست کی چوکھٹ پہ کسی گھر میں رہے
آدمی دیر میں یا خانۂ داور میں رہے

کبھی علی الصباح اُٹھ کر بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ نماز فجر ادا کرتے کبھی رات کی تنہائی کو بارونق بنانے کے لیے ستار چھیڑ کے میرا کے بھجن گنگنانے لگتے۔ دلدادۂ اہلبیت ایسے تھے کہ شہیدانِ کربلا کی یاد میں رونے لگتے تو گھنٹوں روتے ہی جاتے۔ کبھی مثنوی مولانا روم پڑھنے لگتے، کبھی تلسی داس جی کی چوپائیاں۔ موسیقی سے کافی شغف رکھتے تھے۔ نظیر اکبرآبادی کی نظمیں اور کبیر کے دوہے بھی ان کو بہت یاد تھے۔ مجموعی حیثیت سے ان کی آزاد شخصیت اردو کے منفرد شاعر حضرت نظیر اکبرآبادی سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔

مرزا محشؔر اور بیتاؔب کے علاوہ اس زمانے میں بہت سے اور اہل فن بھی موجود تھے۔ جن کا نام اور کلام اب ناپید و نایاب ہے۔ ان بزرگوں میں کچھ ایسے تھے جنھوں نے ماہر فن اور مسلم الثبوت استاد ہونے کے باوجود کبھی کسی رسالے یا پرچے کو اپنا کلام بغرض اشاعت شاید ہی بھیجا ہو، یہ لوگ مقامی طور پر باکمالوں میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن بنارس سے باہر کسی مشاعرے یا ادبی مجلس میں شرکت کا دماغ نہیں رکھتے تھے۔ اہل شہر ان کی خدمت میں جوق درجوق حاضر ہوتے تھے اور ان کی تحریر وتقریر سے بلاامتیاز مذہب وملت فیضیاب ہوتے تھے۔ حکیم چھنومل ناقدؔ دہلوی شاگرد حضرت بیخودؔ دہلوی انھیں بزرگوں میں سے تھے۔ ان کے کچھ شاگرد

اب بھی بنارس میں موجود ہیں۔ ناقدؔ ایسی شستہ اور بامحاورہ زبان بولتے تھے کہ بہت سے شایقین فقط ان کی باتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہر روز ان کے مکان پر حاضری دیتے تھے۔ قدیم رنگ میں کہتے تھے لیکن مشاق اس قدر تھے کہ شعرا ان کی تحسین کو فن کا سٹیفکیٹ سمجھتے تھے۔

شاہ سرن لال صوفیؔ کا شمار بھی اس دور کے صف اول کے شعرا میں ہوتا تھا۔ صوفیانہ مزاج کے بزرگ تھے۔ اب کہیں نام ہے نہ کلام، ان کے یہ دو شعر بنارس میں مشہور ہیں:

لغزش ہوئی تھی صوفیؔ بدمست کو مگر
دیوار میکدے کی پکڑ کر سنبھل گیا

☆..........☆

لگا رہا ہوں شب و روز زینۂ عصیاں
بہت بلند ہے سنتا ہوں آستانِ کرم

ان شعرا کے علاوہ استاذ الاساتذہ مرزا محمد حسن فائزؔ مرحوم۔ حضرت فرخؔ بنارسی، میر ریاضؔ علی بنارسی۔ آغا عبدالحمید ناصرؔ بنارسی۔ منشی عبدالصمد قاصرؔ بنارسی، شاگرد حضرت جلالؔ حکیم رحمتؔ بنارسی، شاگرد حضرت داغؔ دہلوی خواجہ محمود اقبالؔ بنارسی، منشی عبدالغنی غنیؔ بنارسی، آغا حشرؔ بنارسی جو کشمیری کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں۔ حافظ مقبول احمد کوکب بنارسی۔ نجابت حسین عیشؔ بنارسی۔ مرزا طاہر بخت طاہرؔ بنارسی اور کئی دوسرے شعرا، جو بنارس میں موجود تھے سب کے سب اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے اور کوئی نہ کوئی ادبی ہنگامہ اس شہر صد گفتار و صد رفتار میں برپا کیے رہتے تھے۔ اس ہنگامے کی بہترین یا بدترین صورت طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ ہر ہفتہ ایک دو طرحی مصرعے گشتی مراسلے سے روانہ کر دیے جاتے اور یاران نکتہ داں کو صدائے عام دی جاتی تھی۔ مبتدیوں کے لیے یہ ایک خاص امتحان کا وقت ہوتا تھا۔ جی توڑ کر شعر نکالے جاتے تھے۔ فنی نکات اور زبان و بیان کی جکڑ بندیوں پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ باغی قوافی کی استادانہ

گرفت شاعر کی قادر الکلامی کا سب سے بڑا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ شعرا شہر کے مختلف حلقوں میں منقسم تھے۔ مدن پورہ اور شوالہ الگ، چوک اور تلیا نالہ جدا استاد اپنے اپنے پٹھوں کا دل بڑھاتے تھے۔ بعض اوقات معاصرانہ چشمکوں میں بڑے دلچسپ نظارے دیکھنے میں آتے تھے۔ مخالفین کی باری آئی شاعر نے پڑھنا شروع کیا اور حریفوں نے اٹھ کر حاضرین مجلس میں پان کی طشتری گھمانا شروع کردی تاکہ لوگوں کی توجہ دوسری طرف مبذول ہو جائے اور پڑھنے والا شاعر داد سے محروم رہ جائے۔ کبھی کبھی منصف مزاجی کے مظاہرے بھی زور شور سے کیے جاتے تھے۔ کسی نو آموز نے طرح میں اچھے شعر پڑھے اور اساتذہ نے اپنی غزل چاک کر کے مشاعرے کے اختتام کا اعلان کرادیا۔

نذیؔر نے بہت کم سنی میں ان محفلوں میں شرکت شروع کردی تھی۔ اول اول وہ سامع کی حیثیت سے شریک ہوتے رہے لیکن جلد ہی طبیعت کی اپج اور شاعرانہ مزاج انھیں سامعین کی صف سے نکال کر اکھاڑے میں لے آیا۔ یہ بڑے جگر گردے کا کام تھا۔ اس دنگل میں قدم جمانا آسان کام نہ تھا۔ استاد نئے پٹھوں کو منہ لگانے میں بہت تامل سے کام لیتے تھے۔ دشوار گذار اور ناہموار زمینوں میں شگفتہ مضمون پیدا کرنا زبان و بیان کی تمام پابندیوں کے باوجود حسن کلام کا مظاہرہ کرنا فی البدیہہ شعر کہنا، مصرع پر برجستہ مصرع لگانا استادوں کی زمین میں آسانی سے غزل کہنا وغیرہ شاعری کی اہم شرائط تھیں۔ شاعری کا مطلب محض غزل گوئی سمجھا جاتا تھا۔ نذیؔر کو اس ماحول میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لیے جان توڑ کر محنت کرنا پڑی اور اسی محنت نے ان کے دل میں شاعری کی ایسی لگن پیدا کردی کہ آگے چل کر انھوں نے اس کو اپنی زندگی بنایا۔ ان کی یہ لگن دوسروں کو بھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی، اس دور کے سر برآوردہ شعرا نے بہت جلد انھیں اپنا لیا۔ نیر اکبرآبادی اگرچہ سن میں نذیؔر سے بہت بڑے تھے لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو

دیکھ کر ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ [۱]

نذیؔر کے ادبی شعور کے نشوونما میں نیؔر اکبر آبادی کی ہم نشینی کا بھی اثر ہے نیؔر صاحب [۲] زبان اور محاورے کی صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کے تغزل کی پاکیزگی نے نذیؔر کر اپنا راستہ متعین کرنے میں کافی مدد دی۔ عام فہم الفاظ کا استعمال نیؔر صاحب کی غزل کی جان ہے۔ نذیؔر نے بھی اس کی اہمیت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور رفتہ رفتہ یہ چیز ان کی شاعری کے لیے طرۂ امتیاز بن گئی لیکن فرق اتنا رہا کہ نیؔر صاحب نے اس سلسلے میں حد بندی سے کام لیا۔ نذیؔر نے ان حدود کو ایسی وسعت دی کہ ہندی لغات اور ہندوستانی کلچر کی تمام عام فہم اصطلاحات اور تلمیحات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور اس طرح ایک ایسی راہ نکالی جس کو شاید مستقبل قریب میں اردو کے کاروانِ شعروادب کو اپنی شاہراہ بنانا پڑے۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کا زمانہ نذیؔر کی غزل گوئی کے پروان چڑھنے کا ہے۔ اِن کے تغزل کے اجزائے ترکیبی پر غور کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔ یہاں فقط اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ اس دور میں غزل گوئی کی مسلسل مشق اس کے فنّی تقاضوں کی تکمیل اور شاعرانہ طبیعت نے ان

---

[۱] نذیؔر کو بے تامل شعر کہنے میں بہت مشق ہوگئی تھی۔ ایک مرتبہ نیؔر صاحب کے دولت کدہ پر تشریف لے گیے اور دیکھا کہ نیؔر صاحب فکر شعر میں غرق ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک مصرع ایسا آ گیا ہے جس پر باوجود انتہائی کوشش کے مصرع نہیں لگ رہا ہے۔ مصرع تھا۔

ع ۔یہ کیا خبر کہ آگ تھی اور آشیاں میں تھی۔ نذیؔر نے فوراً مصرع لگایا:

ایک پھول سا کھلا تھا نگاہوں کے سامنے
یہ کیا خبر کہ آگ تھی اور آشیاں میں تھی

نیؔر صاحب بہت خوش ہوئے اور جی کھول کر داد دی۔

[۲] نیؔر صاحب کے اس دور کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

جو مہلت دے تلاطم ناخدا سے پوچھ لیں اتنا
یہاں سے اور کتنی دور ہے ساحل جہاں ہم ہیں
چمن کا ایک اک تنکا قفس میں یاد آتا ہے
پڑا ہے دل نشیمن میں ہمارا اور یہاں ہم ہیں

کے لب ولہجہ میں ایسی منفرد دلکشی پیدا کردی کہ ہر صنفِ سُخن میں ان کے انداز بیان کی مخصوص چھاپ صاف دکھائی دینے لگی۔ یعنی غزل میں حسن بیان پیدا کرنے کے لیے انھوں نے جس کاوش سے کام لیا تھا، اس نے ان کی نظم کو بھی دوسروں سے ممیّز کردیا۔ شعوری طور پر اس بات کا احساس انھیں دیر میں ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی دور کے طرحی مشاعروں کی قافیہ بندی فنی اصولوں کی سخت پابندی اور فن کا راز ضرب و تقسیم نے ان کے تنقیدی شعور کو ایک ایسے فنی قالب میں ڈھال دیا جس کے پیکر میں ان کا تخلیقی جوہر تراشیدہ ہیرے کی صورت میں جلوگر ہوا۔ ماحول کا تقاضا تو یہ تھا کہ نذیرؔ فقط ایک غزل گو بن کے رہ جاتے لیکن ایسا نہیں ہوا ایک حساس دل کے ساتھ قدرت نے انھیں ایک عقل پسند دماغ بھی ودیعت کیا تھا۔ غور وفکر کی صلاحیتوں نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا اور اسی وجہ سے جذبات کی روانی میں بہتے ہوئے بھی وہ حد اعتدال سے پرے نہیں گئے۔ شباب کی سرمستیوں کی ترجمانی انھوں نے بڑے زور وشور سے کی تھی۔ ان کی رندی بعض اوقات بڑے خطرناک نتائج پیدا کردیتی تھی۔ مشاعروں میں بے پناہ مقبولیت سے انھیں ہر وقت فتح مندی اور کامرانی کا سرور رہنے لگا تھا۔ وہ جہاں جاتے تھے ان کے چاہنے والوں کا ہجوم ان کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کی عام فہم اور دلچسپ ورنگین غزلیں ارباب نشاط کے لیے آمدنی میں اضافے کا باعث ہورہی تھیں۔ وہ جس طرف جانکلتے لوگ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ فساد کی حد تک پہونچنے والی اس مقبولیت کے زیر اثر زیادہ امکان یہ تھا کہ نذیرؔ بنارسی بہزادؔ لکھنوی بن کر رہ جاتے لیکن ان کے سیاسی اور سماجی شعور نے ان کو اس بے راہ روی سے بچالیا۔ حسن وعشق کے نغمات الاپنے والا غیر ملکی استبداد کی چکی میں پسنے والے ہندوستانی عوام کی آہ وفغاں سے تڑپ تڑپ اٹھا۔ ۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی نے نذیرؔ کو کھلم کھلا میدان میں آنے کی دعوت دی۔ وقت کی آواز پر لبیک کہہ کر انھوں نے سامراجی نظام کے خلاف پوری طاقت سے آواز اٹھائی۔ اب ان

کے سامنے ایک واضح مقصد تھا۔ ایک صحتمند نظریہ تھا۔ اب وہ بخوبی سمجھ گئے کہ اجتماعی نظریات کی ترجمانی ان کا سماجی فریضہ ہے۔ قومی اجتماعوں میں جب وہ اسٹیج پر آتے تو ان کی انقلابی نظموں کا اتنا پرجوش خیر مقدم اور سواگت کیا جاتا کہ وہ ایک مخصوص روحانی مسرت سے ہمکنار ہو کر اسٹیج سے اترتے ہی اس قسم کی دوسری نظمیں کہنے میں مشغول ہو جاتے۔ یہ نظمیں بہت کم چھپتی تھیں۔ اکثر سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ ان میں سے کچھ نظمیں ۱۹۵۸ء میں معمولی ردّ و بدل کے ساتھ نذیرؔ کے پہلے مجموعہ ''گنگ و جمن'' میں شامل کر دی گئی ہیں لیکن بیشتر ان کے شاعرانہ تغافل کے سبب دیمک کی نذر ہو چکی ہیں۔

حب الوطنی سے سرشار قومی اور انقلابی شاعری کا یہ میدان نذیرؔ کے لیے بالکل نیا نہ تھا۔ وہ آغاز شباب ہی سے نیشنل خیالات کے حامی تھے۔ مسلمانوں کو ایک قوم سمجھنے کا تصور شروع سے ہی ان کے نزدیک ایک محدود اور غیر جمہوری نظریہ تھا۔ وہ سیاسی عقائد کے اعتبار سے جواہر لال جی کے مقلد تھے۔ انھیں آسانی سے گاندھی وادی کہا جا سکتا ہے۔

نذیرؔ کے ان نظریات کی تشکیل میں ان کی بے پناہ وطن پرستی کا جذبہ کارفرما تھا۔ وہ کسی مصلحت کے پیش نظر نہیں بلکہ خود اپنے ضمیر کے اطمینان کے لیے تحریک آزادی میں شامل ہوئے تھے۔ عوام میں قابل رشک مقبولیت نے انھیں عوام کے دکھ درد کو بانٹنا بھی سکھا دیا۔ انھوں نے اپنا راستہ خود متعین کیا لیکن ان کی رہنمائی ان کے پھوپھی زاد بھائی منشی بیتاب نے کی تھی۔ بیتاب جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، نامی شاعر تھے اور اپنے حالات کے تقاضوں کو بخوبی سمجھتے تھے اگرچہ وہ گوشہ نشین تھے لیکن قومی جلسوں میں شرکت کے لیے اکثر خاص طور پر نظم لکھتے تھے۔ مہاتما گاندھی کے نظریات کی تائید میں ایک منظوم کتابچہ ''گھر گھر چرخا'' بھی شایع کیا تھا۔

نذیرؔ کو منشی جی کم سنی ہی سے اپنے ساتھ رکھتے تھے اور اکثر ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی

تعریف کرتے تھے۔ منشی جی کو یافت کے لیے اکثر و بیشتر فرمائشی چیزیں بھی لکھنا پڑتی تھیں۔ کبھی کبھی دو ایک دن کے اندر بہت سے خمسے لکھنے پڑتے تھے۔ اس قسم کی عدیم الفرصتی میں وہ نذیرؔ سے کام لیتے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ رات بھر میں خمسے کے پچاس بند منشی جی نے تیار کیے اس سے کچھ زیادہ یا کم نذیرؔ سے کہلوائے گئے اور دوسرے دن سارے مال کو یک جا کر کے دساور کو بھیج دیا گیا۔ منشی جی مقرر بھی تھے، بنارس کے مشہور کانگریسی لیڈر شیو پرشاد گپت، ڈاکٹر بھگوان داس، شیو و نائک مصر اور مولوی عبدالمجید الحریری سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ کانگریسی جانباز ڈاکٹر عبدالکریم ان کے جگری دوست تھے۔ جلسے میں تقریروں کے ساتھ ساتھ ان کے قومی اشعار پر بھی کافی داد ملتی تھی۔ منشی جی کی شخصیت کا یہ پہلو نذیرؔ کو بہت پسند تھا۔ اپنے پھوپھی زاد بھائی کے دوش بدوش انھوں نے بھی قومی مسائل سے زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دی۔

نذیرؔ کی ابتدائی قومی نظموں میں جو سب سے مقبول نظم تھی اس کا عنوان ہے ''سر اسٹیفرڈ کرپس کے نام''۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں جب غیر ملکی حکومت کی طرف سے ہندوستانیوں کو جنگ میں شرکت کی دعوت دی گئی تو ہمارے رہنماؤں نے ان کی گذشتہ بدقولیوں اور وعدہ فراموشیوں کی بنا پر اسے ٹھکرا دیا اور یہی جذبہ تھا جو بعد میں ۱۹۴۲ء کی تحریک میں شدید صورت اختیار کر گیا۔ ان حالات کے پس منظر میں اب یہ نظم سنیے۔

سر اسٹیفرڈ کرپس کے نام

بن کے غدار آج تم سے اک غلام ابن غلام نظم کے پردے میں چھپ کر ہو رہا ہے ہمکلام
آج لندن سے منانے کو چلے آتے ہو کیوں اب تمہارے سر پہ آئی ہے تو چلاّتے ہو کیوں
تم کو تو معلوم ہے مدت سے طاری ہے جمود پھر ہمارا تذکرہ کیا پھر ہماری کیا نمود

ہم بھی افسردہ ہیں افسردہ دلی جذبات بھی
جنگ کے بارے میں سُن سکتے نہیں اک بات بھی
یاد کر لو دیکھ کر تاریخ کے خونی ورق
اب زمانہ دینے والا ہے تمھیں بھی وہ سبق
نند کو پھانسی کے تختے پر چڑھایا کسنے تھا
لفظ آزادی پہ رحمت خاں کو مارا کس نے تھا
جب کھلیں آنکھیں نہ اختر کا جنازہ دیکھ کر
جب نہ گرمایا لہو ٹیپو کا لاشا دیکھ کر
طشت میں جب رکھ کے تم چھوٹے بڑے سر لائے تھے
جب ظفر کے سامنے ڈالی لگا کر لائے تھے
برہنہ کر کر کے جب تیغوں سے تم کرتے تھے بات
جب اتارے جا رہے تھے بیگموں کے زیورات
ہر گلی کوچے میں جب لٹکی ہوئی تھیں پھانسیاں
اُف بھی کر سکتی نہ تھی جب ہندوالوں کی زباں
تم تھے جب بے چین جلاّ دی کہ شہرت کے لیے
جب امر کی لاش لٹکائی تھی عبرت کے لیے
آپ کے بے دست و پا جب بھی کھڑے سوچا کیے
لٹنے والا لٹ رہا تھا اور ہم دیکھا کیے
خون میں ڈوبی جوانی کا نہ بدلہ لے سکے
تم سے ہم جھانسی کی رانی کا نہ بدلہ لے سکے
جب اضافہ کر رہے تھے تم جگر کے داغ میں
گولیاں چلتی تھیں جب جلیان والے باغ میں
ننھے بچوں پر بھی جب برسا رہے تھے گولیاں
جب بھی ہم خاموش تھے خاموش تھی سب کی زباں
جب نہ جوش آیا تو اب کس طرح جوش آجائیگا
تم ہی سمجھو آج بھی ہم سے نہ سمجھا جائے گا
کل تھے کمزور آج طاقت کس طرح آجائیگی
جب نہ آئی اب شجاعت کس طرح آجائے گی
ہر زمانے میں رہا ہو جس کا خاموشی اصول
ایسے بزدل سے امید سرفروشی ہے فضول
جب بھی ہم خاموش تھے اور آج بھی خاموش ہیں
ہاں مگر اس وقت تھے بیہوش اب باہوش ہیں
ویسے غدار اور غداروں کے افسر اب نہیں
میر قاسم میر صادق میر جعفر اب نہیں
توپ سے بھی خون مشرق گرم ہو سکتا نہیں
آنچ کھا کر بھی یہ لوہا نرم ہو سکتا نہیں

بدیسی حکمرانوں کے خلاف اس قسم کا زہر اگلنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ وہ راستہ تھا جس پر بڑے بڑوں کے قدم لڑکھڑا گئے تھے اور بقول مولانا ظفر علی خاں سرکار کی دہلیز پر کئی اقبال سر ہو چکے تھے۔ لیکن نذیرؔ نے اپنے لیے جو راہ تجویز کی تھی اس پر ہمیشہ رواں دواں رہے۔ ہزاروں دشواریوں اور پابندیوں کے باوجود انھوں نے حق گوئی کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ انھیں سرکاری سرپرستی سے تنفر تھا۔ ملک اور قوم کے لیے انھوں نے عام طور پر اپنے ذاتی مفاد کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ انھیں دنوں ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا جس کا بیان یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جنگ کے دوران فتح ٹیونیشیا کے سلسلے میں جون پور کے قلعہ شاہی میں حکام وقت کی طرف سے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ نذیرؔ اس وقت اپنی شہرت کے بام عروج پر تھے۔ کلکٹر کی طرف سے خواہش ظاہر کی گئی کہ نذیرؔ بنارسی اس مشاعرے میں ضرور شریک ہوں۔ مشکل یہ آپڑی تھی کہ نذیرؔ اس قسم کے سرکاری اجتماع میں شریک نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ انھیں شرکت پر آمادہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جون پور ہی کے ایک وکیل صادق حسین کلکٹر سے بندوق کے لائسنس کے حصول کے لیے کوشاں تھے اور نیرؔ اکبرآبادی کے دیرینہ دوستوں میں تھے۔ انھوں نے کلکٹر کو خوش کرنے اور اپنے لائسنس کے حصول کے لالچ میں نذیرؔ کو لانے کا وعدہ کرلیا۔ صادق حسین نیرؔ اکبرآبادی کو ساتھ لے کر نذیرؔ کے یہاں پہونچے اور ان سے جھوٹ بولا گیا کہ غزل کا مشاعرہ ہے صرف غزلیں پڑھی جائیں گی۔ انگریز کی مدح سرائی نہ ہوگی آپ مطمئن رہیں ہم لوگ اچھی طرح بانیان مشاعرہ سے پوچھ گچھ کر کے آئے ہیں۔ شام کو یہ لوگ نذیرؔ کو ہمراہ لے کر مشاعرہ گاہ میں پہونچے تو سارا راز طشت از بام ہو گیا لوگ ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے اور شعرا میں اکثر و بیشتر انگریز کے پٹھو تھے جو جارج ششم کی مدح سرائی میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ نذیرؔ کی باری آئی تو ان کی زبان درازیوں اور مصلحت وقت

کے پیش نظر ان سے صرف غزل کی فرمائش کی گئی۔ کلکٹر بھی کہہ رہا ہے غزل پڑھیئے۔ نیرؔ صاحب بھی کہہ رہے ہیں: نذیرؔ میاں غزل ہی پڑھیئے گا۔ نذیرؔ اطمینان سے ڈائس پر پہونچے اور درج ذیل انقلابی غزل شروع کر دی، بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ یہ کہہ کے کہ، مطلع ملاحظہ ہو:-

اگر ظالم پہ خنجر آزما لیتے تو اچھا تھا
لہو میں ڈوب کر بیڑا بچا لیتے تو اچھا تھا

وہ لوہا جس سے بنتی ہے ہمارے پاؤں کی بیڑی
اسی کو موڑ کر خنجر بنا لیتے تو اچھا تھا

ہمارے دیش کے دامن پہ دھبّہ ہے غلامی کا
یہ دھبہ خوں بہا کر بھی چھڑا لیتے تو اچھا تھا

جسے اک عمر سے دیتے رہے تھوڑی سی قربانی
وہ جھگڑا اپنے ہی ہاتھوں چکا لیتے تو اچھا تھا

کسی پہلو سے جب دنیا ہمیں زندہ نہ چھوڑے گی
وطن ہی کے لیے ہم سر کٹا لیتے تو اچھا تھا

چلا آتا ہے آگے کروٹیں لیتا ہوا دریا
اب اپنی پیاس اگر ہم بھی بجھا لیتے تو اچھا تھا

تیر کمان سے نکل چکا تھا اور صادق حسین اپنا کام بگڑتا دیکھ کر بار بار نذیرؔ کا دامن کھینچ رہے تھے۔ ادھر سامعین جارج ششم کی قصیدہ خوانی سن سن کر بیزار ہو چکے تھے۔ نذیرؔ کے اشعار کے ساتھ ساتھ انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہونا شروع ہو گئے اور دیکھتے دیکھتے سرکاری دربار کانگریس کا پنڈال بن گیا۔ صادق حسین نے گھبرا کے پیچھے سے نذیرؔ کی شیروانی کھینچی اور ڈائس

سے اتر جانے کے لیے اشارہ کیا۔ نذؔیر سے رہا نہ گیا۔ فوراً مڑ کے بولے وکیل صاحب یہ کیا حرکت ہے۔ پس پھر کیا تھا سامعین نے شور مچانا شروع کر دیا، ہٹاؤ ان ٹوڈیوں کو یہاں سے ہم نذؔیر بنارسی ہی کو سنیں گے۔ اتنے میں نذؔیر نے کہا دوسری غزل پڑھ رہا ہوں۔ سماعت فرمائیں:

وفا والو آنا وفادار بن کر نکلنا نہ میداں میں غدار بنکر
جو ہنسنا تو آنکھیں ملا کر قضا سے جو رونا تو بھارت کے غمخوار بن کر
جو چھانا تو بادل کا بہروپ بھر کے برسنا تو تیروں کی بوچھار بن کر
قدم جب جمانا تو بن کر ہمالہ! ٹھہرنا تو لوہے کی دیوار بن کر
اگر جنگ کرنا غلامی سے کرنا کبھی سر جو دینا تو سردار بن کر
جو جھکنا کماں بنکے ارجن کی جھکنا جو اٹھنا تو ٹیپو کی تلوار بن کر

یکے بعد دیگرے اس قسم کی چھ نظمیں غزل کے نام سے پڑھ کر جب نذؔیر اسٹیج سے اترے تو لوگوں نے انھیں گھیر لیا اور حکام وقت کو دانت پیستا چھوڑ کر پھولوں کے ہاروں میں لدا پھندا جب یہ قومی شاعر نیم شب کے بعد ریلوے اسٹیشن پہونچا تو اسے الوداع کہنے کے لیے کوئی سرکاری آدمی موجود نہ تھا۔ یہاں تک کہ نیرؔ اکبرآبادی اور صادق حسین وکیل بھی لاپتہ ہو چکے تھے۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کا دور نذؔیر کی شاعری کے نکھار کا زمانہ ہے۔ وطن کی محبت، ہندوستانی کلچر سے وابستگی، قوم کے شہیدوں کے لیے جذبۂ عقیدت، سرفروشانِ وطن کے لیے احترام اور آزادی کے حصول کے ساتھ ساتھ نئے ہندوستان کو جادۂ ترقی پر دیکھنے کی خواہش، مزدوروں اور غریبوں کے لیے جذبۂ ہمدردی ہے۔

سارے ہندوستانیوں کو بلا امتیاز ملت و مذہب ایک ہی قوم سمجھنے کا تصور اب ان کے

دل میں ایک محکم اور مستقل عقیدے کی صورت میں جاگزیں ہو چکا تھا۔ ہندوستانی مجاہد، عید کا چاند، جھانسی کی رانی، دیش سنگار، ۱۸۵۷ء کے شہیدوں کی یاد میں، تعارف، پیام وطن، مہا کوی کالی داس وغیرہ اس زمانے میں کہی گئیں اور ہندوستان کے مختلف مشاعروں اور قومی اجتماعوں میں پڑھی گئیں۔ ان میں جذبات کی شدت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی سادگی تھی اس لیے ہر طبقہ کے لوگوں میں بے حد مقبول ہوئیں۔ سورگیہ پنڈت مدن موہن مالوی نے آزادی سے کچھ سال پہلے اور ڈاکٹر بھگوان داس اور بلبل ہند سروجنی نائیڈو نے آزادی کے کچھ سال بعد نذیر کو بلا کر شخصاً ان کے کلام کی تعریف کی اور فرمائش کی کہ وہ اسی انداز میں ملک و قوم کی خدمت کرتے رہیں۔

"ہندوستانی مجاہد" غیر ملکی حکومت کے خلاف قومی جہاد میں شرکت کرنے والے ایک ایسے ہندوستانی سپوت کی عکاسی کرتی ہے جس کے لیے لہو کا ہر چھینٹا ایک گل خنداں اور مقتل ایک گلستاں کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ ظالموں کے دل بیدرد مسلنے کے لیے اور پاؤں سرِ مغرور کچلنے کے لیے ہیں۔ میدان جنگ اس کے لیے ایک سیرگاہ کا کام دیتا ہے۔ گولیاں اس کے پاس آنے سے تھراتی ہیں اور موت آنکھیں ملاتے ہوئی شرماتی ہے۔ وہ ہند کی تلوار ہے گنگا کی طرح لہرانا جانتا ہے جنگ کے میدان میں جمنا کی طرح بل کھانا جانتا ہے۔ وہ میدان کارِزار میں اترتا ہے دریا کی طرح چڑھ جانے کے لیے۔

خون کی دھار کو تفریح کا ساماں سمجھا   دیکھا چھینٹا جو لہو کا گل خنداں سمجھا
کہیں مقتل نظر آیا تو گلستاں سمجھا!   میں مجاہد ہوں مجھے کون ڈرانے والا
گولی آتی نہیں آتے ہوئے تھراتی ہے   اگر آتی ہے تو بچ بچ کے نکل جاتی ہے
موت بھی آنکھ ملاتے ہوئے شرماتی ہے   میں مجاہد ہوں مجھے کون ڈرانے والا

☆……☆……☆

ہند کی تیغ ہوں لہراؤں گا گنگا کی طرح　　عرصۂ جنگ میں بل کھاؤں گا جمنا کی طرح
کبھی اتروں گا تو چڑھ جاؤں گا دریا کی طرح　　میں مجاہد ہوں مجھے کون ڈرانے والا

لکشمی بائی (جس کی جنم بھومی بنارس ہے) عرف رانی جھانسی پر نذیرؔ نے جو نظم لکھی اس کی گونج ایک مدت تک ملک کے گوشے گوشے میں سنائی دی۔ اس نظم میں نذیرؔ نے رانی کے بچپن سے لے کر شہادت تک کے واقعات بڑے موثر انداز میں بیان کیے ہیں۔ پوری نظم محاکاتی رنگ میں ہے۔ ان گنت فرنگی لشکر کے بیچ مردانہ وار لڑتی ہوئی رانی زخموں سے چور ہو کر گر پڑتی ہے۔

یاد تو ہوگا تجھے اے سرزمین گوالیار　　آئی تھی اک شیرنی جب چھوڑ کر اپنا کچھار
کر رہی تھی موت کا سواگت انوکھی شان سے　　ساتھ اپنے لے کے اپنی بیوگی کی یادگار
جس کے دم کے ساتھ دل ٹوٹا تھا ہندوستان کا　　جان جس دیوی نے دی لڑتے ہوئے مردانہ وار
کہتی ہے جس کی سمادھی سر اٹھا کر آج بھی　　میں ہوں کاشی کی امانت میں ہوں کاشی کا وقار
کہہ رہی تھی دیکھ کر ہنستے ہوئے زخموں کے پھول　　واہ رے رنگ گلستاں واہ رے رنگ بہار
اپنی ہی تلوار کا آئینہ رکھ کر سامنے　　اپنے ہاتھوں اپنے بہتے خون سے کر کے سنگار
اوڑھ کے چندری لہو کی پھر سے دلہن بن گئی
جنگ کے میدان میں بیوہ سہاگن بن گئی

۱۹۴۸ء میں حصول آزادی کے ساتھ دیش بھر میں جو انسانیت سوز نظارے دیکھنے میں آئے ان سے متاثر ہو کر بڑے بڑے اصول پرستوں کے قدم ڈگمگا گئے۔ وہ لوگ جو صدیوں سے قوم پرست چلے آتے تھے گھبرا کر رخت سفر باندھنے لگے۔ یہ بڑا نازک وقت تھا۔ اہل وطن تصویر غم بنے ترک وطن پر آمادہ ہو رہے تھے۔ خود نذیرؔ کے بزرگ ساتھی نیرؔ اکبر آبادی جیسے ثابت

قدم راہ راست سے بھٹک چکے تھے۔ چنانچہ نیرؔ صاحب نے اس شعر میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

کنج قفس میں رہتا ہوں پر تول تول کے
صورت قیام کی ہے ارادہ سفر کا ہے

لیکن نذیرؔ کی نگاہ اس دم توڑتی ہوئی رات کے دامن سے ابھرتے ہوئے سویرے کو دیکھ رہی تھی۔ ان کی اس وحشتناک عالم میں کہی ہوئی نظم ''ایک مہاجر دوست سے'' ان کے عقائد اور جذبات کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔

وطن کو تو چھوڑ دے مگر کیا غم وطن تجھ کو چھوڑے گا
وہ ساز کی ہو کہ مطربہ کی ہر اک صدا دکھ بھری ملے گی
وہاں پہ اہل وطن ملیں گے تو وہ بھی تصویر غم ملیں گے
ادا ادا غم زدہ ملے گی نظر نظر شبنمی ملے گی
یہاں کا جب تذکرہ چھڑے گا تو ان فضاؤں میں دم گھٹے گا
بجھی بجھی شمع دل رہے گی دھواں دھواں زندگی ملے گی
نہ کر مجھے موت کے حوالے وطن سے اے دور جانے والے
جہاں تڑپتی ہیں آج لاشیں وہاں پہ کل زندگی ملے گی!
نیا زمانہ نیا سویرا نئی نئی روشنی ملے گی!
یہ رات جب لے چکے گی ہچکی حیات اک دوسری ملے گی

یہی نہیں نذیرؔ نے اس خونریز اور خوں بار دور میں جب کہ مسلمان بھائی راتوں کو گھر سے باہر نکلنے میں بھی خطرہ محسوس کرتے تھے اپنی خود اعتمادی اور ثابت قدمی کو مجروح نہیں ہونے

دیا۔ اس عالم میں بھی جذبات وجرأت سے بھرپور حب الوطنی سے معمور ایک نظم ''تعارف'' کے عنوان سے لکھی اور سب سے پہلے اٹاوہ کے کوی سمیلن میں ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں پڑھی جس کو اس کے بعد پانچ چھ سال تک لوگ بڑے بڑے جلسوں میں پڑھتے رہے۔

ہمیں تھے ہمیں ہیں اَہنسا کے حامی   اتارا ہے ہنس ہنس کے طوق غلامی
سلامی دو اے چاند تارو سلامی   ہمالہ کی چوٹی گندھی جارہی ہے
وطن کی جوانی چلی آرہی ہے

نہیں ہم کو اغیار کی اب ضرورت   ہمارا چمن ہم کریں گے حفاظت
فرشتہ بھی آئے تو لے کر اجازت   فلک یہ نہیں سرزمین چمن ہے
یہ جنت نہیں ہے ہمارا وطن ہے

محبت سے مِل جُل کے باہم رہیں گے   یہ مانا کہ تعداد میں کم رہیں گے
جہاں تم رہو گے وہیں ہم رہیں گے   کسی نے اگر مال وزر دے دئے ہیں
وطن کے لئے ہم نے سر دے دئے ہیں

ہمیں ڈوبنا اور ابھرنا یہیں ہے   ہے گنگا یہیں پار اُترنا یہیں ہے
جئے ہم یہیں ہم کو مرنا یہیں ہے   ہم آباد و برباد بیباک ہوں گے
اسی خاک کے ہیں یہیں خاک ہوں گے

اجل کو گلے سے لگانا گوارا   گوارا لہو میں نہانا گوارا
وطن سے نہیں ہم کو جانا گوارا   وہ جائے کہیں جو یہاں کا نہیں ہے
ہمارا تو سب کچھ تھا یہیں ہے

مٹادے جو دشمن کو وہ دار ہیں ہم   وفادار تم ہو وفادار ہیں ہم!

وطن کی سپر اور تلوار ہیں ہم　　جو دشمن کبھی گرم پیکار ہوں گے
تو ہم پہلے مرنے کو تیار ہوں گے

قدم اور آگے بڑھانا ہے ہم کو　　ابھی دور منزل ہے جانا ہے ہم کو
اک اجڑے جہاں کو بسانا ہے ہم کو　　یہ آزاد ہونے کا حاصل نہیں ہے
یہ منزل کا دھوکا ہے منزل نہیں ہے

اور جب خونی رات ہچکی لے چکی نیا سویرا نمودار ہوا تو جیسے نذیرؔ کو اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آنے لگی۔ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے منزلیں طے کرتے ہوئے کاروان ترقی نے ان کے رگ و پے میں جوش و مسرت کے طوفان برپا کردیے۔ اہل وطن کے عزم جوان کو جوان تر بنانے کا جذبہ ان کے اشعار سے پھوٹ پھوٹ پڑا۔ قاتل فرنگی کی اداؤں سے گمراہ ہو کر دیش ماتا کے سپوت مادر وطن کا لہو تک بانٹ چکے تھے۔ باپو کا خون سرخی داستان بن چکا تھا۔ نذیرؔ ان واقعات کو قوم کے صبر کا امتحان سمجھتے ہوئے اٹل وشواش رکھتے ہیں کہ یہ کاروان ارتقا اب ناقابل تصور بلندیوں کی طرف گامزن ہوگا۔ محنت کشوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

ٹوٹتے ہیں ہزاروں چٹانوں کے سر　　جب کہیں جا کے بنتی ہے اک رہگزر
لاکھوں فرہاد مل کے لڑاتے ہیں جاں　　تب یہ شیریں کہیں ہوتی ہے جلوہ گر
دیکھتے جایئے محنتوں کے نشاں
رک سکے گا نہ روکے سے یہ کارواں

نئی حیات کی تعمیر حسن تدبیر کی محتاج تھی۔ مل جل کے کام کرنے والے ساتھیوں نے یہ میدان بھی سر کرلیا۔ دریاؤں کے رخ پھیر دیے گئے اور طوفانوں کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ نئی کیا ہیں گویا مادر وطن کے سر پر بہت سی مانگیں ہیں۔ دھان کی کھیتیاں نہروں سے شاداب

کھڑی ہیں۔ زندگی ہر طرف کروٹیں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ پھیلتے ہوئے پیڑوں پر نظر ڈالیے کل تک موم کی طرح نرم تھے آج آندھیوں سے ٹکر لینے کے لیے آمادہ ہو رہے ہیں:

پیڑ پیروں پہ اپنے کھڑے ہو گئے   کیا یہ بے پالے پو سے بڑے ہو گئے
آندھیوں سے بھی لینے لگے ٹکریں   موم جتنے تھے اتنے کڑے ہو گئے
بڑھتے جائیں گے سڑکوں کے یہ پاسباں
رک سکے گا نہ روکے سے یہ کارواں
کتنے کھیتوں کے سینے ابھارے گئے   کتنے پودوں کے گیسو سنوارے گئے
تھا نہ پانی جہاں سینکڑوں میل تک   ہم وہاں لے کے دریا کے دھارے گئے
کہہ رہی ہے یہ تر ہو کے سوکھی زباں
رک سکے گا نہ روکے سے یہ کارواں
اپنے پربت کو جب ہم سجانے لگے   ہنس کے آئینے جھرنے دکھانے لگے
حسن اتنا بڑھا غیر ملکوں سے لوگ   آرزو لے کے درشن کو آنے لگے
دیش بن جائے جب تک نہ جنت نشاں
رک سکے گا نہ روکے سے یہ کارواں

وطن کی آزادی سے ملک کا سیاسی ماحول تو بہتر ہو گیا۔ لیکن دولت کی غیر عادلانہ تقسیم نے نچلے طبقوں کو حسب معمول سرمایہ داروں کی آہنی گرفت میں مقید رکھا۔ اقتصادی بدحالی کی چکی میں پستے ہوئے محنت کش عوام اب بھوک سے دم توڑتے نظر آ رہے تھے۔ بنارس بنکروں کا مرکز ہے۔ یہاں کے دستکار دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ بنارسی مال ملک میں بھی کافی کھپتا ہے اور غیر ممالک میں بھی جاتا ہے لیکن ہنر کے ان قیمتی شاہکاروں کو جنم دینے والے ہنر مند ہمیشہ

مہاجنوں اور کوٹھی والوں کی منافع خوری اور زیادتیوں کے شکار رہتے تھے۔ نذیر بنکروں کے ماحول میں پلے تھے ان کا حساس دل ان مظلوموں کی بدحالی پر بہت کڑھتا تھا۔

ستارے جھلملاتے ہیں سویرا ہونے والا ہے

انھیں دیکھو یہی مزدور بنکر ہیں بنارس کے　　جسے چھو دیں وہی سونا یہ وہ ٹکڑے ہیں پارس کے
یہ ہو جاتے ہیں بے دم شام تک دم کے دہانے میں　　بہ باطن قبر کے اندر بظاہر کارخانے میں
مسرت دور اُن سے رنج ان کے پاس رہتا ہے　　یہ دنیا بنکروں کی ہے یہیں افلاس رہتا ہے
زباں کو آشنا کرتے نہیں حرف شکایت سے　　مصیبت ان سے لڑتی ہے یہ لڑتے ہیں مصیبت سے
خوشی کا دن جب آتا ہے تو یہ رنجور ہوتے ہیں　　کوئی تہوار آتا ہے تو یہ چھپ چھپ کے روتے ہیں
اگر بیمار پڑتے ہیں دوا تک کر نہیں سکتے　　ستم یہ ہے کہ مرنا چاہتے ہیں مر نہیں سکتے
کفن آتا ہے چندے سے یہاں کے مرنے والوں کا　　یہی ہے آخری انعام سب کچھ کرنے والوں کا
انھیں کے خون کا گارا ہے ہر اونچی عمارت میں　　انھیں کے خون کی رنگینیاں ہیں بزم عشرت میں
انھیں آنکھوں کی چھینی روشنی روشن مکانوں میں　　انھیں کی آہ کے شعلے ہیں رقصاں رقص خانوں میں
نئے سر سے زمانہ کروٹیں اب لینے والا ہے　　چراغ عیش بجھنے کو ہی ہے لو دینے والا ہے

قسم ان آنسوؤں کی دور اندھیرا ہونے والا ہے
ستارے جھلملاتے ہیں سویرا ہونے والا ہے

ان بنکروں کی زندگی دن بھر کرگھے میں مقید ہو کر ساڑیوں کے تانے بانے میں الجھتی رہتی تھی۔ شام کو جب دن بھر کی تھکن سے چور ہو کر یہ لوگ اپنا مال لے کر مہاجن کے پاس جاتے تھے تو یہ منافع خور سرمایہ دار اول تو مال کا دام اونے پونے لگاتے جب ریزہ خرید لیتے تو دام چکاتے وقت مندر یا مسجد کے نام پر ان کی مزدوری سے کچھ رقم الگ کاٹ لیتے تھے۔ اس کٹوتی کو

معاملے کا جزو خیال کیا جاتا تھا۔ بنکروں کو اس میں دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ ۱۹۵۱ء میں مزدوروں کی بے چارگی اور مہاجنوں کے روزافزوں حرص کے پیش نظر یہ کٹوتی اچانک بہت بڑھ گئی۔ مختلف بہانوں سے ہنرمندوں کو لوٹنے کی کوششیں برابر بڑھنے لگیں۔ انتہائی ضبط کے باوجود آخر ایک دن بغاوت کا لاوا پھوٹ پڑا۔ بنکر اپنے کرگھے چھوڑ کر باہر کھلی فضا میں آگئے۔ بپھرے ہوئے مزدور اب کسی کی سننے کو تیار نہ تھے۔ نذیر اب تک عوام کے دل کی دھڑکنوں کے ترجمان بن چکے تھے۔ ان کی ساری ہمدردیاں مزدوروں کے ساتھ تھیں۔ مہاجنوں کے خلاف اسّی ہزار بنکروں کا لمبا جلوس ٹاؤن ہال پہونچ کر جلسے میں تبدیل ہوگیا۔ اس اسّی ہزار بنکروں کے مجمع میں نذیر کی آواز سب سے موثر ثابت ہوئی۔

کب تلک زخم ہنس کے کھائیں گے ہم　　کب تلک چوٹ دل کی چھپائیں گے ہم
ناتوانی کو طاقت بنائیں گے ہم　　موت سے زندگی چھین لائیں گے ہم
اس کٹوتی کی میت اٹھائیں گے ہم

پورے دن قبر میں جسم آدھا رہے　　گھر میں اس پر بھی اک وقت فاقا رہے
بھوک سے گرم تن سرد چولہا رہے　　اس طرح خون کب تک جلائیں گے ہم
اس کٹوتی کی میت اٹھائیں گے ہم

کون کس کی ہنسی چھین کر شاد ہے　　کون کس کے اجڑنے پہ آباد ہے
کس کے لاشے پہ کوٹھی کی بنیاد ہے　　تم بتاؤ تمھیں بھی بتائیں گے ہم
اس کٹوتی کی میت اٹھائیں گے ہم

سونے چاندی کے ہیروں کے لخت جگر　　اونچی اونچی حویلی کے جان پدر
بھاری بھاری تجوری کے نورِ نظر　　اب کچھ اپنے لیے بھی کمائیں گے ہم
اس کٹوتی کی میت اٹھائیں گے ہم

جس میں چہروں کا چھینا ہوا نور ہے   جس کی رفتار میں آہ مجبور ہے
جس کے پٹرول میں خون مزدور ہے   ایسے موٹر کی دھجی اڑائیں گے ہم
اس کٹوتی کی میت اٹھائیں گے ہم

تم سے آباد ہوٹل بھی ہیں بار بھی   تم سے کوٹھے بھی کوٹھے کے بازار بھی
تم کو نفرت بھی تم ہی خریدار بھی   پاپ کرنے سے تم کو بچائیں گے ہم
اس کٹوتی کی میت اٹھائیں گے ہم

وارث ہندو ہندوستاں زاد ہیں   ہم بھی اس دیش ماتا کی اولاد ہیں
تم ہو آزاد تو ہم بھی آزاد ہیں   اب غلامی کی لعنت ہٹائیں گے ہم
اس کٹوتی کی میت اٹھائیں گے ہم

ایسے جینے کی ہم کو ضرورت نہیں   اب تو یا ہم نہیں یا مصیبت نہیں
گر ہماری حکومت کو فرصت نہیں   خود حکومت تلک لے کے جائیں گے ہم
اس کٹوتی کی میت اٹھائیں گے ہم

آناً فاناً یہ نظم گویا بے زبانوں کی زبان بن گئی۔ کٹوتی کی تحریک کے بھڑنے میں ان اشعار نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مختلف روزناموں نے بنکروں کی حمایت میں جو اداریے لکھے ان کا عنوان بھی ''اس کٹوتی کی میت اٹھائیں گے ہم'' قرار پایا۔ آخر آتے آتے وہ دن آیا کہ مہاجنوں کو جھکنا پڑا اور کٹوتی کی تحریک ختم کردی گئی لیکن مہاجنوں کی جھنجھلاہٹ کچھ دنوں تک باقی رہی۔ نذیرؔ کی ایک اور نظم ''کٹوتی کا دسواں'' اس کیفیت کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ ایک مہاجن نے جھنجھلاہٹ میں ایک کاریگر کو طمانچہ لگا دیا تھا نظم کے دوسرے بند میں اسی طرف اشارہ کیا۔

کٹوتی کا دسواں

بتاؤ تو جھنجھلائے جھنجھلائے کیوں ہو   کہو آج بل کھائے بل کھائے کیوں ہو
یہ ناگن سے لہرائے لہرائے کیوں ہو   ادا تیغ بن کر چمکنے لگی کیوں
نظر برق بن کر کڑکنے لگی کیوں

بگڑنے پہ آئے بگاڑی زباں تک   سنا ہے سنائی گئیں گالیاں تک
شرافت بڑھی بڑھ کے آئی یہاں تک   طمانچے نہیں بلکہ جوتے لگادو
یہ مزدور جس طرح جاگیں جگادو

مہاجن گیا ہم اسامی نہیں اب   جبیں کوئی بہر سلامی نہیں اب
کہ یہ دَور دورِ غلامی نہیں اب   سمندر کے پار اب ہے گورا مہاجن
پکارے گا کس کو ہمارا مہاجن

ہیں نوّاب لیکن جلالت کہاں ہے   ہیں راجہ تو اب بھی ریاست کہاں ہے
لہو ہے وہ ظالم حرارت کہاں ہے   نہ اب تخت کوئی نہ گدّی رہے گی
جو حالت ہماری وہ سب کی رہے گی

سجاتے ہو گھر کیوں وطن کو سجاؤ   گھٹا بن کے چھا جاؤ چھاکر دکھاؤ
وہ بھولی تمھیں تم اسے بھول جاؤ   چمک اس کی جھوٹی تھی ہیرا نہیں تھی
وہ ظالم سوپنکھا تھی سیتا نہیں تھی

تمنا ہنسے آرزو مسکرائے   ہر اک دل کو اللہ جنت بنائے
وہ ظالم تھی ظالم جہنم میں جائے   کٹوتی گئی کٹ گئیں سب بلائیں
تم آؤ تو مل جل کے دسواں منائیں

اردو شاعری پر ایک بہت بڑا الزام جو آج تک اسے نیچا دکھانے کے لیے برابر عائد کیا جارہا ہے وہ اس کی غیر ملکی فضا اور بدیسی ماحول ہے۔ عربی و فارسی شاعری کے تاثرات کا جواز ایک طرف۔ حقیقت یہ ہے کہ عام طور پر ہمارے شعرا نے خود اپنی ملکی کیفیتوں سے لطف اندوز ہونے کی بجائے اکثر ایران اور عربستان کی فضاؤں میں سانس لینے پر فخر محسوس کیا ہے۔ ہندوستانی کلچر کا دل ہندی اور سنسکرت لٹریچر میں دھڑکتا ہے جس کے مطالعہ سے اردو شعرا اکثر و بیشتر بے نیاز رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار آ گیا جسے انھوں نے اردو کے قلعہ معلیٰ کو مسمار کرنے کے لیے ہر قدم پر استعمال کیا۔ ایک منصف مزاج کی نظر میں اردو شاعری پر یہ اعتراض اگر کاملاً صحیح نہیں تو اسے یکسر غلط بھی نہیں کہا جا سکتا۔ خود اردو دانوں نے ایک مدت تک اس کی پرواہ بھی نہیں کی بلکہ اس الزام کو الزام ہی نہیں سمجھا گیا کہ اُسے دور کرنے کی فکر کی جاتی۔ جن شعرا کے یہاں ہندوستانیت کے عناصر بدرجہ اتم موجود تھے انھیں اکثر شاعر ہی نہیں سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ ابھی کچھ برس پہلے تک قطب قلی شاہ کی شاعری دکن کے ایک محلی لہجے میں محدود خیال کی جاتی تھی اور نظیرؔ اکبر آبادی ایک تک بند درویش سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ موجودہ دور میں بھی خالص ہندوستانی کلچر اور ماحول کی ترجمانی اکثر مصلحت وقت کی مرہون منت ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی نظر آتے ہیں جن کا خلوص معنی خیز نتائج پیدا کر رہا ہے۔

اس طرح تلمیحات میں بدیسی حوالے وہ لطف پیدا نہیں کر سکے جو اپنے یہاں کی اپماؤں میں ہے۔ عاشقوں کو افسانۂ قیس سنا سنا کر اور محبوباؤں کو لیلے بنا بنا کر اردو والوں نے اپنا کیس کافی کمزور بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شکنتلا، دشینت، نل اور دمینتی کے مقابلہ میں شیریں فرہاد اور وامق عذرا بیگانے ہیں اور صرف بیگانوں سے وابستگی اپنوں سے قطع تعلق کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح زبان و بیان کا مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ ہر موضوع کے لیے مخصوص قسم کا لب و لہجہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی کلچر کی نیچرل ترجمانی ہندوستانی لغات سے ہی کی جا سکتی ہے۔

ہمارے رسوم ورواج مخصوص اصطلاحات رکھتے ہیں ان کے مترادفات عربی اور فارسی میں تلاش کرنا بے کیف تضیع ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد میں یہ بات یہاں پوری ذمہ داری سے کہنا چاہتا ہوں کہ مذکورہ نظریات کو نذیؔر نے اچھی طرح سمجھا اور پرکھا ہے۔ کاشی شنکر کی راجدھانی ہے اور نذیؔر بنارسی پشیتنی کاشی نواسی ہیں۔ ان کے کلام میں شنکر کی جٹاؤں سے نکلی ہوئی گنگا کی روانی بھی ملتی ہے اور گنگا جل کی پاکیزگی بھی۔ ان کے یہاں بنارس کے حسن اور رعنائی کے ساتھ ساتھ طہارت بھی ملتی ہے اور خلوص نیت بھی۔ ان کے اشعار میں عرفان ومعرفت کے بھرپور جلوے ہر جگہ برق پاشیاں کرتے نظر آتے ہیں۔

کاشی نگری سے جو آئے لے کے گنگا جل نذیؔر
منھ پہ وہ چھینٹے دیے سب کی نگاہیں ڈھل گئیں

☆

رسوا ہے نذیؔر اپنے ہی بت خانے کی حد میں
دیوانہ اگر ہے تو بنارس کی گلی کا

☆

کاشی کا مسلماں ہے نذیؔر اس سے بھی ملیے
اس کا بھی اک انداز فقیرانہ نیا ہے

☆

نذیؔر آئے تھے پینے آبِ زمزم
لیے تھے ہاتھ میں گنگا جلی بھی

☆

کاشی نگری کی خاک ہوں پیارے
بتکدہ ہے مرا نواس استھان

☆

سجدہ وہ بھی بتوں کے جھرمٹ میں
کتنا مضبوط ہے میرا ایمان

☆

مرے بعد اے بتان شہر کاشی
مجھ ایسا اہل ایماں کون ہوگا
کرے ہے عین بتخانے میں سجدہ
نذؔیر ایسا مسلماں کون ہوگا

☆

کاشی نگری نذؔیر اپنی نگری
بت کے ہم اور ہر بت ہمارا

☆

سُن رہا ہوں نذؔیر ایسا مومن
بت کدے میں لگاتا ہے پھیرا

☆

مرا من ہے شہر گوکل کی طرح سے صاف ستھرا
مری سانس ایسی جیسے کوئی بانسری بجائے

مری ایک آنکھ گنگا مری ایک آنکھ جمنا
مرادل خود ایک سنگم جسے پوجنا ہو آئے

نظم ''چاندنی رات ہے گنگا کے کنارے چلیے'' اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ بنارس کے گھاٹ اس انداز سے شاید برسوں کے بعد کہیں جلوہ گر ہوئے ہوں۔ شیخ علی حزیںؔ سے جاں نثار اختر تک کو یہاں کے گھاٹ پر سوائے کنواریوں اور پری رخوں کے اور کسی چیز کا وجود نہیں ملا۔ بھیگے آنچل، سینوں کے ابھار، شاداب بدن اور ارغوانی چہروں کی تاک جھانک یا ایرانیوں کی اصطلاح میں چشم چرانی کے لیے اس سے بہتر کوئی اور مقام ان کی نظر میں نہیں۔ سعادت یار خاں رنگیںؔ جیسے بوالہوس گھاٹ کے چکر لگا رہے ہیں تو محض اس لیے کہ عورتوں کو کپڑے بدلتے ہوئے دیکھیں اور پانی میں وہ آگ لگتی دیکھیں جس سے ان کے جنسی جذبات کے اشتعال کا سامان ہو جائے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اک سمت بنییاں ہیں خوش رو! بنگالنیں ایک رُخ ہیں دل جو
چھینٹوں سے پڑے ہیں ایک سے ایک دیکھے ہیں کھڑے انھیں بد و نیک
پیہم کوئی غوطہ ہے لگاتی! کوئی لے ہے چھپا دکھا کے چھاتی
کوئی پھرتی سے دکھانے کو پیٹ ہنس کر جاتی ہے پانی پر لیٹ
پہنے ہے کھڑے ہی کوئی پوشاک
ننگی ہی کھڑی ہے کوئی بے باک

(سعادت یار خاں رنگیںؔ)

اس حمام میں آکر بہت بڑے بڑے بزرگ بھی ننگے ہو گئے ہیں۔ صفیؔ لکھنوی شیعہ کانفرنس میں شرکت کے لیے بنارس آتے ہیں لیکن قوس قزح کے رنگ میں ڈوبی ساڑیوں کے

پیچھے چمکتے ہوئے آفتابی بدن انھیں گھاٹ پر کھینچ لاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دیکھ کر آب رواں میں حسن کی دلکشن بہار
صاف سینوں سے جوانی کی امنگیں آشکار
جال پھیلائے ہوئے پانی پہ زلف تابدار
بال کا باندھا چلا آتا ہے جس میں خود شکار

دیندار کی نگاہیں بتان کافر ادا کے بدن کو کس پھرتی سے ٹٹول رہی ہیں، سماعت فرمائیے:

حُسن کا شیوہ اسی پردے میں ٹھنڈی گرمیاں
کوندتی ہیں ابر کے اندر ہی اندر بجلیاں
ضوفشاں سورج سے لیکن ہٹ گیا بادل جہاں
خود کہے گی طاقت نظارہ دے کر امتحاں
جامہ زیبی سے دو بالا شان محبوبی ہوئی
ساریاں قوس وقزح کے رنگ میں ڈوبی ہوئی

اور یہیں تک بس نہیں۔ یہ بزرگ اس نظارہ بازی کے بعد بتانِ دیر سے چھیڑ خانی پر بھی اتر آتے ہیں:

جھومتے نکلو بنارس میں جدھر بھی سیر کو
چھیڑ کر کلمہ پڑھاؤ ان بتان دیر کو

اس اخلاق سوز ذہنی عیاشی کے مقابلے میں نذؔیر نے بنارس کا انتہائی پاکیزہ اور صحیح تصور پیش کیا ہے۔ صفؔی کے بعد اب بنارس کے گھاٹ کا نظارہ ان کی آنکھوں سے کیجیے۔ گنگا کا

تقدس اور شنکر کی ترلوک سے نیاری نگری کا احترام ہر وقت ان کے پیش نظر ہے۔ وہ گھاٹ پر جاتے ہیں تو روح تلسی اور روح کبیر کی زیارت کے لیے گنگا ماں کی طرح آغوش پھیلائے نظر آتی ہے۔ ماحول کی پاکیزگی بیمار روحوں کو شفا بخشتی ہے۔

''چاندنی رات ہے گنگا کے کنارے چلیے'' کے چند بند ملاحظہ فرمایئے:

ایک کیلاش پتی کی ہے سنواری نگری
کوئی نگری نہیں اس نگری سے پیاری نگری
اپنی نگری تو ہے ترلوک سے نیاری نگری
کیوں نہ ہم لوگ ہوں ترلوک سے نیارے چلیے
چاندنی رات ہے گنگا کے کنارے چلیے

☆......☆......☆

ماں کی ممتا وہاں پریم وہاں پیار وہاں
جتنے سپنے ہیں نظر آئیں گے ساکار وہاں
آتما رہ نہیں سکتی کبھی بیمار وہاں
ہیں دکھی آپ تو ہم درد کے مارے چلیے
چاندنی رات ہے گنگا کے کنارے چلیے

☆......☆......☆

چپ ہے ماحول مری رام کہانی کی طرح
رات پاکیزہ ہے سیتا کی جوانی کی طرح
پھیلی جاتی ہے گمک رات کی رانی کی طرح

ہوتے جاتے ہیں اشاروں پہ اشارے چلیے
چاندنی رات ہے گنگا کے کنارے چلیے

☆……☆……☆

ہوں گے گھاٹوں پہ رشی اور منی پیرو فقیر
روح تلسی بھی وہیں ہوگی وہیں روح کبیر
اپنی پوجا میں ہوں سب پریم کی پوجا میں نذیرؔ
آرتی آپ کے بن کون اتارے چلیے
چاندنی رات ہے گنگا کے کنارے چلیے

☆……☆……☆

گنگا کے تین روپ میں گنگا خالص ہندوستانی روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں:

ملا ہے گنگا کا جل جو نرمل اتر کے اوشا نہارہی ہے
ہوا ہے یا راگنی ہے کوئی ٹہل کے وینا بجارہی ہے
اندھیرے کرتے ہیں صاف رستہ سواری سورج کی آرہی ہے
کرن کرن اب کلس کلس کو سنہری مالا پہنارہی ہے
ہوئی ہے کتنی حسین گھٹنا نظر کی دنیا سنور رہی ہے
کرن چڑھی تھی جو بن کے مالا وہ دھوپ بن کر اتر رہی ہے
پہن کے آب رواں کی ساڑی رواں ہے سیماب دار گنگا
رواں ہیں موجیں کہ ماں کے دل کی طرح سے ہے بیقرار گنگا

وہ چھوت ہوں یا اچھوت سب کا اٹھا کے چلتی ہے بھار گنگا
یہاں نہیں اونچ نیچ کوئی اتارے ہے سب کو پار گنگا
نذیرؔ انتر نہیں کسی میں سب اپنی ماتا کے ہیں دلارے
یہاں کوئی اجنبی نہیں ہے نہ اس کنارے نہ اس کنارے

اسی انداز میں ایک رباعی ملاحظہ ہو:

ڈھانکے ہے ہر اک قوم کو اک آنچل سے
پاکیزگی ملتی ہے اسی کے بل سے
گنگا کی طہارت کوئی ان سے پوچھے
جو روز وضو کرتے ہیں گنگا جل سے

ہندوستانی دیومالا سے نذیرؔ بخوبی واقف ہیں، اسی لیے ان کے یہاں تشبیہات اور ایماؤں میں ملکی عنصر کا غلبہ ہے۔ ان کے یہاں اس قسم کے اشعار کی کثرت ہے۔ چنانچہ ایک ہی نظر میں بہت سے اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں:

مرے خیال نے پہونچا دیا ہے کس کے پاس
شکنتلا کی انگوٹھی کی طرح گم ہیں حواس
زمانہ ہوگیا بن سائیں سائیں کرتا ہے
تمہارے بعد کسی کو نہ مل سکا بن باس

☆......☆......☆

پھر چیر ہرن کے بعد کوئی ننگی نہیں اتری جمنا میں
ہر ایک کا پردہ رکھا ہے اس پردہ اٹھانیوالوں نے

☆......☆......☆

ہر صبح کے لب پر کسی رادھا کا تبسّم
ہر شام کے پردے میں کسی شیام کا ڈیرا
کسی کے کان بھرنے میں اجودھیا ہوگیا خالی
ذرا سی گھر کی ان بن اور بن تک بات جا پہنچی

☆......☆......☆

رباعی

شبنم کی طرح شعلہ بیانی اپنی
گنگا کی طرح نرم روانی اپنی
راون کی طرح پوچھ رہے ہیں وہ مزاج
ہم کیسے کہیں رام کہانی اپنی

☆......☆......☆

گل چاہا جو اوروں نے لگا گلشن ہاتھ
مجھ کو تو لگا خالی مرا دامن ہاتھ
مجھ چھوٹے سے قد والے کا کیا ہوگا رام
لنکا میں جسے دیکھو وہی باون ہاتھ

☆......☆......☆

سادھو ہے نذیؔر اپنا نا گوسائیں ہے
کہتا ہے پتے کی وہ بڑا کائیں ہے

سب لوگ سمجھتے ہیں جسے شام اودھ
شنکر کی جٹاؤں کی وہ پرچھائیں ہے

مہاکوی تلسی داس جی ساون کے مہینے میں تیج کو پیدا ہوئے تھے اور ستمی کو ان کا دیہانت ہوا تھا۔ ولادت اور وصال میں چار روز کا فرق نذیرؔ کے لیے بہت اہم ہے:

تیج کو آئے ستمی کو گئے   آنے جانے میں ایک راز بھی ہے
ساری دنیا کو یہ بتانا تھا   زندگی صرف چار دن کی ہے

ہندوستان کی قدیم تہذیب سے نذیرؔ کو والہانہ عقیدت رہی ہے ان کی اکثر تخلیقات میں یہ جذبہ کچھ اس انداز سے نمایاں ہے کہ قاری کو یقین ہونے لگتا ہے کہ نذیرؔ کو سنسکرت اور ہندی کے کلاسیکل لٹریچر سے گہری واقفیت ہے۔ آج سے کوئی آٹھ سال پہلے مہاکوی کالی داس پر نظم کہنے کے لیے کئی زبانوں کے شعرا کو دعوت دی گئی تھی۔ ہندی کے شعرا کی تعداد زیادہ تھی لیکن جب ایک ہی اسٹیج پر یہ بیک وقت ساری نظمیں پڑھی گئیں اور نذیرؔ نے اپنی نظم سنائی تو ڈاکٹر سمپورنانند نے جو اس بزم کے صدر بھی تھے نذیرؔ کی نظم کی پاکیزگی اور بحر کے انتخاب کی داد ایسے خاص انداز سے دی کہ جیسے حاصل بزم یہی نظم ہو۔ یہ نظم عجلت میں لکھی گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے کالی داس کی روح کو چھولیا ہے۔ میگھ دوت کے خالق کو پہلے بند میں جلوہ گر دیکھیے:

ہر حسین منظر کی آڑ میں گذر ان کا   ہنس پڑے ادھر جلوے رخ ہوا جدھر اُن کا
ان کو سب سے ہے نسبت وہ ہیں شاعر فطرت   ہر کلی میں دل ان کا پھول میں جگر اُن کا
ہر ہوا کے جھونکے میں کالی داس کا قاصد   ہر پہاڑ کا جھرنا ایک نامہ بر اُن کا
ان کا رتھ ہر اک پتھ پر وہ خیال کے پتھ پر   ہر جگہ قیام ان کا ہر طرف سفر اُن کا

کالی داس تنہا بھی اور پوری محفل بھی
راہرو بھی رہبر بھی راستہ بھی منزل بھی

اب انھیں شکنتلا کے جنم داتا کی حیثیت سے ملاحظہ فرمایئے:

چھا گئے ہیں دنیا پر بن کے درد کا بادل — آنسوؤں کی بھاشا میں لکھ گیے ہیں شاکنتل
آشرم کی ویرانی غم اور اتنا طوفانی — کانپ کانپ اٹھے پنچھی چیخ چیخ اٹھا جنگل
اک شکنتلا کا غم اور سب کی آنکھیں نم — پھوٹ کر رشی روئیں روئے ہرینوں دل
لوگ پڑھتے جاتے ہیں ہوش اڑتے جاتے ہیں — عشق کی کہانی کیا جو بنا نہ دے پاگل
سر جھکانا پڑتا ہے ایک ایک اپما پر
کالی داس چھائے ہیں آج ادب کی دنیا پر

نذیرؔ بہت پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ ان کے پاس غالبًا ایک بھی تعلیمی دم چھلا نہیں ہے۔ انھوں نے مکتب کے علاوہ جو کچھ سیکھا ہے اپنے گھریلو ماحول سے۔ ان کی ذہنی تربیت ایک حد تک ان کے بڑے بھائی حکیم محمد یٰسین صاحب مسیحؔ کی بھی مرہونِ منت ہے۔

نذیرؔ نے غائبانہ طور پر اپنے دوسرے بزرگوں اور رفقا کی ہم نشینیوں سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان ہم نشینوں میں بنارس کے تربیت یافتہ ان پڑھ بھی شامل رہے ہیں اور جگرؔ، فراقؔ، مخدومؔ، مجازؔ، مجروحؔ، مسعود اختر جمال اور سلام جیسے شیریں سخن بھی۔ اردو کے باکمالوں کے ساتھ ساتھ دو ہندی کے مقتدر ادبا اور شعرا سے بھی بہت قریب رہے ہیں۔ ڈاکٹر سمپورنا نند جی، ہزاری پرشاد دویدی، ڈاکٹر راج بلی پانڈے، ونود شنکر ویاس، کرشن دیو پرشاد گوڑ، اور پنڈت کانتا پرشاد جی، نذیرؔ کے مداحوں میں ہیں۔ ڈاکٹر ہربنس رائے بچن ان کو اور ان کے کلام کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جدید اُردو شعرا کی عام روش کے برعکس ان کے

یہاں ایک طرف فارسی اور عربی کے الفاظ گھلے ملے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف بھاشا کی شیرینی کی خوش مزہ آمیزش ان کے کلام کو ہر ہندوستانی کے لیے نہایت آسان اور عام فہم بنا دیتی ہے۔ ہندوستانی موضوعات کے لیے انھوں نے ہندوستانی زبان کو اس چابکدستی سے استعمال کیا ہے کہ اسٹیج اور کاغذ دونوں پر ان کی ہر دل عزیزی قابل رشک محسوس ہوتی ہے۔ ان کے کلام کو اگر اردو ہندی کا سنگم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اردو والوں نے ہندی والوں سے اور ہندی والوں نے اردو والوں سے ہمیشہ بے اعتنائی برتی ہے لیکن موجودہ دور میں یہ بات دونوں زبانوں کے حق میں بہت مضر ثابت ہو رہی ہے۔ ہندی بغیر اردو کی شان وشوکت کے ادھوری ہے۔ اسی طرح بغیر ہندی کی شیرینی کے اردو نامکمل ہے نذیرؔ اس بات کو عملی طور پر محسوس کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اردو اور ہندی والوں کے درمیان آج ایک پل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لوگ مشاعروں سے زیادہ انھیں کوی سمیلنوں میں سننے کے مشتاق رہتے ہیں۔ یو. پی. کے دیہات میں جہاں لوگ محض ہندوستانی سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں شاید نذیرؔ سے زیادہ مقبول شاعر اردو اور ہندی شعرا میں ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے گا۔ ہندی کے روزناموں میں وہ اردو کے شاعر کی حیثیت سے چھپتے ہیں لیکن خود ہندی کے شاعر ان کی زبان اور ان کے پاکیزہ اسلوب کو اس قدر پسند کرنے لگے ہیں کہ چند مشہور شعرا کے یہاں نذیرؔ کی پیروی میں ہندی غزلیں دیکھنے اور سننے میں آ رہی ہیں۔ شاید دوسری زبانوں کو متاثر کرنے کا اس سے اچھا طریقہ اردو والوں کے پاس اور کوئی نہیں۔ یوں تو نذیرؔ کا بیشتر کلام ہندوستانی میں ہے لیکن کہیں کہیں اردو اور ہندی کا امتزاج بہت پر تاثیر نظر آتا ہے۔ ہندی کے پرسدھ کوی نرالا کا مرثیہ بہت سے ہندی والوں نے لکھا لیکن نذیرؔ نے جو مرثیہ لکھا اپنی سادگی اور خلوص کے سبب لوگوں کے دل میں اتر گیا۔ اس کے کچھ بند سنیے:

ہوک دل سے اٹھی آنکھ نم ہوگئی
آج گنگا کی اک موج کم ہوگئی

☆

ماں[۱] ترے ساز کا تار ٹوٹا ہے کیا   آج آواز میں زندگی کیوں نہیں
کیوں ہے مرجھائی جوہی کی اک اک کلی   آج بیلا کے منہ پر ہنسی کیوں نہیں
گیت گنج اس قدر آج مدھم ہے کیوں   کیسا پیغام گائک کے نام آگیا
سوگ میں کیوں ہے آرادھنا ارچنا   کیا کوئی شکتی پوجا کے کام آگیا

☆

شبد اس کے اٹل جیسے انگد کے پاؤں   کلپنا میں ہمالہ کی اونچائیاں
اس کی چپ اس کی گمبھیرتا کی دلیل   اس کے دل میں سمندر کی گہرائیاں

☆

وقت نے کردیا سانس لینا محال!   ایسے ماحول میں بھی وہ جیتا رہا!
سب کو ہنس ہنس کے دیتا رہا زندگی   اور خود زہر کے گھونٹ پیتا رہا

بہت دن پہلے الہ آباد مسلم ہوسٹل کے ایک طرحی مشاعرے میں سر تیج بہادر سپرو نے جو مشاعرے کے صدر تھے نذیرؔ کا کلام سن کر سر مشاعرہ فرمایا تھا کہ اگر اردو یہی ہوتی جو نذیرؔ کی غزل کی زبان ہے تو اردو کو یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے۔ یہ پیشنگوئی آج اس زبان پر جتنی صادق آئی ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہیں آئی۔ ضرورت ہے کہ زبان کے اس پہلو کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔

---

[۱] پہلے اور دوسرے بند میں نرالا جی کی چھ تصنیفات کے نام بھی آگئے ہیں۔

''جواہر سے لعل تک'' میں نذیرؔ کی بیشتر وہ نظمیں آپ کی نظر سے گذریں گی جو انھوں نے ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۶ء تک کے عرصہ میں کہی ہیں۔ ان نظموں میں اس دور کے ہندوستان کی اجتماعی زندگی کا بھرپور عکس موجود ہے اور بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کی روح براہ راست پڑھنے والے سے ہم کلام ہو رہی ہے۔ ان میں اکثر نظمیں ہنگامی موضوعات پر لکھی گئی ہیں اور اخباروں، رسالوں اور ریڈیو کے توسل سے لاکھوں پڑھنے اور سننے والوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ قبول خاطر و لطف سخن خداداد ہونے کے سبب نذیرؔ کی یہ باتیں منھ سے نکلتے ہی افسانہ بن جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں لیکن خود شاعر کی بے اعتنائی کے پیش نظر آج تک انھیں یک جا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ اس صورت میں لانے کے لیے انھیں مختلف ہندی اور اردو رسالوں سے فراہم کیا گیا ہے۔ کچھ نظمیں ریڈیو والے بالا ہی بالا لے اڑے تھے کچھ احباب کے پاس محفوظ تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ان سب کو ایک ہی لڑی میں پرونے کا خیال مصنف کے ہونہار اور سعادت مند صاحبزادے ظہیر میاں کے دل میں پیدا ہوا اور اس طرح انھیں ''جواہر سے لال تک'' کے نام سے پہلے اردو میں اور بعد میں ہندی میں شایع کیا جا رہا ہے۔

''منالیں پہلے ہولیاں''، ''بچاؤ وطن کا شیوالہ بچاؤ''، ''ایسی طرح دیپ جلا''، ''توانائی''، ''اس وقت غزل کی بات نہ کر'' نظمیں چینی حملے کے وقت لکھی گئی ہیں اور بھارتی عوام کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ نہرو جی سے نذیرؔ کو والہانہ عقیدت رہی ہے اس لیے مرحوم کی یہ چھیاسٹھویں سالگرہ والی نظم بھی اس میں شامل کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی موت کے بعد کی نظمیں ہیں۔ ''شردھانجلی'' ''جواہرات'' ''راکھ کی ساکھ'' ''دور جانا ہے سونے سے پہلے'' ''تربینی سے گنگا تک'' ''پھول سے جن کو پیار بہت تھا اٹھ گیا ان کا پھول''

ایک دو ہفتہ میں نہرو جی پر اتنے مرثیے لکھنا نذیرؔ کے خلوص اور ارادت مندی کی دلیل ہے۔

رن کچھ کے واقعات کے بعد ہند اور پاکستان میں جو سمجھوتہ ہوا تھا اس کی رو سے کچھ بھارتی علاقہ شاید پاکستان کے زیر اثر آ گیا تھا۔ نذیرؔ اپنی دھرتی کا ایک چپہ بھی غیروں کے قبضہ میں دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے۔ ان حالات سے متاثر ہو کر انھوں نے جو نظم قلم برداشتہ لکھی ہے اس کی نظیر اس موضوع پر لکھی جانے والی نظموں میں نہ ہندی میں ملے گی نہ اردو میں۔ اس نظم کا عنوان ہے ''شنکر کا پیغام بھارتی سینا کے نام''۔ یہ اگست ۱۹۶۵ء یعنی ہند و پاک جنگ سے ٹھیک ایک ماہ پہلے شایع ہوئی تھی۔ حکومت ہند سے براہ راست اختلاف کرنا شاعر کے لیے کوئی خاص موثر بات نہ ہوتی۔ بنارس کو شنکر بھگوان کی راجدھانی کہا جاتا ہے اس انوکھی نظم میں شنکر براہ راست ہندوستانی فوج کو حکم دیتے ہیں کہ دشمنوں کو سرحد سے پرے پھینک دیا جائے۔

کبھی کشمیر کا دیا اک انگ   کبھی تبت گنوا کے بیٹھ گئے
کبھی نیفا پہ دے دیا قبضہ   تو کبھی کچھ لٹا کے بیٹھ گئے
جن کو آتا ہے جان دینا وہ   اپنی دھرتی نہیں دیا کرتے
دھرتی ماتا ہے اور ماتا کا   بیٹے سودا نہیں کیا کرتے
میں ہوں شنکر پیام دیتا ہوں
تم کو آج اپنی راجدھانی سے

ایک خاص بات جو اس نظم میں نظر آتی ہے وہ جنگ کے بارے میں شنکر کی پیشنگوئی ہے۔ جس وقت یہ نظم لکھی گئی تھی پاکستان سے جنگ کا کوئی امکان نہ تھا لیکن اس نظم میں جن واقعات کی پیش بینی کی گئی تھی وہ آنے والے مہینوں میں بالکل درست ثابت ہوئی۔

چھکے دشمن کے چھوٹ جائیں گے   دیکھ کر جنگ تم دلیروں کی

بھیڑیے منھ بچا کے بھاگیں گے　　کچھ میں ہوگی کچھار شیروں کی
بند ہوگی ڈکار توپوں کی　　ہچکیاں لیں گی اب مشین گنیں
اُٹھ کے تم کو سلامیاں دیں گی　　ایک دن دشمنوں کی رائفلیں

میں ہوں شنکر پیام دیتا ہوں
تم کو آج اپنی راجدھانی سے

گولیاں تم سے تھرتھرائیں گی　　رائفل جھانکنے لگے گی بغل
بم بھی دشمن کے بول جائیں گے بم　　توپ گرگر پڑے گی منھ کے بل
گنگا والے کو چھیڑنے والے　　موت کے گھاٹ اترنے آئے ہیں
ان کو بننا پڑے گا بھسما سُر　　جو تمھیں بھسم کرنے آئے ہیں

میں ہوں شنکر پیام دیتا ہوں
تم کو آج اپنی راجدھانی سے

ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہونے والی ہندو پاک جنگ کے موضوع پر نذیؔر کی نظمیں اردو سے ہندی اور ہندی سے ریڈیو وغیرہ میں برابر منتقل اور نشر ہوتی رہی ہیں۔ اس سلسلے کی ایک نظم نیوز ریل میں بھی آچکی ہے اس کڑے امتحان کے وقت جب ہمارے کچھ شعرائے کرام نے محض اس لیے چپ سادھ لی تھی کہ اس عارضی جنگ کے بعد ہونے والے پاکستانی مشاعروں میں شرکت کے لیے ان کی پوزیشن صاف رہے، نذیؔر نے پورے خلوص اور سچی لگن کے ساتھ ملک اور قوم کا ساتھ دیا ہے۔ ''فوجی بھائیوں کے نام'' ''پڑوسی سے دو باتیں'' ''چمن تو اس کا ہے جو خون دے چمن کے لیے'' ''شردھا کے پھول'' ''اے شہیدانِ وطن تم پر سلام'' ''مادرِ ہند سے'' ''کوئی سونے نہ پائے جگاتے چلو'' ایسی کئی نظمیں انھوں نے ارتجالاً کہیں اور لوگوں کی زبانوں

پر چڑھ گئیں۔ ان نظموں کا سب سے بڑا جوہر ان کی زبان کی سادگی اور خیالات کی سچائی ہے۔ ۶؍جنوری کو ایوب شاستری سمجھوتہ ہوتا ہے جنگ کے خاتمے کے اعلان کی خبر ریڈیو سے آتی ہے اس کے گھنٹے کے بعد نذیرؔ کی نظم کاغذ پر آ جاتی ہے جو زیرِ نظر مجموعے میں ''تاشقند سمجھوتہ'' کے عنوان سے شامل ہے۔ ۷؍جنوری کو علی الصباح شاستری جی کی غیر متوقع رحلت کی خبر سن کر ہم ہندوستانیوں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ شاستری جی نذیرؔ کے ہم شہری اور ہم وطن ہونے کے علاوہ بڑے وطن پرست بھی تھے۔ چنانچہ وطن کے اس مہان سپوت کے سوگ میں ہندوستان بھر میں جو سب سے پہلی نظم آئی وہ نذیرؔ بنارسی کی ہے۔ اس کا عنوان ہے ''مانجھی جو مر گیا ہے تو دریا اداس ہے'' یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ۷؍جنوری کو شاستری جی کے انتقال کی خبر آتی ہے اور ۸؍جنوری کو یہ نظم بنارس کے روزنامہ آج میں شائع ہو جاتی ہے۔ اس نظم کی مقبولیت اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ تربینی میں شاستری جی کی استھی پرواہ کے ساتھ جہاں وید کے منتر پڑھے جا رہے تھے وہاں اس نظم کے چار شعر بھی ریڈیو سے پڑھے گیے۔ ''لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم'' کے مصداق زیرِ نظر مضمون طویل ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود راقم الحروف کو اعتراف ہے کہ نذیرؔ پر اس مضمون کی حیثیت ایک خاکے کی سی ہے۔ اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ کچھ منصف مزاج ناقد اس سے تشویق حاصل کریں اور نذیرؔ کے فن کی صحیح ارزش متعین کرنے میں متعصب نکتہ چینوں اور رجعت پسند ادبی ٹھیکیداروں کی فنی اور اجارہ داری سے بلند ہو کر انصاف سے کام لیں۔

ہو سکتا ہے یہ جملہ کچھ لوگوں کو ناگوار گذرے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو کے اکثر نقادوں نے نذیرؔ سے انصاف کرنے میں بخل سے کام لیا ہے۔ ان کی ایسی منظومات جو ان کی زبان سے نکلتے ہی ہندوستان بھر میں قبولِ عام کا درجہ پا گئیں جن کے گراموفون ریکارڈ تیار ہوئے جنھیں عوام و خواص نے جی جان سے پسند کیا صرف اس لیے معتوب و مردود قرار دی جاتی

رہیں کہ ان میں ہندی کے الفاظ کے ساتھ ساتھ ایک ہندوستانی کے سیدھے سادھے جذبات ہیں۔ کھری باتیں کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ ان کی مہاتما گاندھی والی نظم کا یہی حال ہوا۔ یہ نظم باپو کی شہادت پر ارتجالاً کہی گئی لیکن اپنے پر تاثیر لہجے اور مخلصانہ جذبات کی وجہ سے ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر چڑھ گئی۔ سیلون ریڈیو سے گذشتہ سال تک اس نظم کا ریکارڈ بجایا گیا لیکن حیرت یہ ہے کہ اردو ادب کا ماہر جب اس موضوع پر کہی گئی نظموں کو یکجا کرنے بیٹھا تو اس نے نذیرؔ کی نظم کو محض اس لیے مسترد کردیا کہ اس کا لب ولہجہ اردو کے روایتی لب و لہجے سے مختلف تھا۔ اسی طرح قومی شاعروں کے موضوع پر دنیا بھر کے اشعار یک جا کرتے وقت ''قومی شاعری کے سو سال'' کے مؤلف نے نذیرؔ بنارسی کا نام تک نہیں لیا۔ ظاہر ہے کہ اس تغافل شعاری کا اس کے سوا کوئی اور سبب نہیں ہوسکتا کہ اردو والے ہزار تلخ تجربے کے باوجود آج بھی اپنی زبان کے انجام سے بے خبر ہیں۔

☆

حفیظؔ بنارسی

حفیظؔ بنارسی میرے مخلص دوستوں میں ہیں اور ان کا تعارف کراتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے کہ میں نے اپنا قلم اچانک اس محبت کے ہاتھ میں دے دیا ہے جو مجھے اور مجھ جیسے بیسیوں احباب کو حفیظؔ بنارسی سے ہے۔ اس سلسلہ میں اگر پڑھنے والوں کو میری کسی رائے سے اختلاف ہو تو میں اسے انسانی فطرت پر محمول کروں گا کیوں کہ ایک مخلص دوست جب اپنے کسی بہت ہی پیارے دوست کے بارے میں اظہار خیال کرتا ہے تو سننے والوں کے دلوں میں غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ جبیں پر شکنیں آجاتی ہیں اور یہ جملہ اکثر سننے میں آتا ہے کہ دوست دوست کی تعریف کیا ہی کرتے ہیں۔ مجھے یہاں اس بحث کو طول نہیں دینا ہے بلکہ شروع ہی میں صاف صاف کہہ دینا ہے کہ ہمارے حبیب وہم نشین حفیظؔ بنارسی سے جان پہچان کے لیے ضروری ہے کہ آپ ان کو بہت قریب سے اور بڑی گہری نظر سے ایک دوست کی حیثیت سے دیکھیں، نہیں تو یہ وہ سب کچھ نظر آئیں گے جو یہ نہیں ہیں اور حقیقی حفیظؔ کہیں بہت دور کھڑے آپ کی ان غلط فہمیوں پر زیر لب مسکرا مسکرا کر لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔

آپ کی ملاقات ایک لحیم شحیم انسان سے ہو رہی ہے جو پاجامے اور شیروانی کے علاوہ باقاعدہ طور پر ایک عدد مشرع داڑھی کا بھی مالک ہے۔ اس مولویانہ حدود اربعہ کو دیکھ کر قوی امکان تو یہی ہے کہ آپ تعارف کرانے والے سے فوراً الجھ پڑیں کہ آپ سفید نہیں بلکہ برّاق

جھوٹ بول رہے ہیں، بھلا اس حُلیے کا انسان بھی کبھی انگریزی زبان وادبیات کا لائق وفائق پروفیسر ہوسکتا ہے! تھوڑی دیر میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے تو حافظؔ وسعدیؔ اور میرؔ وغالبؔ کے ساتھ ساتھ شیکسپیئر، آرنلڈ اور ایلیٹ وغیرہ کے حوالے بھی سننے میں آتے ہیں۔ اب اس شخص کے بارے میں جس کو حفیظؔ بنارسی کہا جارہا ہے، آپ پر انکشافات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ شعرو سخن کی محفل میں وہ بلبل خوش نوا نظر آتا ہے۔ جب وہ اپنی خداداد خوش آوازی کا سہارا لے کر اپنا حسین ورنگین کلام جھوم جھوم کر سناتا ہے تو اس کے حُلیے کا نمائشی زہد بے بس ہوکر رہ جاتا ہے اور آپ کے سامنے ایک ایسا البیلا شاعر جلوہ گر ہوتا ہے جو دینی تعصّبات اور زہد وتقویٰ کی خشکی سے بہت بلند ہوکر حسن وعشق کی سرمستیوں اور رنگینیوں سے سرشار ہے اور ان کیفیات کو مستانہ وار بیان کر کے اپنے سامعین کی دلچسپی کو مسلسل قائم رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دخترِ رز کی محرمانہ خلوتوں میں آتش سیال کی گرما گرمی میں کسی نے حفیظؔ کو کرسمس کا برفانی بت بنے ہوئے نہیں دیکھا۔ ایسے ماحول میں وہ خیام کی رباعی بن جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں کو بار بار یہ سوچنے پر مجبور کردیتا ہے کہ پیمانہ وساغر تو رندوں کے سامنے دھرے ہیں۔ پھر یہ ”انداز گل افشانی گفتار“ حفیظؔ نے کہاں سے سیکھ لیے! اپنی قلمرو یعنی بنارس میں کبھی کبھی وہ بے حد سنجیدہ بھی نظر آتا ہے اور آپ محسوس کرتے ہیں کہ یہ سنجیدہ حفیظؔ شاعر حفیظؔ سے بہت کچھ مختلف ہے۔ ایسے لمحات میں اس کے سامنے یا تو کوئی گھریلو مسئلہ ہوتا ہے یا کچھ سماجی مسائل جن کا حل ڈھونڈ نکالنا بھی اُسے بہت اچھی طرح آتا ہے کیوں کہ وہ شروع ہی سے اس کا عادی ہوچکا ہے۔ بعض اوقات وہ اکیلا ہی جانب منزل چل پڑا ہے لیکن جب جب اس نے مڑ کر دیکھا ہے، لوگ اس کے نقشِ قدم پر قافلوں کی تشکیل کرتے رہے ہیں۔ اسی خوداعتمادی نے اسے اپنے ماحول کا باغی بنادیا ہے۔ یہی بغاوت اسے اپنے ماحول کی دوسری شخصیات سے ممیّز بھی کرتی ہے اور فوراً محسوس ہوتا ہے کہ

ظاہری وضع قطع سے قطع نظر حفیظؔ کے فکر و ذہن یقیناً اپنے ماحول کی تخلیق نہیں بلکہ اس کا موجودہ ماحول اس کے فکر و ذہن کی تخلیق ہے۔

محمد عبدالحفیظ نے جو اب ایم.اے. حفیظؔ بنارسی کہلاتے ہیں، محلّہ مدن پورہ شہر بنارس کے ایک زمیندار اور تجارت پیشہ گھرانے میں ۱۹۳۳ء میں جنم لیا۔ ان کے والد مرحوم الحاج قاری عبدالقیوم، بڑے ہی عابد و زاہد بزرگ اور بڑے ہی خوش الحان قاری تھے، ان کے خاندان میں علم و دین کا چرچا تھا، اکثر حضرات حافظ قرآن تھے اور ہیں۔ وہ جس ماحول میں پروان چڑھے ہیں وہاں زندگی اکثر زرین و ریشمی بنارسی کپڑوں کے تانے بانے میں الجھ کر بے بس ہو جاتی ہے۔ اس فضا میں بنارسی کپڑے کی صنعت و تجارت کے ذکر و فکر کے علاوہ اور کوئی موضوع زیر بحث کم ہی آتا ہے۔ بچوں کو اگر ابتدائی مدارس میں بھیجا بھی جاتا ہے تو محض آخرت کے لیے زادِ راہ کے خیال سے۔ اس دینی تعلیم کا سلسلہ بھی بہت دیر تک نہیں چلتا اور سن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے کل اور کارخانہ زندگی کا محور قرار پا جاتا ہے۔ اکثر نوجوان اس سنہرے جال میں کچھ دیر تک تڑپتے ہیں، لیکن رفتہ رفتہ مالی حیثیت سے فارغ البالی کا تصور انھیں ہمیشہ کے لیے رام کر لیتا ہے اور خود بھی ایک خوشنما پارچہ کی صورت اختیار کر کے اسی ماحول کا ایک مستقل جزو بن کر رہ جاتے ہیں۔ حفیظؔ کے لیے یہ طلائی جال اس قدر مضبوط تھا کہ بہ ظاہر اس کو توڑنے کی جرأت ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کا خاندان اس کاروبار میں بہتوں سے آگے تھا اور روپے پیسے کی فراوانی کا بھی یہی تقاضا تھا کہ اسی خاندانی کسب و کار کو ذریعہ معاش بنا کر دولت کی ریل پیل میں اضافہ کیا جائے۔ لیکن حفیظؔ کولھو کے بیل سے بہت زیادہ شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے علم بغاوت بلند کیا اور کالج اور یونیورسٹی کی راہ لی۔ ان کے سرپرستوں نے اسے اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ ساتھیوں نے کچھ دیر تک انھیں سر پھرا خیال کیا۔ پھر کچھ اور جیالے بھی ان کے پیچھے پیچھے چل کھڑے

ہوئے اور اس طرح حفیظ کی مثال ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گئی۔

یونیورسٹی میں حفیظ نے مشرقی ادبیات سے زیادہ مغربی زبان و ادب کے لیے دلچسپی محسوس کی۔ عربی زبان و ادب کو انٹر میڈیٹ کے بعد خیر باد کہہ کر انھوں نے انگریزی ادب کو اپنا میدان فکر قرار دیا۔ شعر وہ بہت کم سنی ہی سے کہتے تھے۔ مگر ان کے ادبی ذوق کی نشو و نما یونیورسٹی میں آنے کے بعد ہی ہوئی۔ انیسویں صدی کے رومانی شعرا سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئے۔ شیلؔی کیٹسؔ اور بائرنؔ وغیرہ ان کے محبوب شاعر بن گئے۔ ان شعرا کی نظمیں پہلے ورد زبان ہوئیں اور پھر وہ ان کے اردو ترجمے اپنے دوستوں کو سنانے لگے۔ فارسی اور اردو شعرا کے دواوین بھی زیر مطالعہ رہے۔ شعر و سخن کی محفلوں میں بہ حیثیت شاعر شرکت کرنے لگے اور ان کا کلام مختلف اردو رسائل کی زینت بننے لگا۔

۱۹۵۵ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم اے، کی ڈگری لی اور ۱۹۵۶ء میں بی ایڈ کی سند حاصل کر کے جب وہ فارغ التحصیل ہوئے تو ان کے ادبی ذوق کی شہرت یونیورسٹی کے محوطے سے نکل کر شہر اور بیرون شہر کی ادبی محفلوں میں پہنچ چکی تھی۔ جہاں تھوڑی ہی دیر میں ان کی قابل رشک مقبولیت نے بہت سے دیرینہ ساتھیوں کو ان کا حاسد بنا دیا۔ ان غیر شاعرانہ سرگرمیوں نے حفیظ کو سخت جاں بنانے کے علاوہ محتاط رہنا بھی سکھا دیا۔ اب وہ زیادہ غور و فکر سے شعر کہنے لگے تا کہ مخالفین کے بجا اور بیجا اعتراضات کا مناسب جواب دے سکیں۔ اپنی شاعری کے اس موڑ پر ان کے مزاج کو اعتدال کی بہت ضرورت تھی۔ معاصرانہ چشمکوں کا جواب دینے کی بجائے اپنے فن کو نکھارنے اور سنوارنے کے لیے کڑی محنت اور مسلسل لگن کی ضرورت تھی۔ مطالعہ اور غور و فکر کی عادت راسخ ہو چکی تھی۔ چند بزرگ ہم نشیوں نے حوصلہ افزائی کی اور وہ مشق سخن میں اور زیادہ محنت کرنے لگے۔

حضرت مسلمؔ بنارسی کا شمار بنارس کے ان مشاق شعرا میں ہوتا ہے جن کو فن اور اس کے نکات و رموز پر عبور حاصل ہے۔ ان کے والد حضرت غنیؔ بنارسی بھی غزل اور قصیدہ کہنے میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ حفیظؔ نے اپنا ابتدائی کلام مسلمؔ صاحب کو دکھایا اور ان کے مشوروں سے بہت کچھ استفادہ کرنے کے بعد وہ اچھے خاصے حفیظؔ بنارسی ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے حسن کلام نے اردو کے بہت سے معیاری رسائل میں اپنی جگہ بنا لی۔ شاعروں میں مقبولیت اور ادبی جرائد میں اشاعت گویا سمند شوق کے لیے ایک تازیانہ تھی۔ حفیظؔ کا زیادہ وقت مشاعروں اور ادبی پرچوں کی فرمائش پوری کرنے میں گذرنے لگا۔

تقسیم ملک کے بعد بنارس کے ادبی ماحول میں بھی بہت کچھ انقلاب رونما ہوا۔ نیرؔ اکبرآبادی، مرزا عباس بیگ محشرؔ، وامقؔ جون پوری، مسعود اختر جمالؔ اور بہت سی دیگر شخصیات کے انتقال یا ہجرت سے بنارس کی ادبی محفلیں بے نور ہو گئیں۔ نئے لکھنے والے انھیں شمعوں سے اقتباس نور کرتے تھے۔ اب چراغ سے چراغ جلنے والا مضمون بھی بے معنی ہو کر رہ گیا لیکن رات کے پچھلے پہر کی طرح ویران اور سنسناتے ہوئے اس ماحول میں بھی ایک شمع ایسی جل رہی تھی جس نے مصنوعی در و دیوار کے باوجود رفتہ رفتہ دور تک اجالا کر دیا تھا یہ شمع تھی، جناب نذیرؔ بنارسی کی ذات گرامی جو بنارسی کلچر کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے ہندوستان میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ باکمال بزرگوں سے کسب فیض کے علاوہ انھوں نے مسلسل چالیس سال کی کڑی ریاضت سے شعر و سخن میں نام پیدا کیا۔ سرسوتی کے اس انتھک پجاری نے اپنی لگن سے بنارس کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔ حفیظؔ صاحب پڑوسی اور ہم ذوق ہونے کے سبب برسوں سے نذیرؔ کے ہمنشین ہیں۔ حفیظؔ کی شاعرانہ شخصیت کی تکمیل میں نذیرؔ بنارسی کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ آزاد خیالی، وسیع المشربی، سارے ہندوستانیوں کو ایک قوم سمجھنے کا تصور، ہندوستانی کلچر سے دلی

وابستگی، بنارس کی تہذیبی روایات سے گہری دلچسپی وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو حفیظ نے نذیر صاحب سے گویا ورثہ میں پائی ہیں۔ یہ ورثہ انھوں نے اس دوستانہ و مخلصانہ مشورہ کی صورت میں پایا جو انھیں اپنے کلام کی تہذیب کے سلسلے میں نذیر صاحب سے وقتاً فوقتاً ملتا رہا۔ ۱۹۵۶ء سے حفیظ بہ سلسلۂ ملازمت بنارس سے باہر رہے ہیں اور گذشتہ دس بارہ برس سے وہ انگریزی زبان و ادب کے استاد کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان دنوں وہ صوبۂ بہار کے شہر آرہ میں مہاراجہ کالج کے شعبہ ادبیات انگریزی سے وابستہ ہیں اور بہار کی ادبی و شعری محفلوں کی رونق ہیں۔ مگر ان کا رابطہ بنارس سے برابر قائم ہے۔ وہ سال کا ایک قابل ذکر حصہ بنارس ہی میں گذارتے ہیں اور اس طرح وہ یہاں کی ادبی مجلسوں کی رونق افروزی میں اب بھی شریک ہیں۔

ایک جدید خیال کے مطابق اردو شاعری وہ کافر ادا محبوبہ ہے جس کو رام کرنے کے لیے عشق پیشگی، دیوانگی اور رند مشربی بھی نہایت ضروری ہے۔ یعنی عام خیال یہی ہے کہ شاعر پینے والی چیزوں کو جس قدر پیئے گا، کھانے والی اشیا کو جس قدر کھائے گا اور برتنے والی چیزوں کو جس قدر مصرف میں لائے گا، اسی قدر اس کے کلام میں زیادہ تاثیر پیدا ہوگی۔ دل پھینک ہونا اس لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس سے شاعرانہ مزاج پرورش پاتا ہے اور حسن کلام کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ہر اچھی صورت کو گھورنے کے علاوہ اس کا تعاقب بھی شاعرانہ حرکت ہے۔ اس لیے کہ "م" صاحب اور "ج" صاحب یہ تمام حرکات کرتے رہے ہیں اور شاعری میں اپنا نام بھی چھوڑ گئے ہیں۔ اس لیے ہر قسم کی آوارگی بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے اور شاعری میں نام پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ شاعری کے لیے مذکورہ بالا شرائط ظاہر ہے کہ.......... بہت کڑی ہیں.......... ہمارے حفیظ تو یقیناً اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ ان تمام خوبیوں سے وہ محروم ہیں اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں کبھی کوئی

شعوری کوشش بھی نہیں کی۔ وہ ایک اچھے غزل گو ہیں مگر انھیں کسی سے عشق لڑاتے نہیں دیکھا گیا۔ پینے والی اشیا سے انھیں شاعرانہ دل چسپی ضرور ہے مگر اس معاملہ میں ان کے قول و فعل میں ہمیشہ تضاد رہا ہے۔ مشاعروں میں ان کی مقبولیت انھیں بقید ہوش پاتی ہے۔ گھر میں، بازار میں کالج میں ہر جگہ صنف لطیف سے ان کا برتاؤ ہمیشہ شریفانہ پایا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر یہاں یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ:

سرِ خدا کہ عارف کامل بکس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید؟

میرے خیال میں اس کا جواب حفیظؔ کے کثرت مطالعہ، خدا داد ذہانت، مسلسل ریاضت اور سچی لگن میں پوشیدہ ہے۔ انھوں نے اپنے تخیلی تجربات سے بہت اہم کام لیا ہے۔ جس عالم میں وہ خود نہیں پہونچ سکتے اسے ان کے تصور کی آنکھ نے بڑی صنعت سے اشعار کی صورت میں مجسم کر دیا ہے۔ اس میں ان کے خلوص فکر کی کرشمہ سازیاں بھی مشاہدے میں آتی ہیں اور وہ یہی چیز ہے جس کے بغیر فن کے مصنوعی ہو جانے کا خطرہ قائم رہتا ہے۔ دوسروں کی باتیں دہرانے والا آدمی اکثر نقال ہو کر رہ جاتا ہے۔ حفیظؔ کی شاعری نقالی نہیں اسی لیے کلام میں حقیقی شعریت جا بجا برق پاشیاں کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

حفیظؔ ادبی روایات کا احترام کرتے ہیں مگر انھوں نے محض روایتی عشقیہ شاعری نہیں کی ہے۔ وہ صرف محبوب کی زلفِ خم بہ خم کے اسیر نہیں۔ زندگی کی کاکل پریشاں بھی سنوارتے ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش سے باخبر ہیں۔ حالات حاضرہ پر بھی ان کی نظر ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں ان کی خوش ذوقی، زندہ دلی اور بیدار مغزی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کا بڑا حسین سنگم ہے۔ وہ

اپنی ایک غزل کے مطلع میں خود بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

غمِ حبیب و غم کائنات کا سنگم
مری حیات ہے ہر دو حیات کا سنگم

حفیظ نے میدان شاعری میں جب قدم رکھا تو ترقی پسند ادب کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ بہت سے نئے لکھنے والے فطری طور پر اس سے متاثر ہوئے۔ حفیظ نے بھی اس کا اثر قبول کیا مگر انھوں نے اپنے اوپر ترقی پسندی مسلط نہیں ہونے دی۔ کوئی لیبل نہیں چسپاں کیا۔ کسی ”ازم“ کی تبلیغ و اشاعت اپنا مقصد شاعری نہیں قرار دیا اور اسی لیے ادبی بے راہ روی کے شکار نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری سستی خطابت، نعرہ یا اشتہار بازی سے محفوظ رہی۔ انھوں نے جو کچھ کہا ادب کے دائرہ میں رہ کر کہا اور تہذیب و متانت اور شعریت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ غالباً یہ اس تربیت کا اثر تھا، جو انھیں اپنے بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوئی تھی۔ زمانے کی داستانِ الم، غریب عوام کی پریشاں حالی اور ان پر ڈھائے گئے ظلم و ستم کا ذکر حفیظ کے یہاں بھی ہے مگر بڑے مہذب اور خوبصورت ڈھنگ سے۔ اس سلسلہ میں چند شعر ملاحظہ ہوں:

پھول افسردہ بلبلیں خاموش
فصل گل آئی ہے خزاں بردوش

☆☆

گیسوئے خم بہ خم کا افسانہ بھول بیٹھے
یوں پاؤں میں پڑی ہے زنجیر زندگی کی

☆☆

ابھی دلوں میں وہی ظلمتوں کا ڈیرا ہے
ابھی یہ جشن چراغاں مجھے پسند نہیں

☆☆

کہیں بزم ماہ و انجم کہیں ظلمتوں کا ڈیرا
ابھی خونِ دل جلاؤ ابھی دور ہے سویرا

☆☆

کوئی ہومست وغزل خواں کوئی ملول وحزیں
یہ نظم و ضبطِ گلستاں مجھے پسند نہیں

☆☆

جس نے گلشن کو زندگی بخشی
اس کے دامن میں کوئی پھول نہیں

☆☆

ان کے یہاں ایسے اشعار ضرور ہیں جن میں زمانے کے دکھ درد کے علاوہ ان کے ذاتی رنج وغم کا اظہار ہے مگر وہ یاسیت کے شکار نہیں نہ وہ قنوطی ہیں .... وہ جدید شاعروں کی طرح ہر دم تنہائی، بے چارگی، افسردگی وتیرگی کا رونا نہیں روتے، خودکشی کی باتیں نہیں کرتے۔ ان کے یہاں ایک رجائیت ملتی ہے۔ وہ رنج وغم کی اندھیری رات میں برابر ایک روشن وخوش آئند سحر کا خواب دیکھتے ہیں۔ ان کے یہاں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جن میں زندگی کے مصائب سے لڑنے، طوفانی موجوں کا مقابلہ کرنے اور بادِ مخالف کا سامنا کرنے کا حیات بخش پیغام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

ہر چند غم کے ہاتھوں ستائے ہوئے تو ہیں
ہم بار زندگی کا اٹھائے ہوئے تو ہیں

حریف موجۂ طوفاں ہے زندگی میری
سکوتِ ساحلِ ویراں مجھے پسند نہیں

اے متاعِ سکوں کے دیوانے
زندگی اضطراب پیہم ہے
موجوں کو چیرتے ہوئے بازوئے شوق سے
بڑھتے چلو کہ دامنِ ساحل قریب ہے

☆☆

وہ صرف تقدیر کے بھروسے بیٹھنے کی حمایت نہیں کرتے اس لیے کہ وہ عزم وعمل کے قائل ہیں اور حیات کے لیے جدوجہد پیہم میں ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار ان کے جوان ارادوں، بلند حوصلوں اور ولولوں کے ترجمان ہیں۔

تدبیر کے دست رنگیں سے تقدیر درخشاں ہوتی ہے
قدرت بھی مدد فرماتی ہے جب کوشش انساں ہوتی ہے

☆☆

کیوں بیٹھا ہے اُٹھ نام خدا کا لے کر
تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے

لہو کی مے بنائی دل کا پیمانہ بنا ڈالا
جگرداروں نے مقتل کو بھی میخانہ بناڈالا

اے حق پرستو جذبۂ منصور کم نہ ہو
بس اب شکستِ لشکرِ باطل قریب ہے

اے شکوہ سنجِ شومئی تقدیر دیکھنا
ذوقِ عمل ہی میرا کہیں خام تو نہیں

☆☆

حفیظؔ کی شاعری صرف جذبات کی شاعری نہیں، ان کی شاعری میں غور و فکر کا عنصر بھی کافی موجود ہے۔ ان کے اشعار دل و دماغ دونوں کو یکساں طور پر متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ زندگی اور اس سے وابستہ مسائل پر اکثر سوچتے ہیں اور سوچنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک قطعہ اور چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عیش گاہِ خیال و خواب نہیں　　محفلِ شاہد و شراب نہیں
کتنے کانٹے چبھے تو ہوش آیا　　زندگی بسترِ گلاب نہیں
آج تک اس کی الجھنیں نہ گئیں　　زندگی کس کی زلفِ پرخم ہے

بس اک تجلیٔ رنگیں بس اک تبسمِ ناز
ریاضِ دہر میں پھول کی زندگی کیا ہے

اس میں قصورِ ناخنِ تدبیر بھی ہے کچھ
رخسار زندگی پہ جو اتنی خراش ہے

اے وقت کے غلام تجھے کچھ خبر نہیں
محدودِ صبح و شام حیاتِ بشر نہیں

لکھتے ہیں خون دل سے تفسیر زندگی کی
آساں نہیں ہے یارو تعمیر زندگی کی

کوئی اک دوسرے کا شناسا نہیں
ہائے کس موڑ پر زندگی آ گئی!!

عہد حاضر کی مسیحا نفسی کیا کہنا
زندگی بن گئی تصویرِ الم کیا کہیے

☆☆

یہ ایک امر مسلمہ ہے اور تمام ناقدین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اچھی اور عظیم شاعری اسی وقت وقوع پذیر ہو سکتی ہے جب شاعر کو اپنے خیالات و جذبات کو بہترین سانچوں میں ڈھالنے اور پر کیف و پر تاثیر انداز میں بیان کرنے پر قدرت حاصل ہو۔ اگر خیال بہت اچھا ہے، بلند ہے، مگر اچھے ڈھنگ سے خوبصورت، واضح، صاف اور شستہ زبان میں نہیں پیش کیا گیا ہے تو اچھی شاعری نہیں جنم لے سکتی۔ اچھی شاعری کے لیے MATTER اور MANNER نفس مضمون اور انداز بیان میں مکمل ہم آہنگی بہت ضروری ہے۔ یہ فن بڑی مشکل سے حاصل ہوتا ہے اور بڑا ریاضت طلب ہے۔ آج کل کے اکثر نوجوان سہل پسندی کے شکار ہیں، وہ محنت و مشقت سے جی چراتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ راتوں رات شاعر بن جائیں۔ چنانچہ ناکامی و محرومی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے حفیظؔ بنارسی اچھی شاعری کے لوازمات سے بخوبی آشنا ہیں اور وہ جو کچھ کہتے ہیں سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ وہ شاعری کو یکسر الہامی چیز نہیں سمجھتے اور اسی لیے اپنے اشعار کے خدوخال کو سنوارنے اور زیادہ موثر بنانے کی طرف بھی کافی توجہ دیتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار کو صوری و معنوی دونوں حیثیت سے خوبصورت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں حسنِ خیال کے ساتھ ساتھ حسن بیان بھی بڑی دل فریبی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان کی شاعری ان غلطیوں سے بڑی حد تک پاک ہے جو اس عہد کے اکثر نوجوان شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ ذیل میں، میں، ان کے کچھ اشعار اور چند غزلیں درج کر رہا ہوں جن سے میں زیادہ لطف اندوز ہوا ہوں اور جو حفیظؔ کی شاعری کے متعلق میرے خیال کی تائید کریں گے۔

ہر سعی تبسّم پر آنسو نکل آئے ہیں
انجام طرب کوشی کیا جانیے کیا ہوگا

ستم ڈھاتے ہو لیکن لطف کا احساس ہوتا ہے
اسی انداز نے دنیا کو دیوانہ بنا ڈالا

شکایت بجلیوں سے ہے نہ شکوہ بادصرصر سے
چمن کو خود چمن والوں نے ویرانہ بنا ڈالا

یہ لطف انتظار بھی کچھ کم نہیں حفیظؔ
ملنے کی اُن سے آس لگائے ہوئے تو ہیں

ہجر کی رات فسوں کاریٔ ظلمت مت پوچھ
شمع جلتی ہے مگر نور نہیں ہوتا ہے

گم شدگی ہی اصل میں یارو راہ نمائی کرتی ہے
راہ دکھانے والے پہلے برسوں راہ بھٹکتے ہیں

نہ چلے جام اگر تذکرۂ جام چلے   کچھ تو بے کیفیٔ محفل میں کمی آئے گی
کوئی جگنو ہی چمک جائے تو کچھ کام چلے   آج گلشن میں اُجالے کا کہیں نام نہیں

زلف میں آئی نظر، وقت کے ماتھے کی شکن
کھینچ لایا غمِ جاناں غمِ دوراں کے قریب

عجیب حال ہے اس دور کے جوانوں کا
خلوصِ فکر نہیں جذبۂ عمل بھی نہیں

دیکھنا جرم نہیں ہاں مگر اس شرط کے ساتھ
تیرا اندازِ نظر حسن کا معیار بنے

شکریہ اے حادثاتِ زندگانی شکریہ
آ گیا شیشہ کو اب پتھر سے ٹکرانا مجھے

پردے میں تبسم کے ہر چوٹ چھپالی ہے
دیوانوں نے جینے کی کیا راہ نکالی ہے
بازو بھی ہیں تیشہ بھی ہے شیریں کی طلب بھی
سب کچھ ہے مگر اب دلِ فرہاد نہیں ہے
دستِ وحشت میں کہاں تھی اتنی جرأت اتنی تاب
دوست کی شہ نے بنایا اس کو دامنگیر دوست
دل میں جب حسنِ یقیں جلوہ نما ہوتا ہے
پردۂ وہم و گماں خود ہی سرک جاتے ہیں
تجھ کو معلوم ہے کچھ اے ہمہ کیف و مستی
کتنے ساغر تری آہٹ سے کھنک جاتے ہیں

☆..........☆

پردۂ لالہ وگل ہو کہ نقاب انجم   تیرے جلوے بہرانداز جھلک جاتے ہیں
محفلِ عشق میں رائج ہے یہی طرز بیاں   دل کا افسانہ بہ عنوانِ نظر کہتے ہیں
نامطمئن ہے انجمنِ مہوشاں میں بھی   اے زندگی بتا تجھے کس کی تلاش ہے

☆..........☆

خدا رسیدہ سہی لاکھ برگزیدہ سہی
جو آدمی کو نہ سمجھے وہ آدمی کیا ہے
سخت مشکل ہے رہ گذارِ حیات
کوئی چلتا ہمارے دوش بدوش

کہاں تھے میرے نغمے اتنے شیریں
ترے دردِ محبت کا اثر ہے
میخانے سے مسجد تک ملتے ہیں نقوشِ پا
یا شیخ گئے ہوں گے یا رند گیا ہوگا
فرزانوں کا کیا کہنا ہر بات پہ لڑتے ہیں
دیوانے سے دیوانہ شاید ہی لڑا ہوگا
سجدے درِ جاناں پر لاکھوں نے کئے لیکن
معیار وفا ٹھہری میری ہی جبیں تنہا
سنتا ہوں اک مقامِ زیارت ہے آج کل
وہ زندگی کا موڑ جہاں ہم جدا ہوئے

☆..........☆

ہم پشیماں نہیں نازاں ہیں خطائے دل پر
جرم ہے عشق تو یہ جرم ہوا ہے ہم سے
ہم نے یارو کبھی زہراب کو امرت نہ کہا
بس اسی بات پہ میخانہ خفا ہے ہم سے

☆..........☆

افسانۂ تعمیر کے عنوان بہت ہیں
جینا ہو تو پھر زیست کے سامان بہت ہیں
یہ شیشہ و ساغر مرے آگے سے ہٹا دے
مجھ پر تری آنکھوں ہی کے احسان بہت ہیں
جو عقل کے تاجر ہیں ذرا سوچ کے آئیں
یہ شہرِ جنوں ہے یہاں نقصان بہت ہیں

کردار اگر جانچیے شاید ہی کوئی ہو
تعداد اگر دیکھیے انسان بہت ہیں
دیکھے نہیں جاتے تری آنکھوں یہ میں آنسو
ہم تجھ سے گلہ کر کے پشیمان بہت ہیں
سمجھے تھے کوئی ان کا مقابل ہی نہیں ہے
آئینہ جو دیکھا ہے تو حیران بہت ہیں
مفہوم جنوں سے کوئی آگاہ نہیں ہے
شوریدہ سر و چاک گریبان بہت ہیں
اے زلف صنم آ تجھے سینے سے لگالیں
تیری ہی طرح ہم بھی پریشان بہت ہیں
خاموشیٔ دریا پہ حفیظؔ آپ نہ جائیں
پنہاں اسی خاموشی میں طوفان بہت ہیں

☆......☆

ستم ڈھاتے ہو لیکن لطف کا احساس ہوتا ہے
اسی انداز نے دنیا کو دیوانہ بنا ڈالا
بھری محفل میں ہم نے بات کر لی تھی ان آنکھوں سے
بس اتنی بات کا یاروں نے افسانہ بنا ڈالا
مرے ذوق پرستش کی کرشمہ سازیاں دیکھو
کبھی کعبہ، کبھی کعبہ کو بتخانہ بنا ڈالا
شکایت بجلیوں سے ہے نہ شکوہ بادِ صرصر سے
چمن کو خود چمن والوں نے ویرانہ بناڈالا
چلو اچھا ہوا دنیا حفیظؔ اب دور ہے ہم سے
محبت نے ہمیں دنیا سے بیگانہ بنا ڈالا

☆......☆

بے نیازی دلِ عاشق کا جو کردار بنے
حسن خود عشق کی بانہوں کا طلب گار بنے
منزلِ دار و رسن آئی تو رُو پوش ہوئے
لوگ پھرتے تھے حقیقت کے پرستار بنے
لُٹ گئی آبروئے فصلِ بہاراں اے دوست
بوالہوس جب سے گلستاں کے نگہدار بنے
پھر گلستاں کی حفاظت کا سوال اٹھا ہے
پھر ہر اک شاخ کو لازم ہے کہ تلوار بنے
دیکھنا جرم نہیں ہے مگر اس شرط کے ساتھ
تیرا اندازِ نظر حسن کا معیار بنے
ابرِ باراں بھی ہے ساقی کا اشارہ بھی حفیظؔ
کون ایسے میں تقدس کا گنہگار بنے

☆..........☆

پردۂ لطف میں یہ عشق ستم کیا کہیے
ہائے ظالم ترا اندازِ کرم کیا کہیے
رنگ لائی ہے مری شورشِ غم کیا کہیے
حسن کی آنکھ بھی رہنے لگی نم کیا کہیے
کس بت شوخ نے پھونکا ہے یہ افسوں اے دوست
جھلملانے لگی کیوں شمع حرم کیا کہیے
جاں نوازی کے تری اے غمِ محبوب نثار
کھل گیا آج مسرت کا بھرم کیا کہیے
عہدِ حاضر کی مسیحا نفسی کیا کہنا
زندگی بن گئی تصویرِ الم کیا کہیے
یہ بھی اک چال ہے تسخیر محبت کے لیے
ورنہ آپ اور مرے سر کی قسم کیا کہیے

ہو نہ ہو آ ہی گئی منزلِ محبوب حفیظؔ
خود بخود کیوں رکے جاتے ہیں قدم کیا کہیے

☆..........☆

غزل

ہر صبح حدیث رخِ جانانہ کہے ہے   ہر شام کسی زلف کا افسانہ کہے ہے
سمجھے نہ زمانہ تو قصور اس کی سمجھ کا   دیوانہ تو ہر بات حکیمانہ کہے ہے
محفل بھی ہے خاموش لب شمع بھی خاموش   افسانۂ شب لاشۂ پروانہ کہے ہے
کچھ آپ بھی ارشاد کریں اپنی زباں سے   کہنے کو یہ دنیا مجھے کیا کیا نہ کہے ہے
ٹوٹے ہوئے دل ٹوٹے ہوئے جام وسبو ہیں   کچھ اور ہی اب صورت میخانہ کہے ہے

☆..........☆

یہ کیسی ہوائے غم و آزار چلی ہے   خود بادِ بہاری بھی شرر بار چلی ہے
دیکھی ہی نہ تھی جس نے شکست آج تک اپنی   وہ چشم فسوں ساز بھی دل ہار چلی ہے
اب کوئی حدیث قد و گیسو نہیں سنتا   دنیا میں وہ رسمِ رسن و دار چلی ہے
تکتا ہی نہیں کوئی مے و جام کی جانب   کیا چال یہ تو نے نگہِ یار چلی ہے
وہ لوگ کہاں جائیں جو کافر ہیں نہ دیندار   پھر کشمکش کافر و دیندار چلی ہے
بات اور بھی کچھ مے کی مذمت کے علاوہ   یہ بات تو اے شیخ کئی بار چلی ہے
دیوانگیٔ شوق میں جو کر گئے ہم لوگ   معیار خرد بن کے وہ گفتار چلی ہے
سازش نہ ہو کچھ دیر و حرم والوں کی اس میں   سنتا ہوں کہ میخانہ میں تلوار چلی ہے

کب یاد کیا ہم کو حفیظؔ اہلِ چمن نے
جب زیست سوئے وادئ پر خار چلی ہے

☆..........☆

غزل گوئی کے ساتھ ساتھ حفیظؔ کو نظم کہنے کا سلیقہ بھی خوب آتا ہے، انھوں نے مختلف عنوان پر کافی تعداد میں اچھی نظمیں بھی کہی ہیں، جس میں سے بیشتر اخبارات ورسائل کی زینت بن چکی ہیں۔ ان کے پاس قومی نظموں کا بھی اچھا خاصہ ذخیرہ ہے جسے وہ ”قول وقسم“ کے نام سے ایک الگ مجموعہ کی شکل میں شایع کریں گے۔ ان کی اچھی نظموں میں ”نگارِ سخن“ ”احترام وقت“ ”صبح بنارس“ خاصی جاذب نظر اور پر تاثیر ہیں۔ مگر ”ابتدائے سفر“ ”التماس و جواب التماس“ اور ”دعائے خیر“ مجھے اس لیے خاص طور پر پسند ہیں کہ ان نظموں میں انھوں نے فنکارانہ انداز میں خود اپنے دل کی بات کہی ہے۔ ”جوانی“ اور ”شاہد بازار“ بھی کامیاب نظمیں ہیں۔ بنارس اور خاص کر مدن پورہ کے ماحول میں رہ کر ایسی نظمیں لکھنا حفیظؔ جیسے باغی ہی کا کام ہے۔

حفیظؔ کی شخصیت میں ایک مخصوص بانکپن اور عام زندگی میں ایک خاص سلیقہ نظر آتا ہے۔ وہ بڑے نظم وضبط کے انسان ہیں۔ خلوت وجلوت میں ہر جگہ بے قاعدگی سے دور رہتے ہیں۔ رکھ رکھاؤ اور وضع داری ان کے اخلاقی کردار کے ضروری اجزائے ترکیبی ہیں۔ یہی بانکپن یہی سلیقہ یہی نظم وضبط اور یہی مستقل مزاجی ان کے کلام میں بھی ضوفشاں ہے۔ حفیظؔ اب ہمارے جانے پہچانے نوجوان شاعر ہیں۔ میرے خیال میں حفیظؔ کی اس قابل رشک کامیابی میں حسنِ کلام کے ساتھ ساتھ ان کے حسن اخلاق کو بھی کافی دخل ہے۔ کچھ بزرگ مغربی ومشرقی ناقدین کی نظر میں ایک اچھے شاعر کے لیے ایک اچھا انسان ہونا بھی ضروری ہے۔ حفیظؔ

بنارسی کے کلام اور ان کی شخصیت کے مطالعہ سے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حفیظؔ اپنے مطالعہ و مشاہدہ میں وسعت پیدا کرتے رہے اور اسی ہوشمندی اور مستقل مزاجی سے لکھتے رہے تو بہت جلد اردو شعرا کی صف میں ایک مقام حاصل کر لیں گے اور اس طرح روشن دلوں کی محفل میں ایک اور چراغ کا اضافہ ہوگا۔

بھولے بسرے لوگ

بناتے ہیں وہ کیا کیا صورتیں قرطاس ہستی پر
مٹاتے ہیں تو پھر کوئی نشاں باقی نہیں رہتا

مخمورؔ دہلوی کا یہ شعر زیر نظر مضمون لکھتے وقت میرے ذہن میں بار بار اس لیے ابھرتا ہے کہ بیشتر سخنورانِ بنارس کی صورتیں میری چشم تصور کو تو نظر آ رہی ہیں لیکن اب بنارس میں ان کا نام اور کلام کہیں نظر نہیں آتا۔ بڑی کاوش اور تحقیق و تدقیق کے بعد سلسلۂ مصحفیؔ کے یہ مٹھی بھر لوگ ہاتھ آئے ہیں جن کو راقم الحروف ''بھولے بسرے لوگ'' کے عنوان سے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

یادگار مصحفیؔ حضرت ذاکرؔ بنارسی کے خاندان کا حق سب سے فائق ہے۔ سب سے پہلے اسی خاندان کا ذکر ضروری ہے۔

کلیم بنارسی: حضرت ذاکرؔ کے بھائی مولوی عبداللہ کے صاحبزادے تھے۔ ذاکرؔ کے انتقال کے بعد ان کا قلم دان کلیمؔ ہی کے سپرد ہوا۔ بڑے مشاق شعر گو تھے۔ شاگردوں میں اقبالؔ بنارسی، سعیدؔ بنارسی اور طاہرؔ بنارسی نے شہرت پائی۔ ان کے فرزند مولوی الیاس بھی صاحب قلم تھے۔ بیس سال تک ایک تذکرے کی تالیف میں مشغول رہے جو الیاس کے انتقال کے بعد ایسا

منتشر ہوا کہ اب ایک ورق بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ایک شعر بطور تبرک درج کیا جاتا ہے۔

چرخ کو آئی حرارت گرم جب نالے ہوئے
دانۂ انجم لب گردوں میں تب خالے ہوئے

سعیدؔ بنارسی: ذاکرؔ کے چھوٹے بھائی مولوی پناہ علی کے بیٹے مولوی سعید الدین عثمانی ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی، عربی اور انگریزی کی اچھی استعداد رکھتے تھے۔ ذاکرؔ کی آغوش تربیت میں اوائل عمری ہی سے شاعری کا مذاق پیدا ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں مختاری کا امتحان پاس کر کے بنارس میں مختارِ عدالت ہوئے۔ ایک کامیاب مختار ہونے کے علاوہ مشرقی تہذیب کا مجسمہ تھے۔

استاد کی یادگار ہونے کے سبب بنارس کی ادبی محفلوں میں فائزؔ مرحوم کے بعد انہی کو بزرگ مانا جاتا تھا۔ شاگردوں میں نوابؔ بنارسی، یٰسینؔ بنارسی، معین بنارسی، الٰہی بخش، ناظم بنارسی کے نام ملتے ہیں۔ اردو اور فارسی قصاید لکھنے کا شوق تھا۔ یہ پیغمبر اسلام کی سوانح عمری ''ہدیۃ السعید'' کے عنوان سے نظم فرمائی جو لکھنؤ پریس واقع محلہ نوبستہ میں چھپی تھی۔ کتاب میں تاریخ طباعت کا کہیں ذکر نہیں۔ حضرت امیر مینائی سے اپنے کلام کی داد بھی پائی۔ ان کی شاعری کے بارے میں لالہ سری رام ایم۔ اے۔ کی یہ رائے ہے ''تصوف سے طبیعت کو لگاؤ ہے۔ بعض شعر اتنا بلیغ کہتے ہیں کہ معنی شکوہ الفاظ کی نقاب میں چھپ جاتے ہیں یا دوسرے پیرایہ میں یوں کہیے کہ شعر کے معنیٰ آپ کے ذہن مبارک میں رہتے ہیں۔[1] کلام ملاحظہ فرمائیے۔

طلسم سبزۂ خط نور جاں ہے روئے روشن کا
فروغِ بال طوطی آئینہ ہے مرغ گلشن کا

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد چہارم صفحہ ۲۱۵-۲۱۴

فلک فانوسِ روشن ہے کسی کی شمعِ مدفن کا
صبا کافی نہ تھا شاید سہارا تیرے دامن کا

سامانِ توکل ہے مجھے عظمتِ شاہی
دریوزہ گر نقش حصیرِ فقرا ہوں

سعیدؔ اک شمع کافوری دمِ سرد اپنا روشن ہے
جلایا آہ کے شعلہ سے تارِ رشتۂ جاں کو

ٹپکے جو آنسو کا قطرہ لعل لب کی یاد میں
تابداماں گوہر احمر بنے اور ٹوٹ جائے

جب سے بخدا کھو کے خودی اُن پہ فدا ہوں
خود مجھ کو یہ معلوم نہیں کون ہوں کیا ہوں

آنسوؤں سے اس قدر آنکھوں نے سینچا نخل غم
ساغر نرگس میں باقی بوند بھر پانی نہیں

سمجھا تھا آپ لیتے ہیں سینے میں چٹکیاں
کیا لطف مجھ کو کاوش دردِ جگر میں تھا

وجہ حجاب شاہد معنی ہیں غفلتیں
باہر جسے سمجھتے تھے وہ اپنے گھر میں تھا

دل ہمارا تو نے اے بت پارہ پارہ کردیا
سخت حیرت ہے خدا کا گھر بنے اور ٹوٹ جائے

ان کے ملنے کی خبر پا کے بھی دھڑکا نہ گیا
وعدۂ وصل تو ہے رات مگر چھوٹی ہے

بارہا آج ہے بے وجہ پس پشت نگاہ
آپ جھجکیں نہیں یہ سانپ نہیں چوٹی ہے
قاتلِ گردش دوراں کی سمجھ موٹی ہے
پاپڑ انساں سے جو بلواتی ہے وہ روٹی ہے

☆............☆

نابود تھا جس نے ابتدا کو دیکھا اور بُود ہوا جو انتہا کو دیکھا
قایل ہمہ اوست کا جو ہے حسن خیال سجدہ کیا بت نے جب خدا کو دیکھا

☆............☆

گام وجود ہے یاں گردِ عدم میں پنہاں
ہر نقش پا عبارت ہے مٹی فنا کی
چکی نے آسماں کی دانہ کو پیس ڈالا
گندم کے لب سے پوچھو تقریر آسیا کی

☆............☆

سعؔید صاحبِ دیوان تھے۔ ان کا دیوان غیر مطبوعہ حالت میں گوشۂ گمنامی کی نذر ہو چکا ہے۔

سعؔید جون ۱۹۱۷ء تک زندہ تھے۔

خلیل الدین حسن طاہؔر بنارسی: ذاکر بنارسی کے داماد بھی تھے اور شاگرد بھی۔ بنارس کے استادوں میں سے تھے۔ ان کے کئی شاگرد مختلف شہروں میں موجود تھے۔ ان کے خاندان کے لوگ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے۔ بہت سا کلام تلف ہو چکا ہے۔ صاحب

دیوان تھے۔ ان کے دیوان کے چند بوسیدہ ورق جو اس وقت میرے پاس ہیں میرے ہم ذوق ہم نشین عبدالرشید سونا والے کی دوڑ دھوپ سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان اوراق میں طاہر کی غزلیات بھی ہیں اور بھوجپوری دادرے بھی۔ ایک آدھ غزل خالص صوفیانہ ماحول کی بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ طاہر اہل دل میں سے تھے اور سنگیت سے بھی بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ دادروں میں محبوب کو کہیں موہن لکھتے ہیں کہیں گردھر اور کہیں کملی والا۔ راگ راگنیوں سے واقفیت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک دادرا بھیرویں بھی لکھا ہے۔ دادروں کے اشعار برجستہ ہیں۔ ایک دادرا یوں شروع ہوتا ہے۔

نجریا لاگی ہو بالے پن سے

یہی مرغِ نظر یا رہے مسکن تیرا — ہو گیا دل میں مرے اب تو نشیمن تیرا
کم سنی میری تھی اے یار تو بچپن تیرا — یاد آتا ہے بہت ہم کو لڑکپن تیرا

نجریا لاگی ہو بالے پن سے

کیا بیتاب محبت کو بڑھا کر تم نے — ہائے بے آس کیا ہم کو ستا کر تم نے
جادو بچپن سے کیا آنکھ ملا کر تم نے — دل کو مجروح کیا تیر لگا کر تم نے

نجریا لاگی ہو بالے پن سے

ایک دادرا ہے:-

بسار آئی کنگنا ہو ندیا نالے

ہمارے ہاتھوں کی زینت تھا مہرباں کنگن — خبر نہیں کہ یہاں کھو گیا کہ واں کنگن
ابھی تو ہاتھوں میں تھا میرے بے گماں کنگن — ذرا تو دوستو ڈھونڈو کہ ہے کہاں کنگن

بسار آئی کنگنا ہو ندیا نالے

ہزار ڈھونڈھا نہیں ملتا ہے پتا صاحب　　کہ دل لگی سے کسی نے چھپا دیا صاحب
ہمیں تو یاد نہیں آتا کیا ہوا صاحب　　گرا ہے راہ میں یا گھر سے کھو گیا صاحب
بسار آئی کنگنا ہو ندیا نالے

دادرا بھیرویں ملاحظہ ہو۔

سنو لیا من بھائے ہو بانکے یار
جگناتھ گیا میں ہے کرشمہ تیرا　　کاشی رامیشور میں ہے جلوا تیرا
متھرا میں اودھ میں بھی ہے شہرا تیرا　　ہردوار میں ڈھونڈھتا ہے شیدا تیرا
سنو لیا من بھائے ہو بانکے یار
ہے رُخ کی چمک سے تیرے متھرا روشن　　بیتاب کیا ہے تم نے دیکر درشن
بھاتا نہیں اب تو کچھ بھی ہم کو موہن　　طاؔہر کو دکھا دو جلد اب بندرابن
سنو لیا من بھائے ہو بانکے یار

یہی جذبات اب اس غزل میں دیکھیے جو بنارس کی گنگا جمنی تہذیب کی مظہر بھی ہے۔

کبھی مینھ لگا کے یہ ریت بھئی تمہیں چاہیے ایسا نہ شام ہری
کس دیس میں موہن جا چھائے اس دیس میں آنا چھوڑ دیا
مو ہے تجھ بن کل نہیں آوت ہے نس رین جیا گھبراوت ہے
اب تلپ تلپ جیا جاوت ہے کیوں درس دکھانا چھوڑ دیا
تن چھین لیو من موہ لیوہ اے کالی کملیا والے پیا
موری پیت بڑھی تب دور بھیو کیوں پیت نباہنا چھوڑ دیا

☆..........☆

جیا بن جل مچھلی سا ترپت ہے تن برہا کی اُگن جراوت ہے
میں تو سونی سجریا پہ تلپت ہوں کیوں سپنے میں آنا چھوڑ دیا

دکھ درد بڑھو سکھ چین گیو جیا بیاکل ہے اب طاہرؔ کا
کیوں مجھ سے پیا تم روٹھ گئے کیوں مجھ کو بلانا چھوڑ دیا

طاہرؔ کی طبیعت میں بڑی اُپج ہے۔ غزلوں میں اکثر قدیم تجربات کے نئے پہلو کھانے کی کامیاب کوششیں نظر آتی ہیں۔ مضمون آفرینی کا شوق ہے۔ لطیف تشبیہات بھی موجود ہیں اور استادانہ نکتہ سنجیاں بھی۔ فرماتے ہیں:

نہ فرشِ گل پہ کبھی ہم غبار ہو کے چلے
صبا سے کہہ دو کہ گلشن میں پاؤں دھو کے چلے

ہزار کوس پھرے جیتے جاگتے یارب
عدم کی راہ یہ کیسی ہے جس میں سو کے چلے

کسی کو ہو مژۂ چشم نرگسیں اچھی
ہمارے حق میں تو کانٹے حضور بو کے چلے

نہ دیکھا نفع محبت میں یار کے کوئی
غمِ فراق میں دل کو بھی ہائے کھو کے چلے

فلک پہ روح بدن زیر خاک ہے طاہرؔ
کہ خود تو پار ہوئے کشتیاں ڈبو کے چلے

☆..........☆

نہ طے ہوئی کبھی منزل اسی زمیں پہ رہے
مثال نبض چلے عمر بھر وہیں پہ رہے

حرم ہو دیر ہو میخانہ ہو کلیسا ہو
خدا کو یاد رکھنے آدمی کہیں پہ رہے

کہاں یہ چاند کہاں چرخ نیل گوں توبہ
پسند ہو تو یہ ٹیکا تری جبیں پہ رہے
ہری ہری ہیں دلا چوڑیاں یہ زہر نہ ہوں
ذرا خیال بھی اس مارِ آستیں پہ رہے
مزا تو جب ہے دو طرفہ ہو سیر محشر کی
خیال حق پہ رہے دل کسی حسیں پہ رہے
سمجھ کے آگ نہ سیکیں مریض درد جگر
ذرا نقاب بھی اس روئے آتشیں پہ رہے
تلاش ہے دلِ طاہرؔ کو اسمِ اعظم کی
نبیؐ کا نام ہے اچھا جو اس نگیں پہ رہے

☆..........☆

کبھی سہواً جو ہم برگشتہ قسمت گھر میں رہتے ہیں
تو مثل آسیا بیٹھے ہوئے چکر میں رہتے ہیں
قضا کھاتی رہے گی سینکڑوں پلٹے قیامت تک
کہ لاکھوں تار میری شکل کے بستر میں رہتے ہیں
نمایاں ان کے دانتوں کی چمک ہے چاندنی پر بھی
یہ وہ بخیے ہیں جو مہتاب کی چادر میں رہتے ہیں
تعلق بعد مردن بھی نہ چھوٹا ہم سے اے واعظ
کہ میری قبر کے تختے ترے منبر میں رہتے ہیں

پہنچنا یار تک مشکل نظر آتا ہے اے طاہرؔ
رقیبانِ سیہ رو صحبتِ دلبر میں رہتے ہیں

کبھی آسماں سے میں کم نہیں مرے داغِ دل کا یہ حال ہے
کہ گھٹے تو شکل ہلال ہے جو بڑھے تو صاف کمال ہے

مہ و مہر کو نہ ثبات ہے نہ قیام ہے شب و روز کو
کبھی رات ہے تو ہے دن کبھی، کبھی ماہ ہے کبھی سال ہے

فقط اختلافِ مقام ہے یہ شراب ورنہ بری نہیں
کہ یہاں پیو تو حرام ہے جو وہاں پیو تو حلال ہے

ذرا دیکھو مذہبِ عشق کو عجب الٹا پلٹا طریق ہے
ہمیں الٹے ان کو مناتے ہیں اور ہمیں سے ان کو ملال ہے

یہ زمانہ مثلِ طلسم ہے اجی طاہرؔ آپ کہاں پھنسے
جسے دیکھتے ہو وہ خواب ہے جسے سوچتے ہو خیال ہے

☆..........☆

جو لطف رقیبوں پہ ہے ہم پر تو نہیں ہے
وہ پہلی نظر آپ کی دلبر تو نہیں ہے

کیا حُسن سے ایمان بھی لے لیگا کسی کا
مانا کہ وہ یوسف ہے پیمبر تو نہیں ہے

اس جور کی اس ظلم کی کچھ حد بھی ہے صاحب
آخر یہ کلیجہ مرا پتھر تو نہیں ہے

دل لاکھوں کھینچے جاتے ہیں کیوں چشم زدن میں
کیا آپ کی یہ چشم فسوں گر تو نہیں ہے
ابرو سے حسینوں کے جگر کٹتے ہیں کیوں کر
ان بالوں میں پنہاں کوئی خنجر تو نہیں ہے
رفو کر دیں اگر تار نظر سے ہم تو اچھا ہے
کہ بے موقع ذرا مسکی ہوئی اس گل کی چولی ہے
تھکے ہیں بات کیا ہوگی نکیرین آج پھر جاؤ
کمر ہم نے ابھی منزل بہ منزل آ کے کھولی ہے
دہن سے نام طاؔہر مصطفٰے کا لیتے ہو لیکن
زباں بھی تم نے اپنی چشمۂ کوثر سے دھولی ہے؟

☆..........☆

بہت دنوں پر ہم آ گئے ہیں نشاں تو رہنے دے کوئی واعظ
حرم سے بے دخل ہے جو صہبا تو کیا سبو بھی نہیں رہے گا

☆..........☆

لالہ سری رام ایم۔ اے۔ کے بیان کے مطابق بنارس کے مشہور شاعر حافظ رحمت بنارسی داغؔ کے شاگرد ہونے سے پہلے ۱۸۹۸ء تک طاؔہر بنارسی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ [1] طاہر کا انتقال ۱۹۱۵ء یا ۱۹۱۶ء میں ہوا۔

شوقؔ بنارسی: سعیدؔ بنارسی کے ممتاز شاگرد اور مشاق شاعر تھے۔ ان کے خاندان کا

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد سوم صفحہ ۳۶۷

سلسلہ نواب میر قاسم والیے بنگال و بہار واڑیسہ سے ملتا ہے۔ نواب سید اسد اللہ متخلص بہ شوقؔ ۱۸۸۶ء میں کٹرہ داراشکوہ بنارس میں پیدا ہوئے اور ۵۱ برس کی عمر میں ۱۰؍جولائی ۱۹۳۷ء کو انتقال فرمایا۔ مسجد لاٹ بھیرو کے نزدیک پنج شریف میں دفن ہیں۔ حضرت صفیؔ لکھنوی اور عزیزؔ لکھنوی آپ کے مداحوں میں تھے۔ انجمن تہذیب الاخلاق کے سالانہ اجلاس میں لوگ ان کا کلام سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ زبان میں اگرچہ لکنت تھی اس کے باوجود شعر خوانی کا انداز بہت دلکش تھا۔ قصیدہ بڑی محنت سے لکھتے تھے لیکن بڑی فراخدلی سے تقسیم کردیتے تھے۔ بنارس کے ایک تاریخی مشاعرے میں جس میں پروفیسر ناصریؔ بھی شریک بزم تھے شوقؔ کی طرحی غزل کامیاب رہی تھی۔ اس غزل کے درج ذیل اشعار سے ان کی غزل گوئی کا رنگ ظاہر ہوجائے گا۔

جوشِ سودا ہے یہ نیرنگ نمایاں ہوجائے
دل کا چھالا کبھی خنداں کبھی گریاں ہوجائے

حسنِ آزادی ہے ہنستا ہوا چھالا دل کا
بند ہوجائے تو قفلِ درِ زنداں ہوجائے

کر کے برباد مجھے کس لیے پچھتاتے ہو
خاک کا کام یہی ہے کہ پریشاں ہوجائے

عرفیؔ، سوداؔ اور محسنؔ کی مشہور زمین میں قصیدہ تحریر فرمایا ہے۔ تشبیب میں بہاریہ منظر یوں پیش کرتے ہیں۔

بارشِ نور سے شبنم کا جو تر دامن ہے
آتشِ گل کی دہکتی ہے چمن میں منقل

دردِ سر میں جو ہوا فاختہ کی کُو کُو سے
گھس کے ہر شاخ نے ماتھے پہ لگایا صندل
پائے نازک پہ نہ آجائے ورم صرصر کے
ہر طرف صحن میں سبزے کا بچھا ہے مخمل
خوش خرامی سے جو چلتی ہے صبا صحرا میں
سر اٹھائے ہوئے تکتے ہیں ہر اک سمت جبل

ایک جگہ گورستان کا نقشہ بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے:-

جھاڑ کانٹوں کے لگے ہیں سر مدفن اُن کے
جو شب و روز کیا کرتے تھے سیرِ گل زار
کہیں اُکھڑے ہوئے تعویذ لحد کے ہیں پڑے
دلِ صد چاک کی صورت کہیں قبریں ہیں فگار
وائے حسرت کہیں اُلٹے ہوئے رکھے ہیں چراغ
کہیں بکھرے ہوئے پروانوں کے پر عبرت زار
بے ثباتی کہیں روتی ہے لحد پر آکر
سوزشِ غم سے کہیں شمعِ لحد ہے خوں بار
ڈال دے لا کے کوئی پھول کی چادر ہمیں کیا
اپنے اجڑے ہوئے گلشن میں نہ آئے گی بہار
شمعِ دل سوز بھی گر ہو تو وہ کے ساعت کی
وہ بھی ہو جاتی ہے رو رو کے سحر تک بے مار

غیر تو غیر ہیں اپنوں کی پھری ہیں آنکھیں
فاتحہ کو کوئی آئے پہ بہت ہے دشوار

تشبیب اور گریز کے بعد جب ممدوح کی مدح پر آتے ہیں تو زور کلام کے بڑے اچھے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک طویل قصیدہ حضرت علی بن ابی طالب کی شان میں کہا ہے۔ چند شعر مدح کے درج کیے جاتے ہیں۔

ذرا طبع کرم گستر اگر مایل ہو بخشش پر
صدف فوراً نکل آئے گہر لے کر سمندر سے

اگر معجز بیانی یہ دکھائیں اپنی عالم میں
زبان گنگ کیا شے ہے صدا پیدا ہو پتھر سے

دمِ بخشش اگر اعجاز دکھلائے کرم ان کا
نمو کے جوش میں لعل و گہر پیدا ہوں کنکر سے

یہ وسعت دیں جو ذرے کو نیا پیدا ہو اک عالم
جو یہ چاہیں تو ہر قطرے کو ٹکرا دیں سمندر سے

لگے تھے تیر میں تیر اور نشانے پر نشانہ تھا
دمِ تیر افگنی یوں تیر پھینکے دستِ انور سے

نہ سمجھے شوقؔ ان کا مرتبہ کوئی تو کیا ہوگا
کہ ان کی آبرو پوچھے کوئی خلاق اکبر سے

☆............☆

ناصؔر بنارسی: فائزؔ کے شاگرد رشید عبدالحمید بنارس میں آغا ناصؔر کے نام سے مشہور تھے۔ فارسی دانی میں اپنے استاد کے حقیقی شاگرد تھے۔ فائزؔ کے بعد فارسی علم و ادب کے شائقین ناصؔر کی علمیت کے قایل تھے۔ گھر میں اگر کسی کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق ہو تو مدنپورہ کی عورتیں اب بھی کہتی سنائی دیتی ہیں ''کیا آغا دار بنو گے؟'' ناصؔر کے نامور شاگردوں میں بنارس کے علامہ عبدالمجید الحریری سابق کونسل جنرل سعودی عرب کا نام سرِ فہرست ہے۔ موصوف کی فارسی و عربی کی معلومات قابلِ رشک ہیں۔ ناصؔر نے ساری زندگی معلم کی حیثیت سے گزاری۔ بہت تنگ دست رہتے تھے لیکن ان کی جمعیت خاطر کا خزانہ ہمیشہ محفوظ رہتا تھا۔ شاید خاقانؔی کی طرح آخر کار وہ بھی اسی نتیجے پر پہونچ چکے تھے کہ:۔

پس از سی سال این نکتہ محقق شد بہ خاقانؔی
بیک دم مطمئن بودن بہ از تاجِ سلیمانی

ناصؔر کی تاریخ ولادت ۱۸۶۳ء اور سال رحلت ۱۹۱۸ء ہے۔ ان کے استاد بھائی غنؔی بنارسی نے اس مصرع سے تاریخ نکالی ہے۔

واحسرتا کہ ناصؔر شیریں زباں بمرد

۱۹۱۸ء

ناصؔر کے حقیقی بھائی منشی عبدالصمد قاصر اچھے شاعر بھی تھے اور اپنے دور کے بہترین شاطر بھی۔ شعر گوئی میں قاصؔر اپنے بھائی ناصؔر کی نسبت زیادہ سنجیدگی سے کام لیتے تھے۔ ناصؔر کے بارے میں میری رائے ہے کہ وہ شعر ضرورتاً کہتے تھے اور بنیادی طور پر ایک عالم تھے۔ تاریخ گوئی میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ چند متفرق اشعار اور کچھ نامکمل غزلیں دستیاب ہوئی

ہیں جو مختلف طرحی مشاعروں کی یادگار ہیں۔ روایتی مضامین میں کہیں کہیں جب خلوص فکر سے کام لیتے ہیں تو اچھے شعر نکل آتے ہیں۔

غم کونین سے خالی جگہ کوئی نہیں نکلی
اگر نکلی تو بس میخانے کی اک سرزمیں نکلی

جسے عاشق کے جینے اور مرنے کی نہیں پروا
اسی کو ڈھونڈتی اپنی نگاہِ واپسیں نکلی

☆............☆

شیریں میں ناز جذبۂ دل کوہکن میں ہے
ہنگامہ گرم ساز وہی ہر بدن میں ہے

آتا نہیں ہے کیوں دل مجروح کو قرار
کیا اور تیر ترکشِ ناوک فگن میں ہے

زلفیں ہٹایئے رُخِ زیبا سے مہرباں
اختر شناس کہتے ہیں سورج گہن میں ہے

ناصؔر اگرچہ حضرتِ آصف نہیں رہے
شعر و سخن کی قدر ابھی تک دکن میں ہے

جہاں میں شان بخشش میرے ساقی کی نرالی ہے
کہ جس کے در پہ جم کاسہ بکف ادنیٰ سوالی ہے

بھلا محشر میں ہم تم پر کریں گے خون کا دعویٰ
تڑپ کر آپ مقتل میں لہو پر خاک ڈالی ہے

عدو کو سہمگیں پایا تو رکھا میان میں خنجر
انھوں نے دو تنِ بے جاں میں گویا جان ڈالی ہے

پیش آیا روزِ حشر عجب ماجرا مجھے
الزام عشق داد کے بدلے ملا مجھے

☆..........☆

راستی شیخ و برہمن میں نہیں
پیچ ہے دستار میں زنار میں

امداد ترک خدمتِ خیرالانام ہے
ترکی کے ساتھ اپنی بھی ترکی تمام ہے

☆..........☆

بہارِ عالم نیرنگ دم بھر کا تماشا ہے
خزاں ہر سمت سے گھیرے ہوئے ہے اس گلستاں کو

حواس و ہوش میں جوشِ جنوں میں اب کہاں باقی
کہ میں زنداں کا در سمجھا ہوں اپنے چاک داماں کو

قاصد کی لاش آئی پئے دفن میرے پاس
خط کی رسید مر کے بھی پہنچا گیا مجھے

وہ ہماری سخت جانی سے جو مضطر اور ہے
خود ہمیں سے پوچھتا ہے کوئی خنجر اور ہے

☆..........☆

ہیں حسینانِ زمانہ یوں تو سب بیداد خو
جس کے ہم مارے ہوئے ہیں وہ ستمگر اور ہے

عاشقوں کے غم سے زینت ہوگی بزم یار کی
آہ کا شعلہ چراغ انجمن ہوجائے گا

فلک والے بھی تیری آرزوئے دید رکھتے ہیں
نظر بن بن کے سورج کی کرن اے مہ جبیں نکلی

غم شفا کا بھی نہیں عشق کے بیماروں کو
یہ وہ آزار ہے کھو دیتا ہے آزاروں کو

عمر ظالم کی بہر شکل نہیں ہوتی دراز
مورچے کھا گئے دو روز میں تلواروں کو

دیکھ کر تجھ کو خریدار نہ بنتے ان کے
کچھ نظر ہوتی جو یوسف کے خریداروں کو

جب سے دنیا میں یہ آزار محبت پھیلا
ملک الموت مسیحا ہوا بیماروں کو

☆..........☆

ساجد بنارسی: محمد اسمٰعیل نام ساجد تخلص والد کا نام محمد اسحاق شاہ قادری۔ اس خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ بہت دنوں میں چلا آتا ہے۔ آبا و اجداد میں سے اکثر لوگ صاحب رشد و ہدایت تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق سے ملتا ہے۔ اسی مناسبت سے صدیقی

کہلاتے تھے۔ ساجدؔ ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ مرزا فائزؔ سے زبان وادبیات کی تعلیم پائی۔ انھیں سے اپنے کلام پر اصلاح بھی لیتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں فائزؔ کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد مرزا طاہرؔ کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ تصوف میں مولانا شاہ محمد کامل صاحب قادری ولی پوری کے مرید تھے۔ ساجدؔ کا انتقال ۱۹۵۹ء میں تقریباً ۶۴ برس کی عمر میں ہوا۔ ساجدؔ کا محبوب موضوع فن تاریخ گوئی ہے۔ فائزؔ کے بعد ساجدؔ نے اس فن میں بڑی مہارت حاصل کر لی تھی۔ تاریخ کے مصرعے گویا ہر وقت ذہن میں حاضر رہتے تھے۔ ادھر تاریخ کی فرمائش ہوئی ادھر انھوں نے فوراً مصرع پیش کر دیا۔ شاعروں، ادیبوں، صوفیوں اور بیسیوں واقعات کی تاریخیں ان کے کلام میں محفوظ ہیں۔ بنارس کی بہت سی مسجدوں، مدرسوں اور دوسری عمارتوں پر ان کی کہی ہوئی تاریخیں کندہ ہیں۔ غزل بھی کہتے تھے لیکن زاہدانہ افتاد طبع کے پیش نظر دیار محبوب میں ایک لمحہ توقف کر کے فوراً دربار نبی میں جا پہنچتے تھے۔ مجموعی حیثیت سے ان کے کلام میں قدیم رنگ کی جھلک زیادہ دکھائی دیتی ہے۔

جو خنجر یار کی زیبِ کمر ہے
پئے تسلیم حاضر اپنا سر ہے
شب فرقت کو تم سمجھے ہو آساں
یہی تو پیشتر سے بیش تر ہے
خبر اس کو نہ ہو اور عرش ہل جائے
ہماری آہ میں کیسا اثر ہے
آتے آتے راہ سے وہ پھر گئے
مجھ سے برگشتہ میری تقدیر ہے

اپنی صورت آئینہ میں دیکھ کر
اپنا دل تھامے بتِ بے پیر ہے
وصف کس منہ سے ترا ساجد کرے
تو سراپا نور کی تصویر ہے

☆..........☆

فصل گل آئی ہے ساقی برخیز
جام پر جام دیے جالبریز
دل میں ہے دردِ محبت غم خیز
کیوں نہ ہوں اشک سے آنکھیں لبریز
رحمتِ حق کی اُمیدیں واعظ
اور میخانے کے سائے سے گریز

☆..........☆

مبتلائے درد کے جینے کا ساماں کردیا
مسکرا کے تم نے ہر مشکل کو آساں کردیا
حُسن کو کونین کی زینت کا عنواں کردیا
گلشنِ ایجاد کو فردوس ساماں کردیا
انقلاب انگیز ہے تاثیر جذبِ حُسن کی
گل کو خنداں کردیا شبنم کو گریاں کردیا
جلوۂ رنگینیٔ باغِ تصور زندہ باش
تو نے شامِ غم کو بھی صبح گلستاں کردیا

کب سخن سے استعانت مجھ کو حاصل تھی مگر
فیضِ فائزؔ نے مجھے ساجدؔ خنداں کر دیا

رباعیات کا نمونہ یہ ہے:۔

افسوس کہ دنیا سے سر اقبال اُٹھے
کیوں دورِ مسرت بھی نہ فی الحال اُٹھے
اقبالؔ کا مرنا کوئی ہم سے پوچھے
کیا رہتا ہے جب قوم سے اقبالؔ اُٹھے

یوں قوم کے ہمدرد تو ہر سال اُٹھے
ذی علم اُٹھے صاحب اموال اُٹھے
یہ سال بڑا نحس ہے ساجد افسوس
یکتائے زماں حضرت اقبالؔ اٹھے

☆............☆

جمیلؔ بنارسی: محمد عثمان جمیلؔ بنارسی ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۱ء میں رہسپارِ عدم ہوئے۔ منشی غنیؔ بنارسی کے شاگردوں میں تھے۔ مشاعروں میں بڑے شوق سے شرکت فرماتے تھے۔ ان کے حالات زندگی خود اُن کے اہل خاندان سے بھی معلوم نہیں ہو سکے۔ چند اشعار ان کی یادگار ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

جب زندگی و موت کا حاصل نہیں معلوم
بیجا یہ شکایت ہے کہ منزل نہیں معلوم
میں منتظر دید ہوں اے موت ٹھہر جا
تجھ کو ابھی شاید مری مشکل نہیں معلوم

طوفانِ محبت سے ابھی کھیل رہا ہوں
دنیا یہ سمجھتی ہے کہ ساحل نہیں معلوم

وارفتگیِ شوق نے گم کردیا ایسا
منزل کے طلب گار کو منزل نہیں معلوم

شاید کہ اُسے ہو بھی رہائی کی تمنّا
جس کو سبب طوق و سلاسل نہیں معلوم

لبریز کردے پھر خم و مینا شراب سے
ساقی پلا کہ جی نہیں بھرتا شراب سے

بیتِ حرم ہے میرے لیے تیرا میکدہ
اب تو وضو بھی ہوگا تو ہوگا شراب سے

زاہد تو اپنے زہد و عبادت کی فکر کر
اس موسم بہار میں توبا شراب سے

☆..........☆

افسوؔں بنارسی: مرزا فائزؔ کے شاگرد اور آغا حشرؔ کاشمیری کے دوست حافظ محمد یوسف افسوؔں بنارسی کی عمر کا بیشتر حصہ بمبئی اور کلکتہ میں گزرا۔ آغا حشرؔ بمبئی میں پہلی دفعہ انہی کے یہاں ٹھہرے تھے۔ ان کے بھائی عبداللہ زردوز بمبئی میں کافی شہرت رکھتے تھے۔ افسوؔں کاؤس جی کھٹاؤ والی کمپنی میں ڈرامہ نگار ہو گئے تھے۔ بعدازاں اسی کمپنی کے ساتھ وہ کلکتہ چلے آئے جہاں آغا حشرؔ سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ آتشبازی کے ماہر اور آشپبتری میں کامل فن کا درجہ رکھتے

تھے۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ایک کتاب ''تحقیق الفاظ'' پر لکھی تھی۔ آغا حشر بھی ان کی لسانی اورادبی معلومات کے قائل تھے۔ کلام نایاب ہے۔ چنداشعار دستیاب ہوے ہیں۔ اخلاقیات اورعریانیات ان کے مرغوب موضوع ہیں۔

علم سے مطلب ہے ہونا ماہیت سے آشنا
ہے وہ جاہل جو دوئی میں پڑھ کے بھی الجھا رہا

جاہل نہیں سمجھتے ہیں بے علم شخص کو
جاہل وہ ہے خدا کو نہیں جانتا ہے جو

پیر جاہل جس کا ہو گمراہ وہ انسان ہو
رہروی میں کور کی تقلید سے نقصان ہو

جسے کہتے ہیں آزادی وہ اٹھنا ہے تعین کا ہے
وہ ہے قیدی کہ ہو دلبستگی جس شخص کو گھر سے

عدو پر بھی جو اچھے لوگ ہیں احسان کرتے ہیں
نوازش خاک پر بھی قطرۂ باراں کی ہوتی ہے

بے مربی کے مرتبہ نہیں ممکن افسوںؔ
پنجۂ مہر سے ہو چرخ نشیمن شبنم

افسوںؔ اُٹھا کے سر پہ نہ لے جائے گا کوئی
ہونا نہ ہونا ایک ہے دنیا کے مال کا

ہرگز مُرادِ ناوک ہوتی نہیں ہے حاصل
جب تک نہیں نکلتا ہے گوشہ کماں سے

دنیا میں راستی ہی بس اک ایسی چیز ہے
اللہ کو جب سب سے زیادہ عزیز ہے

طلبگار راحت جو ہے ذی شعور
وہ کوئی ہنر یاد رکھے ضرور

دو عالم جس کو کہتے ہیں وہ بیت فی البدیہہ ہے
ازل میں امتحاں اس نے لیا تھا طبعِ موزوں کا

نافہم کے کانوں میں سخن کی نہ ہو وقعت
بے حسنِ صدف قطرہ بھی گوہر نہیں ہوتا

☆…………☆

فضاؔ بنارسی: منشی سنگھٹا پرشاد بیتابؔ بنارسی کے شاگرد رشید فضاؔ تخلص کرتے تھے اور مشاعروں میں اکثر میر مشاعرہ کے فرائض انجام دیتے تھے۔ قوم کے کھتری اور دل کے رئیس تھے۔ ادبی اجتماعوں کا شوق تھا۔ اپریل ۱۹۱۷ء میں ایک عظیم الشان یادگاری مشاعرہ انھوں نے محلّہ چوکا گھاٹ کے ایک سدا بہار باغ میں منعقد کیا تھا جس میں بنارس کے تمام چھوٹے بڑے شعرا اور ہندو مسلم رؤسا نے شرکت کی تھی۔ ''گلدستۂ شادمانی'' اسی مشاعرہ میں شرکت کنندگان کی غزلیات کا مجموعہ ہے جس میں فضاؔ کی دو غزلیں بھی شامل ہیں۔ چند شعر نمونتاً درج کیے جاتے ہیں۔

آج مشکل ہوگئی آسان ہنستے بولتے
میرے گھر وہ آئے رب کی شان ہنستے بولتے

ایسی صحبت ہے غنیمت، شکر ذات پاک کر
چار مل بیٹھیں جہاں انسان ہنستے بولتے

اے خوشا طالع کہ سجدہ ہے ترے در کا نصیب
ہوگیا ہے مہرباں دربان ہنستے بولتے

میرے ہنسنے بولنے پر آگیا کس کا خیال؟
کیوں نہیں تم آج میری جان ہنستے بولتے؟

روتے آئے دارفانی میں نہ اس کو بھولیے
ہے غنیمت جائے جو انسان ہنستے بولتے

اس ''طرح'' میں اتنی غزلیں کہہ گئے اہلِ زباں
ہوگیا تیار اک دیوان ہنستے بولتے

لاکھ صورت بھی بدل کر آئے وہ غنچہ دہن
ہم تو لیں ہر رنگ میں پہچان ہنستے بولتے

تھے تو دانش مند دانائی نہ کام آئی قضا
لے گیا دل کیسا اک نادان ہنستے بولتے

☆............☆

کاملؔ بنارسی: منشی پیارے لعل سریواستوا کاملؔ بنارسی ۱۸۹۸ء سے ۱۹۵۸ء تک زندہ رہے۔ بنارس ہندو یونیوسٹی میں مرزا فائزؔ سے اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بی.اے. پاس کر کے آنریری مجسٹریٹ ہوگئے۔ شاعری کا شوق تھا۔ فائزؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ اکثر علمی موضوعات پر نظمیں لکھتے تھے۔ ایک نظم ''گردشِ خون'' کے موضوع پر لکھی تھی۔ جس میں بڑی کاوش سے انسانی بدن میں خون کے دورے کی کیفیت نظم کی تھی۔ استاد سے بڑی عقیدت رکھتے

تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ ملزمین ان کی عدالت سے مرزا فآئز سے نسبت ظاہر کر کے رہا ہو گئے۔ کایستھ قوم کے ذہین ترین افراد میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مشاعروں کی صدارت اکثر ان کے سپرد ہوتی تھی۔ کلام نایاب ہے۔ تبرک حاضر ہے۔

''اتفاق''

ہے ''الف'' یا غیب کی آواز ہے شانِ ظفر
''ت'' سے ہے تاریکیوں میں جلوہ گر نورِ سحر
فارغ البالی ہوئی جب ''ف'' سایہ فشاں
اللہ اللہ کیا ''الف'' ہے مژدۂ آرامِ جاں
قدرتوں نے ''ق'' سے سامان پیدا کر دیے
اتفاقِ ملک نے قوموں کے دامن بھر دیے
پریم کی یہ ہے کشش بچھڑے ہوئے محرم ملیں
خوش نصیبی ہے اگر ہمراز سے ہمدم ملیں

☆..........☆

سرمایۂ عشرت ہے بہار ہولی کیوں ہو نہ صبا آ کے نثار ہولی
ہیں پھول فدا اور عنادل قربان ہر رنگ سے رنگین ہے نگار ہولی

☆..........☆

کوکبؔ بنارسی: حافظ مقبول احمد کوکبؔ بنارسی مرزا فآئز کے شاگرد فن شعر گوئی میں مہارت رکھتے تھے۔ اللہ والے بزرگ تھے۔ صوفیوں اور خانقاہوں سے عقیدت تھی۔ اکثر بزرگوں

اور صوفیوں کے لیے قطعات تاریخ نظم کرتے تھے۔ ان کے مرشد چاٹگام پاکستان میں مقیم تھے۔ کوکبؔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ کسی وقت کوکبؔ بڑے مشہور شاعر سمجھے جاتے تھے۔ اب نہ کہیں نام ہے نہ کلام۔ تاریخ گوئی کا شوق تھا اور یہی ان کا میدانِ فکر بھی ہے۔ دو قطعات تاریخ مختلف کاغذات کے ملبے سے کشف کئے ہیں، ملاحظہ ہوں:۔

قطعہ تاریخ وفات حسرت آیات

استاذی جناب مرزا محمد حسن صاحب فائزؔ مرحوم

میرزا فائزؔ محمد با حسن
شاعرِ بے مثل استادِ زماں
کامل الفن صاحب ذوقِ سلیم
نکتہ سنج و نکتہ فہم و نکتہ داں
قادر ہر طرز اصنافِ کلام
صاحبِ دیوان ہر رنگ بیاں
ناظم یکتا ادیبِ بے مثال
کشورِ شعر و سخن کے حکمراں
حیف دنیا سے اُٹھے وا حسرتا
بن گیا ماتم کدہ سارا جہاں
کیوں نہ ہو تاریک دنیائے سخن
آفتاب اوج معنی ہے نہاں
بوستانِ شاعری تھا پُر بہار
حیف صد حیف آ گئی اس میں خزاں
یوں تو شاعر آج بھی دنیا میں ہیں
آپ سا دانائے فن لیکن کہاں
ان کے غم میں خاک بر سر ہے زمیں
ان کے ماتم میں سیہ پوش آسماں
حضرت استاد کی ہو مغفرت
جنت الفردوس میں پائیں مکاں

کلک کوکبؔ نے لکھا سال وفات
فائزؔ شیریں زباں روشن بیاں

۱۳۴۷ھ

دوسرا قطعہ تاریخ فارسی میں ہے اور کوکبؔ نے اپنے استاد بھائی منشی غنیؔ بنارسی کے کسی قصیدے کے اشاعت پر موزوں کیا ہے۔

شیخ عبدالغنی نادر فکر — وصف او در بیان نمی گنجد
شاعر نغز گوی خوش گفتار — منشی نادر المثال آمد
نکتہ رس نکتہ دان و نکتہ شناس — مثل او در زمانہ کی آید
مثنوی و غزل قصیدہ و نظم — بہر اصنافِ فن شعر بلد
ہم خیالش بروزگار محال — ہمسرش در زمانہ مستبعد
از پی ایں چنیں قصیدہ نگار — عرفیؔ عصر گویمش زیبد
خوش سرائیدہ در قصیدہ خویش — حمدِ حق نعت حضرت احمد
تابش گوہرِ مضامینش — چوں ثریا بخویشتن نازد
لفظ لفظش بجائے خویش متین — ہمچو قطب فلک نمی جنبد
سطرِش بحال خویش سبب — حرف حرفش بجائے خویش سند
یا عمیم الکرم گر ایں مداح — از تو خیری درین صلہ طلبد
از سر لطف مرحمت فرما — از درِ گنج نعمتش مقصد
نہ سزا وار تنگ حوصلہ اش — بلکہ شایانِ شان رحمت خود
کوکبؔ ناقص الخیال بلید — آنکہ در علم و فضل نیست بلند
مصرعہ سالِ انطباعش گفت — نظم مقبول و دل پسند آمد

۱۳۳۷ھ

اقبالؔ بنارسی: محمد عمر کلیم کے ممتاز شاگرد بنارس کے خوش فکر شاعر خواجہ غلام محمود اقبالؔ کا ذکر مرزا فائزؔ بنارسی کے سلسلے میں کر چکا ہوں۔ کشمیری النسل تھے۔ اپنے والد خواجہ غلام نبی کی طرح وکالت شروع کی لیکن راس نہ آئی اور تاجر بن گئے۔ ناتجربہ کاری سے بڑے بڑے نقصان اٹھائے۔ ریاضؔ بنارسی، کلیم ابوالحسن نسیم سے دوستی اور فائزؔ اور ان کے شاگردوں سے معاصرانہ چشمک کا حال تحریر ہو چکا ہے۔ محشرؔ بنارسی سے بہت بے تکلفی تھی۔ محشرؔ مرحوم نے تذکرہ شعرائے بناس میں لکھا ہے کہ اقبالؔ کو نام ونمود کی خواہش نہ تھی۔ یہاں تک کہ اپنے کلام کی اشاعت بھی انھیں ناگوار گزرتی تھی۔ ایک دفعہ محشرؔ نے ان کی ایک غزل لاہور کے کسی پرچے میں بغرض اشاعت بھیج دی۔ اقبالؔ کو جب معلوم ہوا تو بقول محشرؔ انھوں نے اپنی مکمل بیاض نذر آتش کر دی۔ اس میں اقبالؔ کا تیس برس کا کلام درج تھا۔ نام ونمود سے اس قدر نفرت کی وجہ راقم الحروف کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اقبالؔ کے دیگر کلام کی طرح ان کی رباعیات کا مجموعہ اور تاریخ عرب منظوم بھی تلف ہو چکا ہے۔ آخری عمر میں مختلف امراض نے اقبالؔ کو افسردہ کر دیا تھا۔ احباب کی موت سے شکستہ دل ہو کر ڈھاکہ چلے گئے۔ ان کے تینوں صاحبزادے مشرقی پاکستان میں اچھے عہدوں پر ہیں۔ اقبالؔ کے آخری دن انھی کے پاس گوشہ نشینی کی حالت میں گزرے۔ ۱۹ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو ڈھاکہ میں انتقال ہوا۔ اقبالؔ کے چند اشعار مرزا فائزؔ کے مضمون میں پیش کر چکا ہوں۔ وہ اپنے معاصرین میں ریاضؔ، اسدؔ اور فرخؔ کی طرح بہت مقبول شاعر تھے۔ ان کے اشعار داغؔ اور امانتؔ کی بنارسی روایات کے خلاف بغاوت کا ثبوت ہیں۔ فائزؔ اور ان کے شاگردوں سے چشمک کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اقبالؔ اور ان کے ہمنشین وقت کے دوش بدوش چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ محض فن اور عروض پر پلنے والی شعر گوئی ایسی کوششوں کو ادبی وفنی

روایات سے انحراف اور گمراہی تصور کر رہی ہے۔ اقبالؔ کے یہی دو چار شعر اہل بنارس کے حافظے میں محفوظ ہیں۔

دیکھنے والے محبت کا قرینہ دیکھیں
قیس کی موت تو دیکھی مرا جینا دیکھیں

ناخدا بیٹھا رہا نذر طلاطم کر کے
کیسے ساحل پہ ٹھہرتا ہے سفینہ دیکھیں

میرے ہنسنے پر گماں رونے کا ہے
یوں غموں میں راحتیں گھل مل گئیں

ڈوبنے والے کی حسرت کیا کہیں
جب نگاہیں جانب ساحل گئیں

☆............☆

علیم مسرورؔ

خوب سے خوب تر کی جستجو میں علیم مسرورؔ کی زندگی ایک بھٹکتا ہوا غبار ہے۔ فکر و نظر کے تکاملی مراحل میں ڈاکٹر عبدالعلیم نے اکثر اپنی تخلیقات کو اس لیے طاق نسیاں کے گلدستے بنا دیا کہ ان کے لیے شاعر علیم مسرورؔ کی تخلیقی صلاحیتوں کے بلند معیار بہت توقع خیز تھے۔ عام راستے پر سب کے ساتھ چلنا اور قافلوں کے ہجوم میں منزل پر پہنچنے کا تصور ان کے لیے آج بھی اتنا ہی تکلیف دہ ہے جتنا شروع میں تھا۔ برسوں تک مسرورؔ نے اپنی نئی دنیا کا انکشاف کسی پر نہیں ہونے دیا۔ ان کے ابتدائی اشعار بھی فکر و شعور کی پختگی اور شعریت و غنائیت کی خوش آہنگی کی اچھی مثالیں ہیں لیکن قلب و نظر کے ان خزانوں کو انھوں نے دیر تک اپنے سینے کے دفینے میں محفوظ رکھا۔ ان دفینوں کا راز ان کی کم آمیزی اور دیر آشنائی کے سبب آہستہ آہستہ صرف ان دو ایک احباب پر کھلا جو ان کی خلوت و جلوت کے محرم تھے۔ مسرورؔ کے کلام کا بیشتر حصہ رفتہ رفتہ انھی بے تکلف ذرائع سے مشاعروں میں صرف ہونے لگا اور کلام کی معنویت نے بہت جلد بلند ذوق سامعین کو متوجہ کر لیا لیکن اس پردہ زنگاری کا معشوق اس کے بعد بھی نقاب کشائی پر آمادہ نہیں ہوا۔ اس کی نظر میں عوام کی خوش نظری قابل اعتماد نہ تھی۔

علیم مسرورؔ کا بچپن ریشمی ساڑیوں کے تانے بانے میں اُلجھا رہا ہے۔ ان کے والد حاجی عبدالخالق پابند شریعت ہو کر کثرت اولاد کے جلوے دیکھ رہے تھے۔ عبدالعلیم دسویں

اور آخری اولاد ہونے کے سبب کسی غیر معمولی توجہ کے مستحق نہیں سمجھے جاتے تھے۔ مدرسے میں تعلیم کے ساتھ ساتھ انھیں خاندانی روایات کا احترام بھی کرنا پڑتا تھا۔ جزدان کے علاوہ انھیں کرگھے کی خبر بھی لینا پڑتی تھی۔ اسی ماحول میں ان کے بڑے بھائی قاری عبدالمتین نے اردو کی تعلیم کے ساتھ اردو ادب میں دلچسپی لینے کا شوق کم عمر عبدالعلیم کے دل میں پیدا کردیا۔ قاری صاحب بڑے سخن شناس اور شاعر نواز بزرگ تھے۔ مومنؔ و غالبؔ کے پرستار اور سعدیؔ و حافظؔ کے گرویدہ تھے۔ شب کو عبدالعلیم جب کام پر بیٹھتے تو قاری صاحب کے حکم کی تعمیل میں ان کے ہاتھ تو تانے بانے میں مصروف رہتے اور آنکھیں کسی شاعر کے دیوان پر۔ علیمؔ کو یہ اشعار بہ آواز بلند پڑھ کر سنانے پڑتے۔ قاری صاحب اشعار کا مفہوم پوچھتے، وضاحت کے لیے دوسرے شعرا کا کلام بھی سناتے جاتے۔ اس طرح یہ مشقت علیمؔ کی ذہنی آسودگی کا سامان فراہم کردیتی۔

عمر کے ساتھ علیمؔ کی ادبی سرگرمیوں میں برابر اضافہ ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ انھوں نے خود بھی لکھنا شروع کیا۔ اسی دوران میں اپنے ہمجولی ظفرالاسلام سے ان کے جذباتی اور ادبی روابط قایم ہوئے اور دونوں دوستوں نے بچوں کے لیے ایک رسالہ ''پیامی'' کے نام سے نکالنا شروع کیا جس میں کہانیوں نظموں اور لطیفوں کے علاوہ ہلکے پھلکے ادبی مضامین بھی شایع ہوتے تھے۔ گھر والوں کی مخالفت کے ڈر سے علیم ایک فرضی نام سے اس کی ادارت کررہے تھے۔ کتابت و طباعت کے اخراجات دونوں دوستوں کو اپنے جیب خرچ سے ادا کرنا پڑتے تھے۔ یہ پرچہ اگرچہ بہت دیر تک نہیں چل سکا لیکن اس سے علیمؔ کو غیر محسوس طریقے پر دو فائدے ضرور حاصل ہوئے۔ ایک تو ان کا مضمون نویسی اور شعر گوئی کا شوق مستقل ہوگیا، دوسرے مضامین نظم و نثر کی فراہمی کے سلسلے میں کچھ شروع اور ادیبوں سے ان کی جان پہچان ہوگئی۔

اپنی ولادت یعنی ۱۹۲۶ء سے بنارس ہندو یونیورسٹی سے ۱۹۴۵ء میں انٹر میڈیٹ پاس

کرنے تک علیم کی زندگی مالی پریشانیوں کے مشکل ترین دور سے گزری لیکن یہی زمانہ ان کی ادبی شخصیت کی تشکیل کا بھی ہے۔ مختصر ترین لباس میں انھیں دکان بہ دکان اپنے مال کی قیمت وصول کرنے کے لیے سوالی بننا پڑتا تھا لیکن شب کو دس بجے کے بعد جب وہ اپنے ہم ذوق دوست ظفر الاسلام کے ساتھ کسی چائے والے کی دوکان میں گوشۂ عافیت میں پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھ کر اپنی ادبی اسکیموں کی ترتیب و تفسیر میں مصروف گفتگو ہوتے تو کاروباری مصروفیات کی حیثیت ضمنی ہو کر رہ جاتی۔ یہ ان کی عمر کا بیسواں اکیسواں سال تھا۔ غزل گوئی اب رفتہ رفتہ ان کے مزاج سے ہم آہنگی پیدا کر رہی تھی۔ زندگی کی تلخیاں اور جوانی کی انگڑائیاں طبیعت میں ہیجان اور خون میں حدت کا باعث بن رہی تھی۔ اب وہ عبد العلیم سے علیم مسرؔور ہو گئے لیکن یہ تخلص گویا اپنے ماحول سے انتقام تھا۔ ان کی محدود اور مجبور زندگی کسمپرسی اور مایوسیوں میں گھر کر افسردہ و خاموش رہتی تھی لیکن جب ان کے جذبات لباس اظہار پہنتے تھے تو اس قسم کے اشعار سننے میں آتے تھے۔ بقول علیم آج سے ۲۰ سال پہلے یہ غزل مستقبل کی غزل کا آئینہ تھی۔

ہیں رواں اختر و قمر خاموش
قافلہ اور اس قدر خاموش
حسن خاموش ہے نظر خاموش
فتنہ بیدار فتنہ گر خاموش
مضطرب بادلوں کے دامن سے
چاند گزرا ہے کس قدر خاموش
لٹ گئے کتنے قافلے لیکن
منزلیں چپ تھیں رہ گذر خاموش

رنگ محفل اور اس قدر برہم
شمع محفل اور اس قدر خاموش

غم دوراں نے ان کے منہ پر مہر خاموشی لگادی۔ وہ محجوب اور کم آمیز ہوتے گئے لیکن غمِ جاناں سے ان کو دور کا واسطہ بھی نہیں تھا بلکہ اس معاملہ میں وہ خوش بخت تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اخلاقی اقدار کا غلط مفہوم سمجھنے والے سماج کے خلاف وہ بغاوت پر آمادہ نہیں ہو سکے لیکن خود حسن کے سر پر اس سلسلے میں کوئی الزام نہیں آتا۔ اسی دور کے یہ اشعار شاید اسی کیفیت کے ترجمان ہیں۔

خود حسن کو تلاش تری اک نظر کی ہے
دیوانے تیری شان بھی دیوانہ گر کی ہے
جلوؤں پہ تیرے قید جو دیوار و در کی ہے
توہین یہ شرافت اہل نظر کی ہے
ٹوٹے نہ اک ستارۂ نازک بھی دیکھنا
اے شب سنبھالنا یہ امانت سحر کی ہے

اس دور کشمکش میں علیم کی زندگی کا کوئی مقصد متعین نہیں تھا۔ انھیں جمالِ زندگی کی آرزو ہے لیکن وہ اس کی بھیک نہیں مانگ سکتے۔ جذبۂ غیرت جوان کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی کا جزو اعظم ہے، اہل کرم کو بھی بڑی حسرت سے ان کا منہ تکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ ان کے سفر کا آغاز ہے لیکن نئے راستوں میں ان کا ہر ہر قدم خود اعتمادی کا ترجمان ہے۔

ابھی ذوق ستم ہے تشنۂ لطف و کرم میرا
بقدرِ حوصلہ ساقی نہیں سامانِ غم میرا

جمال زندگی کی آرزو لے کر کدھر جاؤں
کھڑے ہیں راستہ روکے ہوئے دیر و حرم میرا
فضائے دو جہاں میں آج تک اک حشر برپا ہے
نہ جانے خلد سے کیا لے کے نکلا تھا قدم میرا
ابھی تو دے رہی ہیں ٹھوکریں درسِ سبک گامی
ابھی آداب منزل سے ہے بیگانہ قدم میرا
نظر بیگانۂ ذوقِ طلب قسمت تہی دامن
بڑی حسرت سے منہ تکتے ہیں سب اہلِ کرم میرا
ثبوت ہمرہی ہے آج بھی راہِ محبت میں
تمہارے نقش پا کے ساتھ ہے نقشِ قدم میرا
جہاں تک خضر بھی سو بار جائیں اور لوٹ آئیں
دلیل راہ ہے اب تک وہاں نقشِ قدم میرا

۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۲ء تک علیم کا زیادہ وقت بمبئی میں گزرا۔ عروس دکن کی آغوش میں بھی صرصر روزگار نے ان کے ذہنی انتشار میں کوئی کمی واقع نہیں ہونے دی لیکن اس دور میں خود علیم نے اپنے ادبی ذوق اور تنقیدی شعور کو نکھارنے سنوارنے کے لیے اپنی ایک الگ دنیا بسالی تھی۔ بمبئی کے قیام کے دوران ان کی ملاقات مختلف ادبی اور فلمی ادیبوں اور شاعروں سے ہوتی رہتی تھی اور وہ چائے کی دوکانوں پر حمام میں مشاعروں میں ان لوگوں کی شخصیت اور فن کا بغور مشاہدہ کرتے رہتے تھے لیکن خود کو کبھی شاعر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ ان کے ملنے والے انھیں بس ایک سامع کی حیثیت سے جانتے تھے۔ یہ سامع دوسروں کے لیے سامع تھا۔ شب کو جب

مطالعہ سے فرصت ملتی تو علیم اپنے ہمزاد سے مصروف گفتگو ہوتے اور یہ گفتگو نظموں، غزلوں وغیرہ کی صورت میں قلم بند ہوتی رہتی۔ اس وقت تک وہ میرؔ وسوداؔ سے لے کر فراقؔ وفیضؔ تک سے گہرے ذہنی روابط قائم کر چکے تھے۔ ترقی پسند بھی ان کے زیر نظر تھے اور حلقہ ارباب ذوق والے بھی۔ لیکن نہ تو سیاست ان کو مسحور کر سکی اور نہ جنس ہی ان کے اعصاب پر سوار ہو سکی۔ انھوں نے اپنے طور پر سمجھ لیا کہ وہ ان دونوں تحریکوں کا ساتھ دینے سے قاصر رہیں گے۔ بمبئی کی یادگار بہت سی نظمیں اور غزلیں ان کی جس بیاض میں محفوظ تھیں، علیم کی سہل انگاری سے وہ بیاض محفوظ نہیں رہی۔ وہ خود بنارس چلے آئے اور بیاض ہمیشہ کے لیے بمبئی میں رہ گئی۔ اس طرح بہت سی دلکش نظمیں اور غزلیں تلف ہو کر رہ گئیں۔ ''تاج محل''، ''طوائف''، ''بمبئی کو الوداع'' وغیرہ نظمیں اس کے بعد مکمل طور پر ان کے حافظے میں بھی محفوظ نہیں رہیں۔

تاج محل کو دیکھ کر شاعر کے دل میں کچھ اس قسم کے خیالات پیدا ہوئے تھے۔

نگہ شوق ہے حیران کہ یہ عالم کیا ہے
نظر میں نظارۂ زرکار ہوتی جاتی ہیں

ندرت انگشت بدنداں نظر آتی ہے یہاں
حیرتیں نقش بدیوار ہوئی جاتی ہیں

درس آداب و وفا لے گا زمانہ تجھ سے
ایک عالم کے لیے چشمۂ الفت تو ہے

دل انساں کی کہانی ہے بہت عام مگر
سینۂ سنگ میں تصویر محبت تو ہے

علیم کے دل میں بمبئی سے جذباتی وابستگی پیدا ہو گئی تھی۔ بمبئی ان کو مجبوراً چھوڑنا

پڑی۔ ان کی الوداعی نظم میں یہ تاثرات بڑے بھرپور انداز میں سموئے گئے ہیں۔

میرے ارمان جواں سال نے دم توڑ دیا
ہوگئے دل کے بھڑکتے ہوئے شعلے خاموش

آج جاتا ہوں تری انجمن ناز سے دور
اپنے سینے میں لیے تیرے سمندر کا خروش

علیم کی ان دنوں کی غزلیں عام طور پر تغزل کی رعنائیوں اور مضمون آفرینیوں کی حامل ہیں۔ ان چند اشعار سے یہ کیفیت ظاہر ہوجائے گی۔

شبنم کے گرے آنسو گھبرا کے صبا نکلی
کلیوں کے چٹکنے سے یہ کیسی صدا نکلی

پہنچے تھے سرِ محفل ہم شکوۂ غم لے کر
دیکھا جو انھیں ہم نے تو دل سے دعا نکلی

گم گشتۂ منزل کی ہے کس کو خبر لیکن
ہر نقش کفِ پا سے اک راہِ وفا نکلی

دیکھا تو بہاروں کے دامن سے گلستاں میں
پھولوں کا کفن نکلا گلچیں کی قبا نکلی

حسرت کے دفینوں سے ارماں کے خزانوں سے
اک تیری تمنا تھی جو بیش بہا نکلی

گذرنا تھا تری منزل سے مجھ کو بے خبر ہوکر
اُلجھ کر رہ گیا لیکن زسرتا پا نظر ہوکر

وہ مستِ حسن ہو کر اور ہم مستِ نظر ہو کر
چلے آئے ہیں اک عالم میں دونوں بے خبر ہو کر
وہ گزرا بے نیازانہ ادا سے بھی جدھر ہو کر
وہاں ذرّے چمکتے ہیں چراغِ رہ گزر ہو کر
جو بس چلتا تو رہ جاتی اسی پر کیف منزل میں
مگر ہے زندگی مجبور پا بندِ سفر ہو کر
حریمِ عشق سے گزرے زمانہ ہو گیا لیکن
وہ ہیں موجود اب بھی رونق دیوار و در ہو کر
رہے گا راز شب بھر ہی یہ ربط شمع پروانہ
مآل عشق کی رسوائیاں ہوں گی سحر ہو کر

انٹر میڈیٹ میں علیم نے سائنس پڑھی تھی۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کم عمری ہی سے چونکہ انھیں ہومیو پیتھی سے علمی اور عملی دلچسپی رہی ہے۔ اس لیے انھوں نے اب سائنسی نقطۂ نظر سے ہومیو پیتھی کو سمجھنے کے لیے ہومیو پیتھی کی چند مستند کتابیں خرید کر گھر پر مطالعہ شروع کیا۔ خداداد ذہانت اور لگاتار مشقت سے انھوں نے اس فن میں ایسی شہرت پائی کہ تین چار سال میں مطب میں ہر روز حاضری دینے والے مریضوں کی تعداد قابل رشک ہو گئی۔ کامیابی کے امکانات بہت روشن تھے اور اقتصادی بدحالی کے بادل بہت کچھ چھنٹ چکے تھے کہ ۱۹۶۰ء میں علیم نے اچانک مطب بند کر کے کلکتہ کی راہ لی۔ بلند ہمتی کا تقاضا تھا کہ چار سال کا ہومیو پیتھی کا باقاعدہ کورس پاس کر کے سند یافتہ ڈاکٹر کے طور پر پریکٹس شروع کی جائے۔ اس تعلیم کے دوران اگرچہ ان کی مالی مشکلات بہت زیادہ بڑھ گئیں لیکن علیم اپنے مقصد میں

کامیاب ہوگیے۔

۱۹۶۴ء سے تادمِ تحریر ڈاکٹر علیم ہومیوپیتھی کی توسیع وترقی میں مصروف ہیں۔ اس وقت وہ بنارس کے نہایت ہی ممتاز ہومیوپیتھ ہیں۔ ہومیوپیتھی کے موضوع پر ان کے بیشتر مضامین رسائل اور اخبارات میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان کی ایک مکمل تصنیف بھی اشاعت کے لیے تیار ہے۔ وہ اپنی ہر کامیابی کے لیے اپنے بھائیوں کی بزرگانہ شفقت کے مرہونِ منت ہیں۔

علیم مسرورؔ کی غزل گوئی کا محرک یادِ محبوب ہے۔ بقول جگر حسنِ یار کی بے ساختہ ادائیں ہیں جو سینۂ شاعر سے اشعار بن بن کر نکلتی ہیں۔ ان کا کمال سخن یہی ہے کہ وہ کسی کی یاد میں سازِ سخن چھیڑ دیں۔ خود کہتے ہیں:

یاد میں ان کی ہم نے غزل چھیڑ دی
اب کمال سخن دیکھتے جایئے

ان کے بیشتر اشعار میں محبت کی آشفتگیوں اور محبوب کی کافرادائیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ زلفِ معنبر کا انتشار اور عاشق کی پریشان نظری خاص طور پر ان کے پیش نظر رہتے ہیں۔ معاملہ بندی انھیں بہت مرغوب ہے۔ اگرچہ یہ سب تجربات انھیں ذاتی حیثیت سے میسر نہیں آئے لیکن تخیلی طور پر انھوں نے اپنے آپ کو ان سب مراحل سے گزارا ہے۔ اس لیے اکثر روایتی سرسری اور سطحی مضامین بھی ان کی آپ بیتی معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں جہاں اس آپ بیتی میں خلوص کی شدت اور جذبے کی تڑپ آگئی ہے کلام بہت موثر ہوگیا ہے۔ اپنی غزل گوئی کا آغاز کرنے سے پہلے بہت دیر تک انھوں نے قدیم جدید غزل گویوں کے دیوان اس نظر سے بغور دیکھے ہیں کہ غزل کا شعر کیوں کر کہا جاتا ہے۔ اس ریاضت نے ان کو محبوب سے باتیں کرنے کا ایک سلیقہ عطا کیا ہے جس میں بانکپن بھی ہے اور ندرت بھی۔

تمھاری بے رخی سے جان و دل پر کیا گزرتی ہے
بتا دوں گا اگر میرے خفا ہونے کا وقت آیا
قریب دل تو آئے وہ مگر کتنا قریب آئے
یہ جانا ہم نے جب ان سے جدا ہونے کا وقت آیا

☆..........☆

ترے تصور رنگیں میں کھو گئے اتنا
کہ جیسے اپنی شب غم میں آج ہم بھی نہیں
بہت قلیل سہی فرصتِ حیات مگر
جو انتظار میں گزرے ترے تو کم بھی نہیں
رستہ ہے فقط لیکن رہ روکا جنوں دیکھو
کیا ہوتا محبت کی منزل جو کہیں ہوتی
تم کو دیکھا ہے کہ تم سا ہی حسیں دیکھا ہے
ہم نے یہ جلوۂ بے تاب کہیں دیکھا ہے
زلف کو شاملِ انوار جبیں دیکھا ہے
میں نے تم کو کبھی تم سے بھی حسیں دیکھا ہے
یہ بھی سچ ہے کہ شناسائی مری ہے تم سے
یہ بھی سچ ہے کہ تمھیں میں نے نہیں دیکھا ہے

☆..........☆

گراں سہی مری معصوم حسرتوں کا لہو
بنی ہے دیکھیے تصویرِ زندگی کیسی

ملے ہو آج لیکن دل کو یہ محسوس ہوتا ہے
تمھاری آرزو پیدا ہوئی تم سے بہت پہلے

وہ آج ہی نہیں پہلے بھی میرے پاس نہ تھا
مگر میں پہلے کبھی اس قدر اداس نہ تھا

اس انجمن میں مزے آ رہے تھے خلوت کے
مرے سوا کوئی ان کا نظر شناس نہ تھا

نگارِ زندگی سے مل چکا ہوں
ہے کچھ تیری ادا کچھ مرا انداز

سرا پا گوش ہوکر سننے والے
میں سر تا پا ہوا جاتا ہوں آواز

ہم کو پسند ہے وہی انداز التفات
اہلِ زمانہ جس کو تری بے رخی کہیں

زندگی اور اس کی رنگارنگ کیفیات کی عکاسی کے لیے جب علیم اچھوتی تشبیہات سے کام لیتے ہیں تو ان کا تغزل لطافتوں سے معمور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مواقع ہیں جہاں غزل میں وہ محبوب کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات پر بھی نگاہ ڈالتے ہیں۔

قافلے زہرہ جمالوں کے گذر جاتے ہیں
دل ہے پامال کسی راہ گذر کی مانند

زندگی چلتی رہی ایک مسافر کی طرح
آرزو ساتھ رہی رختِ سفر کی مانند

عجب آرام دیا بے سرو سامانی نے
راہ رو بیٹھ گئے راہ میں گھر کی مانند

وہ تو رخصت ہوئے امواجِ بہاراں کی طرح
کیفیت رہ گئی بوئے گلِ تر کی مانند

☆............☆

شبنم سے کہہ دو آنسو چپکے سے پونچھ ڈالے
ایسا نہ ہو گلوں کو موقع ملے ہنسی کا

کیا کیا کہا گیا ہے افسانۂ بہاراں
صحنِ چمن میں جب تک منہ بند تھا کلی کا

میں اک مزار ہوں دامن میں گل سمیٹے ہوئے
وہ اک بہار ہیں سامانِ رنگ و بو کے بغیر

میرے خیال میں مندرجہ ذیل غزلیات علیم کی فنکارانہ صلاحیتوں کی بخوبی ترجمانی کرتی ہیں کیوں کہ ان میں زندگی کے بھرپور پس منظر میں علیم خود بھی موجود ہیں اور ان کا محبوب بھی۔

سہانی ہوگئی زلفوں کی شام آہستہ آہستہ
ہوا وہ ماہِ نو ماہِ تمام آہستہ آہستہ

جواب مدعا کچھ بھی نہ تھا لیکن انھیں دیکھا
کبھی ساکت کبھی محوِ خرام آہستہ آہستہ

کسی کی اک نظر سے دیر تک محسوس ہوتا تھا
کہ دنیا ہو رہی ہے غرق جام آہستہ آہستہ

جنوں نے اس قدر صحرا نوردی کی تری خاطر
کہ اب آئیں گے آدابِ قیام آہستہ آہستہ
بہت خوش تھے کسی سے مل کے ہم لیکن خبر کیا تھی
کہ دنیا لے گی اس کا انتقام آہستہ آہستہ
جدائی کی گھڑی وہ سخت منزل تھی محبت کی
جہاں گزری ہے عمرِ تیز گام آہستہ آہستہ
انھیں ہم بدگماں سمجھے مگر اتنا نہ سمجھے تھے
کہ کر بیٹھیں گے یوں ترک کلام آہستہ آہستہ

☆…………☆

تھا سرِ بزم وہ فیضِ نگہ ناز کہ بس
لبِ میکش پہ تھی بس ایک ہی آواز کہ بس
آ گیا مجھ کو بھی کچھ اپنی تباہی کا خیال
اس قدر رویا ہے مل کے مرا ہمراز کہ بس
زندگی میری ہے غیروں کی عنایت ورنہ
ایسے ایسے ہیں مرے ہمدم و دمساز کہ بس
حلقۂ گل کی اسیری بھی گوارہ نہ ہوئی
یوں ہوئی نکہت گل مائل پرواز کہ بس
کس کی انگشت حنائی نے اسے چھیڑا ہے
ہم نفس ایسی تڑپتی ہے رگ ساز کہ بس

کس برہمن کی دعا تھی جو خدا نے سن لی
مل گیا شیخ کو ایسا بتِ طناز کہ بس
اور سامان ہوا عشق کی رسوائی کا
اس قدر تم نے بنا ڈالا اسے راز کہ بس
پھر یہ ہنگامۂ مسرورؔ بپا ہو کہ نہ ہو
اور سنیے گا کوئی نغمۂ شیراز کہ بس

☆............☆

زہے نصیب کہ دن تشنہ کام کے بدلے
نظر اٹھائی ہے ساقی نے جام کے بدلے
پیام اور نہیں کچھ پیام کے بدلے
میری دعائیں تمہارے سلام کے بدلے
نہ جانے شمع کے سینے میں راز کیا ہے جسے
خموشیاں ملیں طرزِ کلام کے بدلے
زمانہ خوب سمجھتا ہے اس کنائے کو
کسی کا نام لو تم میرے نام کے بدلے
تمام دولت قلب و نظر لٹا آئے
کسی کی اک نگہِ ناتمام کے بدلے

☆............☆

ہماری زندگی میں وہ گھڑی بھی ایک بار آئے
کہیں ہم حال دل اُن سے اور ان کو اعتبار نہ آئے

شبِ غم کوئی تو میرا انیس و غمگسار آئے
نہیں کوئی تو کوئی زاہدِ شب زندہ دار آئے

ادھر بیتاب ہم اٹھے ادھر وہ بے قرار آئے
دعا کیجیے محبت کو یہ لمحہ سازگار آئے

نصیبِ آرزو اب ہم نشیں مرگ مسلسل ہے
جو دن تھے زندگی کے ان کی گلیوں میں گذار آئے

یوں ہی میں آ گیا تھا جا رہا ہوں اے چمن والو
سلام شوق کہہ دینا اگر اب کے بہار آئے

کسی کی اک نظر کے واسطے کونین کے مالک
ترا بخشا ہوا دل اور تری دنیا بھی ہار آئے

کسی کو دے کے دل مسرور یوں محفل سے لوٹے ہیں
کسی سے مانگ کر کچھ جیسے کوئی شرم شار آئے

☆............☆

زندگی بھر رہے اس کے غم آشنا
جس صورت سے بھی تھے نہ ہم آشنا

ہر قدم راہ میں جشن منزل رہا
مل گئے چند کانٹے قدم آشنا

عمر بھر کی معیت کے باوصف بھی
زندگی مجھ سے ہے سب سے کم آشنا

ہے تلاش ایک کھوئے ہوئے دوست کی
نام مسرؔور صورت ہے غم آشنا

☆……☆

سمجھ سکا نہ کوئی شرح آرزو کے بغیر
وہ گفتگو جو ہوئی ان سے گفتگو کے بغیر
خوشی کو ڈھونڈ کے یوں تھک کے بیٹھنے والو
غم جہاں بھی ملے گا نہ جستجو کے بغیر
جدا ہوئے تو ہزار آرزو کے ساتھ ہوئے
ملے تھے ان سے مگر ان کی آرزو کے بغیر
عجیب طرزِ عنایت تھی رات ساقی کی
پلائی سب کو سبو سے مجھے سبو کے بغیر
کبھی نصیب نہ جامِ نگاہ ہو مجھ کو
اٹھا لیا ہو جو شیشہ کبھی وضو کے بغیر

☆……☆

چلے بزم دوراں سے جب زہر پی کے
بڑھے حوصلے اور بھی زندگی کے
نگاہِ کرم کی ضرورت نہیں
ہے
ذرا دیکھ لوں بے سہارے بھی جی کے
زمانہ کو دوں کیا کہ دامن میں میرے
فقط چند آنسو ہیں وہ بھی کسی کے

ٹوٹا جو بند ضبط تو آنسو نکل پڑے
اس حادثہ پہ رہ گئے بس مسکرا کے ہم
شایان یک نظر بھی نہ ٹھہرا وہ دل جسے
لائے تھے دو جہاں کی نظر سے بچا کے ہم
کس سے کہیں کہ کون تھا کل شمع انجمن
آئے کہاں سے رات کو دامن جلا کے ہم

ایک خوش فکر غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ علیم ایک صاحب طرز نظم نگار بھی ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر اچھی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں میں دوستوں کے مرثیے بھی ہیں اور عظیم فنکاروں کی شخصیت و عظمت کا بیان بھی۔ جشن آزادی کی ہنگامہ آرائیاں بھی ہیں اور آزادی کے بعد پیدا ہونے والی مایوسیوں اور ناکامیوں کا اظہار بھی۔ علیم اس درجے کے حساس آدمی ہیں کہ اگر انھیں دشمن کے بارے میں بھی کوئی بری خبر سُنا دی جائے تو برسوں تک ان کے ساز دل کے تار مرتعش رہیں گے۔ ان کی یہ جذباتیت مرثیہ لکھتے وقت بہت شدید صورت اختیار کر جاتی ہے لیکن وہ محض جذبات کی رو میں بہتے ہوئے مصرعے نہیں موزوں کرتے جاتے، سپاٹ اور سیدھے سادے پیرایۂ اظہار کو وہ بچکانہ شاعری سمجھتے ہیں اور ان کی نظمیں علامتوں استعاروں لطیف شاعرانہ تشبیہوں اور انوکھے اسلوب کی حامل ہیں۔ بعض کنائے اور اشارے ان میں ایسے بلیغ مل جاتے ہیں جن سے زیر بحث شخصیت یا واقعہ کے تاثر میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ علیم کو تقلید ناپسند ہے، وہ عموماً کسی کے نقش قدم پر چلنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ایک وقت ایسا تھا کہ انھوں نے ڈاکٹر عبدالعلیم کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا۔ ایک دفعہ ان کے ایک مداح نے انھیں تعریف و توصیف سے پُر ایک لمبا خط لکھ بھیجا۔ خط سے معلوم ہوتا تھا کہ مداح ان کو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی والے ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب سمجھ بیٹھا ہے۔ اُسی دن سے انھوں نے اپنے آپ کو علیم مسرؔور لکھنا شروع کر دیا تا کہ ان کی حیثیت اچھی ہو یا بری وہ سب سے الگ ضرور دکھائی دیں۔ یہی انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش علیم کے منظومات میں بھی صاف نظر آتی ہے۔ راقم الحروف کو علیم کی جو نظم سب سے زیادہ پسند ہے اور جس کو مکمل صورت میں یہاں پیش بھی کیا جائے گا۔

اس کا عنوان ہے ''جاوید''۔ یہ ان کے دوست عبدہٗ کے اس معصوم بچے کا نام تھا جو کم عمری میں اچانک مر گیا تھا۔ عبدہٗ نے اپنے بہت سے احباب سے نظمیں لکھوا کر ایک کتابچہ جاوید کی یاد میں شایع کیا تھا۔ علیم کی یہ نظم اس مجموعہ کی تمام نظموں سے مختلف و منفرد ہے۔ یہ رسمی مرثیہ نگاری نہیں بلکہ ایک ایسے فنکار کا فن پارہ ہے جس کا قلم خون کے آنسو بھی روتا ہے تو وہ لعل و جواہر دکھائی دیتے ہیں۔ ایک انگریزی ادیب سے جب اس کے بچے کے انتقال پر پوچھا گیا کہ وہ کہاں گیا ہے تو اس نے فوراً جواب دیا۔ آج وہ تتلیوں کی تلاش میں شاید کہیں دور نکل گیا ہے۔ نظم کے ماحول سے پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی گل بکاؤلی کا وہ منظر بھی یاد آنے لگتا ہے۔ جب بکاؤلی کا پھول گم ہو جاتا ہے اور وہ بیقرار ہو کر زمین و آسمان سے پھول کا حال پوچھتی پھرتی ہے لیکن علیم کی نظم تصنع اور رعایت لفظی کا مرقع نہیں ہے۔ یہ حقیقت شعریت اور رعنایت کا حسین و دلکش امتزاج ہے۔ اب نظم سنیئے:۔

دیکھو کہیں کھو گیا ہے جاوید
کہرام ہے عبدؔہ کے گھر میں
ہے بزم منیر میں اندھیرا
نور آج نہیں کسی نظر میں

بے چین بہت ہے جان ماں کی
طوفان ہے دیدۂ پدر میں
دل ڈھیر ہے خاک آرزو کا
پگھلی ہوئی آگ چشم تر میں
جائے گا کہاں ابھی یہیں تھا
باہر ہے کہیں نہیں جو گھر میں
دیکھو ذرا گلستاں میں جاکر
سودا تھا بہت گلوں کا سر میں
شاید نہ کہیں بھٹک گیا ہو
کھو یا ہوا ہو تتلیوں کے پر میں
پھولوں نے نہ رکھ لیا ہو دل میں
نرگس نہ چھپائے ہو نظر میں
دیکھو ذرا کنج شب میں بڑھ کر
ڈھونڈو ذرا دامنِ سحر میں
بھیجو ذرا کارواں صبا کا
کہسار و دمن میں دشت و در میں
تاروں کو پکار کر خبر کردو
ڈھونڈے اُسے وادئ قمر میں
بادل سے کہو کہ دیں صدائیں
اقصائے فلک میں بحر و بر میں

شبنم نے کہا کہ اک مسافر
دیکھا ہے عدم کی رہ گذر میں
ہے فرق حسیں پہ ابرِ رحمت
فردوس بھی ساتھ ہے سفر میں
معصوم بڑا ہی خوبصورت
تنہا سا فرشتہ مختصر میں
بہتی ہوئی جیسے موج نکہت
جیسے کوئی روشنی سفر میں
جچتی اسے کیا سرائے فانی
قسمت میں تھی جس کی جاودانی

علیم کی ایک اور نظم جو مجھے بہت پسند ہے ''غالبؔ کی شخصیت وعظمت پر ذکر غالبؔ'' کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ یہ نظم اس لحاظ سے بھی اردو ادب میں ایک نادر چیز ہے کہ اس میں غالبؔ کی اپنی زبان میں غالبؔ کی عظمت بیان کی گئی ہے۔ گویا زبان غالبؔ کی ہے اور انداز بیان علیم کا۔ غالبؔ پر اس قسم کی نظم اس سے پہلے میری نظر سے نہیں گذری۔ نظم کا دوسرا بند یوں شروع ہوتا ہے۔

وہ کہ جس کے ہاتھ میں سو پشت سے شمشیر تھی
شاعری جس کے لیے اجداد کی تحقیر تھی
جس کے گھر میں کچھ خطوط یار کچھ تصویر تھی
فکر رسوائی جسے مر کے بھی دامن گیر تھی

آج اس کی عظمتوں کا ذکر یوں محفل میں ہے
سننے والا سوچتا ہے یہ بھی اس کے دل میں ہے

نظم جوں جوں آگے بڑھتی ہے۔ تلمیحات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

کاغذی تھا شوخی تحریر کا جب پیرہن
اس نے بخشا اپنے اندازِ بیاں کا بانکپن
دیکھ کر اس کے لب اعجاز کا طرز سخن
شاعری بیتاب ہوکر بن گئی خود اس کا فن
اک بتِ شیریں ہے پیکر اس کی ہر تحریر کا
یہ کرشمہ ہم نفس لانا ہے جوئے شیر کا
رند ہوکر کی ہے اس نے معرفت کی گفتگو
رکھ لی اس نے آبروئے بادہ و جام وسبو
اس نے اس انداز سے توڑا طلسم ماہ نو
رکھ دیا مٹی کا ساغر جام جم کے روبرو
ہم سے انکار کراماتِ جلی ہوتا نہیں
اور وہ کہتا ہے رندوں میں ولی ہوتا نہیں
لے کے درمان غم ہستی ملی اس سے اجل
وہ ہماری بزم میں ہے آج بھی جیسے تھا کل
اب کہاں مسرورؔ اس کی نیند کا نعم البدل
اس کے شانے پر ہے گیسوے پریشان غزل

شدتیں غم کی بالآخر غم کا درماں ہوگئیں
مشکلیں اتنی پڑیں اس پر کہ آساں ہوگئیں

مرحوم آثر لکھنوی کا مرثیہ علیم نے ''لکھنؤ ہوگیا خاموش خدا خیر کرے'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ نظم فکروفن کی تابندگی سے بڑی روشن ہوگئی ہے۔ پہلے بند میں خلوص فکر ملاحظہ فرمائیے اور دوسرے میں مہارت فن۔

بزم ہستی سے اٹھا کون گریزاں ہوکر
زندگی ڈھونڈتی ہے سربگریباں ہوکر
سوگ میں ڈوب گئی زلف پریشاں ہوکر
رہ گئی شام آودھ شام غریباں ہوکر
دم بخود جس پہ زمانہ تھا وہ لے ٹوٹ گئی
نغمہ آلودہ شیون ہے کہ لے ٹوٹ گئی

شعر ہے پیکر آشفتہ سری کیا کہیے
''بااثر'' کیسی ہوئی ''بے اثری'' کیا کہیے
چاک ہے پیرہن لفظ و بیاں کیا کیجیے
فکر ہے محوِ غم جامہ دری کیا کہیے
چور چور آج ہے آئینہ افکار جمیل
بند ہے کار گہہ شیشہ گری کیا کہیے
بجھ گئی شمع جہاں تاب سرِ بزم حیات
مہ و خورشید کی یہ بدنظری کیا کہیے

اٹھتا جاتا ہے ہر اک اہل ہُنر دنیا سے
اس میں کچھ اپنی بھی ہے بے ہنری کیا کہیے
شمع اردو ہے سیہ پوش خدا خیر کرے
لکھنؤ ہوگیا خاموش خدا خیر کرے

آخری بند میں بڑے موثر اور فنکارانہ انداز میں آثر لکھنوی مرحوم کی عظمت یوں بیان کرتے ہیں۔

بول اے بزم اودھ صدر نشین کون ہے آج؟
اپنے پرکھوں کی شرافت کا امیں کون ہے آج؟
وادی چرخ کے آوارہ تو ملتے ہیں مگر
صاحب رفعت تہذیب زمیں کون ہے آج؟
لکھنؤ آج بھی اک نغمۂ دانش ہی سہی
شہر میں زخمہ زن ساز یقیں کون ہے آج؟
بڑا پُر پیچ ہے گیسو ترا اے شام اودھ
رازدارِ شکن زلف و جبیں کون ہے آج؟
عاشق زار ہزاروں ہیں ترے اے اردو
تیرے دیوانوں میں تجھ سا ہی حسیں کون ہے آج؟
پھر وہی بارگہہ حسن و نظر کھل جائے
مانگ اک ایسی دعا باب اثر کھل جائے

علیم نے میلادالنبیؐ پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ سہرے بھی لکھے ہیں اور رخصتیاں

بھی۔ عام طور پر انھوں نے اپنے افکار کو مسدس کے سانچے میں ڈھالا ہے لیکن یہ مسدس عامیانہ خیالات اور پیش یا افتادہ مطالب کے حامل نہیں۔ انھوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے اپنی انفرادیت اور ندرت پسند طبیعت سے بہت مفید کام لیا ہے۔ اس قسم کی نظمیں محض فرمائشوں کی تعمیل نہیں ہیں۔ ان میں وہ زندگی کے گوناگوں مسائل اور ان کی تشریح بھی بڑے شاعرانہ انداز میں بیان کرتے جاتے ہیں۔ موضوع کتنا ہی پامال ہو علیم اپنے فکر و اسلوب سے اسے تازگی اور رعنائی عطا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اپنے برادرزادہ عبدالباسط کے لیے سہرا لکھتے وقت نظم کے پہلے دو بند یوں قلم بند کرتے ہیں۔

عزیزم تم نے ہر ذرے میں حکمت کا نشاں دیکھا
خدا کی کارسازی کو نہاں دیکھا عیاں دیکھا
طلسم آب و گل دیکھا فسونِ جسم و جاں دیکھا
گلوں کی انجمن دیکھی ستاروں کا جہاں دیکھا
خدا کی حکمتوں کی دیکھ لو اک یہ نشانی بھی
عطا کی زندگانی بھی شریک زندگانی بھی
یہ دنیا ایک صحرا تھی جہاں ہستی تھی آوارہ
تڑپتا تھا دل آدم غم و اندوہ کا مارا
طلب بیزار منزل تھی تجسس تھا تھکا ہارا
نظر بے آسرا ہو کر تھی وقفِ سیل نظارا
ہوا رحمت کا ساماں بارگاہِ عرشِ اعظم سے
ہوا دامان حوّا منسلک دامانِ آدم سے

حفیظ بنارسی کے لیے لکھا ہوا تہنیت نامہ اس قسم کی نظموں میں شاید سب سے حسین ہے۔ یہ سہرا ہے لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ قاری پھولوں کی انجمن میں داخل ہو رہا ہے۔

ہوا جو گل کہ آمد عروسِ نو بہار ہے
جنوں عجیب شوق پیرہن سے ہمکنار ہے
جبیں پہ گرِ در نہیں ہے تاج زرنگار ہے
گلے میں چاک آستیں نہیں گلوں کا ہار ہے
جو کوچۂ حبیب میں جنوں لباس نو میں ہے
خرد بجائے سنگ گل لیے ہوئے جلو میں ہے
طلب کی وسعت تمام آج اک نظر میں ہے
خیال کا حسیں سماں وجود معتبر میں ہے
محبت آج زندگی کی ایسی رہ گذر میں ہے
جہاں پہ منزلِ وفا لباس ہم سفر میں ہے
رُکے تو ہے بہشتِ آرزو اسی مقام پر
بڑھے قدم تو جنت وفا ہے گام گام پر

علیم کے سیاسی اور سماجی تصورات بہت واضح ہیں۔ حب وطن ان کا ایمان ہے۔ ''آزادی'' کے عنوان سے بہت سی نظمیں ان کے اسٹاک میں موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آزادی کے ایک ایک لمحے کو غلامی کی حیات جاوداں پر ترجیح دیتے ہیں۔ انھوں نے ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو لکھا تھا۔

مہرِ آزادی مشرق ہوا مشرق سے عیاں
مدتوں سینۂ گیتی میں جو تھا راز نہاں

بارش آب بقا ہوگئی بیماروں پر
زندگی دوڑ گئی موت کے رخساروں پر

لیکن آزادی کے بعد بھی جب پرانے اور فرسودہ نظام کا ڈھانچہ نہ بدلا تو علیم نے اپنا لہجہ بدل ڈالا۔

ابھی ہے زینتِ محمل عروس آزادی
ابھی تو اس کی تجلی برنگ عام نہیں

ابھی تو بطنِ خزاں سے بہار پیدا ہوئی
ابھی نسیم چمن مائل خرام نہیں

ابھی تو دیر سے چشم حرم گریزاں ہے
نگاہِ دیر میں کعبے کا احترام نہیں

ابھی تو خون میں ڈوبے ہوے ہیں میخانے
ابھی تو بادۂ رنگیں فروغِ جام نہیں

لیکن علیم اس ماحول سے مایوس نہیں ہوجاتے وہ مسلسل جدوجہد کے حامی اور قومی یکجہتی کے علمبردار ہیں۔

بڑھائے جا یوں ہی طوفاں شکن سفینوں کو
جھکا نہ پیش حوادث کبھی جبینوں کو
شریک جام طرب کر لے ہم نشینوں کو
‘‘انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آب گینوں کو’’

☆..........☆

وطن کا جشن بہاراں تجھے مبارک ہو
دل و نظر میں چراغاں تجھے مبارک ہو

☆............☆

علیم حضرت مسلم الحریری بنارسی کو شاعری کے فن میں اپنا رہنما تسلیم کرتے ہیں۔ بنارس میں سلسلۂ مصحفی کے یہ تنہا شاعر ہیں جنھوں نے مصحفؔی کے فیضان کو تسلیم کیا ہے۔

مسرورؔ شاعری تھی کب بس کی بات میرے
سینہ بہ سینہ پہنچا فیضان مصحفؔی کا

ادب کی قدیم اقدار کے ساتھ ساتھ انھوں نے جدید تحریکات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری گذشتہ ادبی روایات کی خوبیوں کا بھی احترام کرتی ہے اور جدید نظریات کی صالح اقدار کو بھی پیش نظر رکھتی ہے۔

علیم مسرورؔ کا قدیم سے جدید تک کا سفر کس مرحلے تک پہنچا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے ان کی ایک نظم ''آواز'' پیش کی جارہی ہے۔

نیم شب برف کی مانند پگھلتی ہوئی رات
کس نے فریاد کی؛
کون ہے جس نے زنجیر عدالت کھینچی
ما بدولت ہیں جہانگیر جہانِ دل کے
توڑ کے جامِ شراب سرجوش
چھوڑ کے نور جہاں کا آغوش
سرد و یخ بستہ سی میزاں عدالت کے قریب
ظلم کی دادرسی کی خاطر
منتظر ہیں۔ وہی فریاد کی لے
ماں بدولت، میں جہاں گیر جہانِ دل کے
جان بیکس کو اماں دیتے ہیں
ظل سبحانی ہیں مائل بہ کرم
نام لو ظلم کیا ہے کس نے
وہ جہاں گیر ہو یا نور جہاں ہو کوئی
کوئی آواز نہیں
سینۂ شب میں کوئی راز نہیں
کس نے فریاد کی
کون مظلوم ہوا فریادی

جس سے گونج اٹھی شبستان طرب   کوئی آواز نہیں
چھیڑ دے پھر دل خوں گشتہ کوئی   کوئی مظلوم نہیں
روح انصاف کی پاکیزہ غذا ہے، ہے یہی لے   اے جہاں گیر جہان دل کے
رقص کرتی ہے اسی نغمہ پر رقاصۂ عدل   تجھے معلوم نہیں
آہ و فریاد کرو   زیر پشمینۂ گیسوے دراز
سینہ و قلب و جگر چاک کرو   دل کی آرام گہہ گرم و گداز
ہاں کہو کس نے ستم ڈھایا ہے   منتظر ہے کہ ترا شعلۂ لب
کس کے ڈر سے لبِ مظلوم پہ ہے مہرِ سکوت   گرم و تر کر دے دہکتے ہوئے رخساروں کو

علیم قطعات اور رباعیات میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دو مونے ملاحظہ ہوں۔

قطعہ

جس سے زندہ تھیں امنگیں آرزوئیں حسرتیں
وہ شراب روح پرور دل کے ساغر میں نہیں
موت سے کہہ دو جو دستک دے رہی ہے دیر سے
زندگی اک عمر گذری ہے کہ اس گھر میں نہیں

رباعی

تعمیر کی حسرت میں رہا خانہ خراب
افسانہ مستی ہے کہ تاریخ شباب
اس رات دسمبر کی کڑی سردی میں
پہلو میں مرے کون تھا دیکھو تو کتاب

علیم کی شاعری کا ایک افسوسناک پہلو بھی ہے۔ انھیں قدرت سے تڑپ ملی تھی لیکن انھوں نے اس سے مسلسل کام نہیں لیا، لگاتار برسوں تک انھوں نے عروس سخن سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ انھوں نے اس چنگاری کے تحفظ کی مکمل کوشش نہیں کی جو شعلہ بن کے افسردہ دنوں کو گرما سکتی تھی۔ ان کی طبی مصروفیات بہت زرخیز سہی لیکن شاعری کو بھی ان کی ضرورت ہے۔

بنارس میں شعروادب سے ذوق رکھنے والے نثر نگاری کی طرف زیادہ مائل نہیں۔ علیم مسرور کو نثر نگاری سے خاص محبت رہی ہے۔ ان کی شعری تخلیقات کی طرح ان کی نثری تخلیقات بھی ضایع ہو چکی ہیں جن میں افسانے، ڈرامے نامکمل ناول اور تنقیدی مضامین شامل تھے۔ کچھ افسانے رسالوں میں محفوظ ملیں گے۔ افسانہ نگاری کے شوق نے انھیں ازسرنو افسانہ لکھنے پر مجبور کردیا ہے۔ ہمیں ان سے بہترین شعری اور نثری تخلیقات کی توقع رکھنی چاہیے۔

مسلم الحریری

حضرت مسلم الحریری منشی غنیؔ بنارسی مرحوم کے لائق فرزند اور اگلے وقتوں کی قابل احترام یادگار ہیں۔ شاعری کا ذوق گویا ورثے میں پایا ہے۔ ان کا خاص میدان فکر غزل گوئی ہے لیکن جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی فرما کر اپنی قادر الکلامی کا ثبوت بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ مسلم صاحب نے قصاید رباعیات اور نعتیں بھی لکھی ہیں اور قومی نظمیں بھی۔ ان کا قابل ذکر کارنامہ مثنوی اسلام نامہ ہے جو انھوں نے حفیظؔ جالندھری کے شاہنامۂ اسلام کی اشاعت کے بعد لکھی ہے۔ مسلم صاحب حفیظؔ جالندھری سے اس سلسلہ میں ملے تھے۔ ان کے خیال میں حفیظؔ صاحب سے اکثر مقامات پر سہو ہو گیا ہے۔ چنانچہ کئی جگہ انبیا کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اسی چیز کی اصلاح کے خیال سے انھوں نے اسلام نامہ منظوم کیا۔ پہلا حصہ آثار امم المعروف بہ ''اسلام نامہ'' ۱۹۶۳ء میں چھپ گیا ہے۔ مسلم صاحب نے رباعیات خیامؔ کا منظوم ترجمہ بھی مرتب فرمایا ہے اور غالبؔ کی مشہور مثنوی ''چراغ دیر'' کو بھی اردو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔ آخر الذکر نظم مارچ ۱۹۶۸ء میں شامِ غالبؔ کی تقریب پر ''غالبؔ جشن صد سالہ کمیٹی بنارس'' کے زیر اہتمام شایع ہو چکی ہے۔ ان کے غیر مطبوعہ کلام کی ضخامت، ان کی پرگوئی اور زود گوئی کا ثبوت ہے۔ اس فہرست میں ان کی طبع زاد رباعیات کا مجموعہ، غزلوں اور نظموں کا مجموعہ، مجموعہ نعت ومناقب اور اسلام نامہ حصہ دوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مسلم صاحب ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے، ان کی زندگی کا اکثر و بیشتر حصہ اپنے وطن بنارس ہی میں گذرا ہے۔ ان کی زندگی عام طور پر جدید دور کے ہنگاموں سے دور گوشۂ عافیت میں بسر ہوئی ہے۔ مشاعروں میں وہ ضرور تشریف فرماتے رہے ہیں لیکن ۱۹۳۶ء سے پہلے اور بعد کی لسانی اور ادبی تحریکوں نے اُن کو کسی پہلو سے متاثر نہیں کیا ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے جدید شعرا سے نظریاتی اختلاف کی بنا پر ایک آدھ نظم تحریر فرمائی ہے لیکن ان کی یہ کوشش ان کے کسی مستقل نظریہ کی وضاحت نہیں کرتی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ مسلم صاحب کسی خاص قدیم یا جدید مکتب فکر سے وابستہ نہیں رہے۔

انھوں نے اپنے فطری رجحان کے پیش نظر شعر و شاعری کو ایک سرگرمی کے طور پر اپنایا ہے۔ ان کا ذریعہ معاش ریشمی کپڑوں کی نقاشی ہے۔ ریشمی ساڑیوں کے نئے نئے ڈیزائن پیش کرنے میں وہ ایک ماہر مصور کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔

مسلم صاحب نے اپنا کلام اپنے والد مرحوم منشی غنیؔ کو دکھایا۔ رومانی شاعری ایسے ماحول میں پروان نہیں چڑھ سکتی جہاں لب و لہجے اور اظہار و بیان کے پیرایوں کو ہر وقت بزرگوں کی نظر سے گذرنا پڑے۔ مسلم صاحب کی غزل عرفانی، اخلاقی اور صوفیانہ نکات و رموز کو تو پا گئی لیکن حسن و عشق کی سرمستیوں اور کافرادائیوں کی کیفیت زیر لب سرگوشیوں میں ڈھل کر رہ گئی۔ ان کے تغزل کا اب یہی مستقل مزاج ہے۔

سچ بتا حسنِ ازل یہ کون سا دستور ہے
جس قدر نزدیک ہے اتنا ہی مجھ سے دور ہے
کیا خبر اے یار تو ظاہر ہے یا مستور ہے
ہاں مگر جلوے سے تیرے دو جہاں معمور ہے

تو نے کرلیں جس سے دو باتیں وہ ہے گویا کلیم
جل گیا جو دل تجلی دیکھ کر وہ طور ہے

دے دیا درس خموشی تیرے پاس راز نے
ورنہ فریاد و فغاں سے بھی کوئی مجبور ہے

شامِ غم ہم شمع کو رکھے ہوئے ہیں سامنے
اس تصور سے کہ اس میں بھی کسی کا نور ہے

بے سبب مسلم پشیمانی نہیں ہے حشر میں
جانتے ہیں خوب ہم رحمت کا جو دستور ہے

☆..........☆

نظر حقائقِ غم سے ہٹا بھی لیتے ہیں
تری خوشی کے لیے مسکرا بھی لیتے ہیں

دیار عشق میں ہے اک مقام ایسا بھی
جہاں امید کی شمعیں بجھا بھی لیتے ہیں

ہنسی ہے وہ بھی کہ ہوتا ہے فاش رازِ نہاں
ہنسی میں راز محبت چھپا بھی لیتے ہیں

یہ مانا حسن پہ لاکھوں حجاب ہیں لیکن
کبھی کبھی وہ یہ پردے اٹھا بھی لیتے ہیں

شب فراق میں آتی نہیں ہنسی مسلم
فرارِ غم کے لیے مسکرا بھی لیتے ہیں

☆..........☆

یہی ہم نے دیکھا یہی ہم نے جانا
محبت حقیقت محبت فسانا

گری اس طرح آج بجلی چمن میں
بہت یاد آیا ترا مسکرانا

بہت یاد آتا ہوں میں تم کو لیکن
اگر ہوسکے تو مجھے بھول جانا

☆..........☆

خوشی میں بھی مقدر کی پریشانی نہیں جاتی
بہاروں میں بھی گل کی چاک دامانی نہیں جاتی

زمانہ ہوگیا گزرے ہوئے ان کو گلستاں سے
ابھی تک دیدۂ نرگس کی حیرانی نہیں جاتی

بتا اے راحتِ جاں کیا اسی کا نام الفت ہے
کہ تو ہے دل میں اور دل کی پریشانی نہیں جاتی

پھرا کرتے ہیں وہ دل میں نگاہوں میں تصور میں
مگر میرے دلِ ویراں کی ویرانی نہیں جاتی

برستی ہے نگاہوں سے ٹپکتی ہے اداؤں سے
محبت کون کہتا ہے کہ پہچانی نہیں جاتی

اسی سے حضرتِ مسلم بھی کفر عشق کر بیٹھے
یہ ایسا کفر ہے جس سے مسلمانی نہیں جاتی

☆..........☆

مرنے کے لیے جو مر رہے ہیں سامانِ حیات کر رہے ہیں
دنیا میں یہی تو کر رہے ہیں جینے کی ہوس میں مر رہے ہیں
وہ دن گئے ڈھونڈتے تھے تم کو اب اپنی تلاش کر رہے ہیں
دشمن کا خطرہ نہیں ہے ہم کو یاروں کے کرم سے ڈر رہے ہیں
ہم دام حیات میں الجھ کر اللہ کو یاد کر رہے ہیں
کوئی بھی نہیں شریک منزل کس راہ سے ہم گزر رہے ہیں
وہ ہیں کہ ملے ہوئے ہیں ہم سے ہم ہیں کہ تلاش کر رہے ہیں
مسلمؔ ہیں وہی تو واقف راز
جو آپ سے بے خبر رہے ہیں

☆……☆

مسلمؔ صاحب نے اردو ادب کے منظوم شاہکاروں کے جواب بھی لکھے ہیں۔ ساؔحر لدھیانوی کی نظم ''تاج محل'' رومانی اور اشتراکی شاعری کے سنگم پر تعمیر کردہ وہ حسین تاج محل ہے جس کی آب و تاب ہر نوجوان کے ذہن کو جگمگا دیتی ہے۔ ساؔحر لدھیانوی اسی ایک نظم کے سہارے اُردو زبان کی حیات تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ مسلمؔ صاحب نے جو نظم ساؔحر کے جواب میں لکھی ہے اس کا عنوان ہے ''ساؔحر کے تاج محل کو دیکھ کر''۔ تاج محل کو دیکھ کر ساؔحر کے دل میں جو جذبات پیدا ہوئے وہ منظرِ عام پر آ کر قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ ساؔحر کے تاج محل کو دیکھ کر مسلمؔ صاحب کا عکس العمل یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

تاج تیرے لیے اک مظہرِ الفت نہ سہی
تجھ کو اس وادیٔ رنگیں سے عقیدت نہ سہی

جس میں کچھ وزن ،، وہ بات کہا کر اے دوست
بزمِ اُلفت میں حریۓ ل کا گزر کیا معنی؟
ثبت جس راہ پہ ہوں عصمت مریم کے نشاں
اس پہ بھٹکی ہوئی ۔ جوں کا سفر کیا معنی؟
غیر محرم پہ نہ بھولے سے پڑی جس کی نظر
اس کی عظمت کے نشانوں کو تو دیکھا ہو،
نت نئی شمع جہاں خاک ہوا کرتی ہے
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا
ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
پھر بھی اے دوست برابر نہیں سب کے جذبے
آج تک اڑتے ہیں اربابِ وفا کے پرچشم
ہیر رانجھا کی طرح سینکڑوں گو مفلس تھے
یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
حل کیا کرتے تھے مزدوروں کی روٹی کا سوال
عظمت ہند کی رگ رگ میں ہے خون مزدور
یوں ہی بخشا نہیں قدرت نے اسے تاجِ کمال
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکل جمیل
زر و گوہر کے انھیں بخشے گئے تھے انبار
اپنے پیاروں کے مقابر پہ جلاتے قندیل
ان کے دل میں بھی اگر ہوتے محبت کے شرار

محفل تاج میں آدیدۂ بینا لے کر
جس کا معمار بھی طاق اور محبت بھی ہے طاق
عشق آوارہ و رسوا کا سہارا لے کر
تونے خود اپنی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میرے محبوب کہیں اور ملاکر مجھ سے
خود یہ پیغام ہی پیغام ہوس کاری ہے
کوئی نقادِ محبت نہ کہیں یہ کہہ دے
اے فسوں کار محبت تری بازاری ہے
ایک خود کام محبت کی محبت کے لیے
کردیا پیکر عصمت کو تماشا تونے
خودتو چاک اپنے نہ دامانِ ندامت کے سیے
اک شہنشاہ پہ الزام تراشا تونے
جس میں کچھ وزن ہووہ بات کہا کرائے دوست

آثارِ امم عرف اسلام نامہ جلد اول میں مسلم صاحب نے تخلیق آدم سے تشریع اذان تک کے واقعات نظم میں پیش کیے ہیں۔ خلوص اور عقیدت کے جذبات ہر جگہ کارفرما نظر آتے ہیں جس سے انداز بیان اکثر بہت موثر ہوگیا ہے۔ مصنف کی تحقیقی کاوش اور عرق ریزی نے حالات اور واقعات کی صحت کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس کتاب کی جتنی قدر ہونا چاہیے تھی اتنی نہیں ہوئی، اور اس کا سبب کچھ تو حفیظؔ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کی شہرت ہے اور کچھ مسلم صاحب کی اپنی گمنامی۔ ''یار غار'' کا واقعہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

اِدھر صدیق کی آنکھیں تھیں روشن روئے روشن سے
اُدھر اک سانپ نے سر کو نکالا ایک روزن سے
ادھر بن کر قضا در پیش تھا خطرہ ہلاکت کا
ادب ملحوظِ خاطر تھا ادھر فخرِ رسالت کا
جگا کر شاہِ دیں کو سانپ کو وہ مار سکتے تھے
مگر وہ بازیٔ عشق و وفا کب ہار سکتے تھے
نظارہ دیکھنے والے کریں اب جاں نثاری کا
کہ مجبوری نہ تھی یہ اُن کا فعل اختیاری کا
ہلاکت کو گوارہ کر لیا صدیق اکبر نے
وہیں پائے صداقت رکھ دیا صدیق اکبر نے
کہیں سے جب نکلنے کا نہ رستہ سانپ نے پایا
تو اپنی فطرتِ ایذا رسانی پر اُتر آیا
رفیق غار کو غصے میں آ کر ڈس لیا اس نے
یہ گویا آخری حملہ نکلنے کو کیا اُس نے
اٹھایا ہی نہیں لیکن قدم صدیق نے اپنا
ادا کرنا تھا حق اُن کو محمدؐ کی رفاقت کا
سرایت کر رہا تھا زہر موذی تیز ہو ہو کر
غضب کا رنگ لایا خون میں آمیز ہو ہو کر
مگر پھر بھی نہ لغزش کی ذرا بھی فخر اُمت نے
انھیں ثابت قدم رکھا رسالت کی محبت نے

نہ ہلتے تھے مبادا نیند میں شہ کی خلل آئے
مگر تکلیف کی شدت یہ تھی آنسو نکل آئے
وہ آنسو پونچھتے جاتے تھے لیکن اپنے ہاتھوں سے
کہیں ایسا نہ ہو روئے شہ کونین پر ٹپکے
مگر اک قطرہ آخر آ رہا روئے مقدس پر
بظاہر جو تھے محو خواب جاگ اُٹھے وہ پیغمبرؐ
لعاب اپنے دہن سے لے کے حضرت کا لگا دینا
اسی دم جاں نثارِ مصطفےٰ کا مسکرا دینا
یہاں صدیق نے کچھ اس ادا سے جاں نثاری کی
مثل مشہور ہے دنیا میں اب تک یار غاری کی

مسلم صاحب کا خاندان بنارس میں اپنی ادبی سرگرمیوں کے لیے مشہور ہے۔ ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر علیم مسرورؔ، پروفیسر حفیظؔ بنارسی اور حضرت جوہرؔ صدیقی ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر ہیں، اگرچہ ان شاگردوں کی شاعری کا اسلوب اب اپنے استاد سے بالکل مختلف ہے اور اب اسے قدیم وجدید کا فرق کہنا چاہیے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم صاحب نے بنارس کے ادبی ماحول کو نکھارنے، سنوارنے اور آراستہ پیراستہ کرنے میں بڑا مفید کام انجام دیا ہے اگر وہ اپنے آپ کو محدود نہ کر لیتے تو شاید خود ان کی اپنی شاعری بھی روحِ عصر کو جذب کر لینے کی صلاحیت پیدا کر لیتی۔

جوؔہر صدیقی

جوؔہر صاحب کے کلام کا جائزہ لیتے وقت یہ بات عام طور پر محسوس ہوتی ہے کہ اس شاعر کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے اور یہ کہ اس بہت کچھ کو وہ بہت اچھے اور اکثر انوکھے انداز میں کہنے کا سلیقہ بھی رکھتا ہے۔ جوؔہر نے عام باتوں کو بھی عام لہجے میں نہیں کہا۔ ان کے تغزل کی امتیازی خصوصیت مضمون و اسلوب کا نیا پن ہے۔ نئی نئی زمینوں میں نئے نئے قوافی کو وہ اپنے مشاہدات و خیالات کا ترجمان بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کی مشکل پسندی اُن کے شاعرانہ ماحول کو مبہم بھی بنا دیتی ہے، ایسے مقامات پر پڑھنے والے کو اردو کے کلاسکی شاعر مومنؔ کا خیال آتا ہے اور وہ یہ سوچ کر رہ جاتا ہے کہ ادب میں بلند اقدار کی تخلیق میں ابہام بھی ایک ناگزیر مرحلہ ہے۔ سرسری اور سطحی باتوں میں ابہام کا سوال بہت کم پیدا ہوتا ہے۔

جوؔہر صدیقی کا کلام مقدار اور معیار دونوں لحاظ سے خوب ہے۔ اُن کا بہت سا کلام ان کی بے نیازی نے تلف کر دیا ہے۔ اس وقت میرے سامنے اُن کا کلام سات مختلف بیاضوں اور متفرق کاغذات میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ ان کا گذشتہ دس سال کا سرمایہ ہے۔ اپنی ولادت ۱۹۲۸ء سے آج تک وہ اتنے مختلف و متضاد حالات سے گذرے ہیں کہ خود اپنے آپ کو ساتھ لے کر چلنا دشوار نظر آتا تھا۔ اس سفر میں ہر قدم پر اپنے سرمایۂ افکار کو سمیٹنے کی انھوں نے پرواہ بھی نہیں کی، ان کے ماحول نے شاید ان باتوں کی فرصت بھی نہیں دی۔ جوؔہر میرے خیال میں ایک

باغی ہیں۔ اپنے ماحول سے بھی انھوں نے بغاوت کی ہے اور بنارس کی ادبی روایات سے بھی۔ اس بغاوت کا سبب ابتدائی دور میں غالبًا ان کے دوستوں اور عزیزوں کی دنیاداری اور خود پرستی ہے۔ انھوں نے جن کو اپنایا ان کے لیے سراپا خلوص بن گئے لیکن جب ان اپنوں نے آنکھیں پھیر لیں اور انہی کو نقصان پہنچایا تو جوہر سارے ماحوک سے منحرف ہو گئے۔ اس کیفیت کا عکس ان کے ان اشعار میں موجود ہے۔

غم لے کے مسرت کا سماں ہم نے بنایا
اشکوں سے ستاروں کا جہاں ہم نے بنایا
ہم خوش ہیں کہ آمادہ چشمک ہیں ہمیں سے
وہ ذرے جنھیں کہکشاں ہم نے بنایا
بے قدر بنا رکھا تھا اغیار نے جس کو
اس بارِ امانت کو گراں ہم نے بنایا
نظروں میں تو بت خانے کا بتخانہ تھا لیکن
دل دے کے تمھیں رشک بتاں ہم نے بنایا
لو آگ لگا بیٹھے ہمارے ہی جگر میں
محفل میں جنھیں شعلہ بیاں ہم نے بنایا
گُفتار کا میدان تمہارا سہی لیکن
الفاظ کو شایانِ زباں ہم نے بنایا
آداب نئے ہم نے دیے راہ روی کو
ٹھوکر کو بھی اک سنگ نشاں ہم نے بنایا

جوہرؔ کے والد جناب عبدالستار اور دادا حاجی عبدالحمید شعروشاعری سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، گھر کا ماحول جوہرؔ کی تخلیقی صلاحیتوں کے لیے سازگار تھا۔ مسلم الحریری صاحب کے تلمذ سے انہیں تشویق حاصل ہوئی لیکن شعری شعور کی وسعت انھوں نے اپنے ذاتی مطالعہ سے پیدا کی۔ فارسی میں کامل پاس کرنے کے علاوہ انھوں نے آتشؔ، مومنؔ اور غالبؔ کو غور سے پڑھا۔ عرفیؔ، حافظؔ اور نظیریؔ برسوں ان کے ساتھ رہے۔ عرفیؔ کے فلسفیانہ طرز فکر نے انھیں خاص طور پر متاثر کیا۔ جدید شعرا میں وہ خود جوشؔ اور جگرؔ کی اہمیت کو تسلیم کرتے آئے ہیں۔ جوشؔ کو غالباً ان کی قادرالکلامی کی وجہ سے اور جگرؔ کو شاید ان کی متحرک اور زندہ وتابندہ رومانیت کے سبب جوہرؔ نے پسند کیا ہے۔ ان کی غزلیات ومنظومات میں کہیں کہیں اس پسند کی چھاپ بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ان کی فارسی دانی نے ان کی شاعرانہ فضا کو کبھی کبھی سنجیدہ بھی بنادیا ہے اور دشوار بھی۔

جوہرؔ کی ابتدائی زندگی مذہبی ماحول ک دار میں گذری۔ ان کا شاعرانہ مزاج اپنوں اور بیگانوں کی غرض پرستی کے ساتھ ساتھ اپن پابندیوں کے بوجھ تلے پس کے رہ گیا ہوتا لیکن ان کی شدتِ احساس نے ان کے لئے فرار کا ایک پرکیف راستہ تجویز کردیا۔ جہاں پہونچ کر انھوں نے اپنے گردوپیش کا جائزہ بھی لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ:-

جو مسلسل ہو غم طراز سہی
وہ نوائے رباب اچھی ہے
کوئی تبدیلی مزاج نہیں
دوستوں سے شراب اچھی ہے

ایک اور جگہ وضاحت سے کہا ہے۔

بزم حرم سے اُٹھ کر کوئے بتاں میں آئے
پائی نہ جب محبت یار ان پارسا میں
اک محشرِ طلب تھا یا بزم خوش نگاہاں
بے آسرا تھے آنسو دامانِ آشنا میں
آخر خلوصِ غم نے لی راہ بادہ خانہ
تا جوش کیف ابھرے طوفان مدعا میں
اب ہم ہیں اور دل کا خلوت کدہ ہے جوؔہر
اے کاش یوں ہی ہوتا دورانِ ابتدا میں

لیکن اس انحراف نے جوؔہر کو شیخ کا مدِ مقابل نہیں بنا دیا۔ اُن کے کلام میں رند و شیخ کے عامیانہ مضامین کہیں نہ ملیں گے۔ واعظ اور شیخ سے انھیں کوئی گلہ نہیں، کہیں ایک آدھ شعر ملے گا بھی تو اس انداز کا۔

ذرا کالی گھٹائیں جھوم کر آنے تو دو واعظ
سرِ میخانہ دستارِ فضیلت ہم بھی دیکھیں گے

جوؔہر کے تغزل کی اساس صرف تخیل پر نہیں، ان کی غزل میں رومانی اور جمالیاتی عناصر بکثرت جھلکتے ہیں۔ ان کے دل کی دھڑکنیں اور محبوب کے حُسن کی لطافتیں ان کی غزل میں سوز و گداز اور بانکپن پیدا کر دیتی ہے لیکن اکثر حالات و واقعات کا عکس بھی ان کے غزلیہ اشعار میں اس طرح دکھائی دیتا ہے کہ علامات اور استعاروں کے شعری ملبوسات کے پیچھے جوؔہر کا سیاسی اور سماجی شعور قاری کے لیے کوئی انجانی چیز نہیں رہ جاتی، ایسے مقامات پر ان کی غزل ایک غزل نما نظم کا روپ دھار لیتی ہے اور وہ علاماتی اسلوب سے کام لے کر آگے بڑھتے

ہیں۔ یہاں برق و نشیمن ، لالہ و گل، بہار و خزاں مختلف اقدار و کیفیات کے نمائندے بن جاتے ہیں۔

تعمیر چمن کے پردے میں تخریب بہاراں ہے کہ نہیں
ہر لالہ و گل کے پہلو میں اک آتش پنہاں ہے کہ نہیں
پھولوں سے محبت کے معنی کیا خار سے نفرت ہوتے ہیں
اے پھول کے خالق تو ہی بتا کانٹوں کا گلستاں ہے کہ نہیں
اس لفظ رہائی پر رقصاں اربابِ گلستاں ہیں تو مگر
تنظیم نشیمن میں شامل کیفیت زنداں ہے کہ نہیں
سچ ہے کہ نہیں ہیں گلشن میں اب برق و نشیمن کے جھگڑے
پھر بھی ترے قبضے سے باہر تزئین گلستاں ہے کہ نہیں
مانا کہ جمودِ گلشن کو تم امن بتایا کرتے ہو
لیکن یہ سکوتِ لالہ و گل تمہید بیاناں ہے کہ نہیں

☆............☆

فقط اسی کے لیے زمانہ حقیقتاً سازگار ہوگا
قدم قدم پر جو زندگی میں حریف لیل و نہار ہوگا
کبھی وہ منزل بھی آئے گی جب بھٹکتا پھرتا غبار ہوگا
وہ قافلہ جو کہ رہبروں کے کرم کا امیدوار ہوگا
نظام نو کا نظام تو ہی خود ایک دن سوگوار ہوگا
کسے خبر تھی کہ یوں بھی برہم مزاج لیل و نہار ہوگا

خزاں کے جانے پہ بس نظر تھی کسی کو اس کی کہاں خبر تھی
بہار کے بعد بھی گلستاں میں انتظارِ بہار ہوگا
یہی سمجھتے تھے غنچہ و گل کہ اہل گلشن کا اب ہے گلشن
خبر نہ تھی باغباں کسی دن بہ شکل پروردگار ہوگا
نہ باغباں خون دے گا اپنا تو کیسے گلشن میں کھل سکیں گے
وہ پھول جن پر چمن کی شادابیوں کا دارو مدار ہوگا
قدم قدم پر جہاں ہزاروں قیامتیں سر اٹھا رہی ہوں
جناب جوہر بھلا وہاں کیا شمارِ روزِ شمار ہوگا

☆..........☆

ڈھونڈتے ہیں جام و مے پیر مغاں بننے کے بعد
جستجو عنوان کی ہے داستاں بننے کے بعد
رہزنی سیکھی تھی یوں تو پاسباں بننے کے بعد
پختگی آئی امیرِ کارواں بننے کے بعد
لیجیے بنیاد زنداں کے لیے کام آگئے
چند تنکے بچ رہے تھے آشیاں بننے کے بعد
کچھ تو کہیے کس طرح ارباب تنظیم چمن
زیست بن جائیں گے مرگِ ناگہاں بننے کے بعد
مصلحت ہے آج ان کو پھونک لینے دو چمن
پھول بھی برسائیں گے برق تپاں بننے کے بعد

☆..........☆

کیا تجھ کو بتائیں کیا کیا ہم اے فتنۂ دوراں دیکھ چکے
تنظیم گلستاں دیکھیں گے تقسیم گلستاں دیکھ چکے

اپنے ہی تبسم پر آخر پھولوں کو پشیماں دیکھ چکے
دیکھیں گے خزاں کے تیور بھی انداز بہاراں دیکھ چکے

یاران نشیمن سمجھے ہیں مفہوم یہی بیداری کا
آرام کی نیند اب سوئیں گے بس خواب پریشاں دیکھ چکے

یا بزم چمن کی تاریکی ہے ابر بہاراں کا سایہ
یا صبح بہاراں سے پہلے ہم شام بہاراں دیکھ چکے

اے کاش کبھی مالی نے بھی اک شمع فروزاں کی ہوتی
گلشن میں طفیل برق تو ہم سو بار چراغاں دیکھ چکے

ملاح کی کمزوری کے سوا طوفان کی طاقت کچھ بھی نہیں
اڑ جاؤ تو کترا جاتا ہے ہم ہمت طوفان دیکھ چکے

☆..........☆

جوہر کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں رہے لیکن سیاسی اور سماجی مسائل سے انھیں عملی دلچسپی رہی ہے، وہ اعتدال کی حد تک اشتراکی نظریات سے متفق رہے ہیں۔ دولت کی عادلانہ اور مساویانہ تقسیم کے وہ حامی ہیں اور چاہتے ہیں کہ پھولوں کے ساتھ کانٹوں کو بھی گلستاں میں رہنے کا برابر کا حق نصیب ہو۔ مقامی کارپوریشن کے انتخابات میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں کسی ایک فرقے یا مذہب کے نام پر جمہوریت کی کامیابی میں انھیں بھی شک ہے۔ اپنے سیاسی نظریات کو انھوں نے اپنی شاعری میں جابجا رمز و کنائے میں پیش کیا ہے۔

بلا سے لٹ گئی دنیا مری لیکن ستم یہ ہے
یہاں سب کچھ بعنوان کرم چھینا گیا مجھ سے
کوئی کیا مجھ سے زائد واقفِ آداب محفل ہے
زباں کاٹی گئی میری قلم چھینا گیا مجھ سے

☆..........☆

قصرِ سرمایہ کے چراغوں کی روشنی بانٹ دو غریبوں میں
یوم جمہور کا یہ منشا ہے جشن عشرت ہو غم نصیبوں میں
کچھ فضا آج بعنوان دیگر بدلی ہے پھول تو پھول ہیں کانٹوں کی نظر بدلی ہے
آج پھر ہے اسی ڈوبے ہوئے سورج کی نمود ہم یہ سمجھے تھے کہ تقدیر سحر بدلی ہے
تم پھول سہی تابِ خزاں لا نہیں سکتے کانٹے ہیں مگر عظمت گلزار ہمیں ہیں
تم بلا توش ہو بارِ سرِ میخانہ نہیں پھینک دو جام کہ ساقی کی نظر بدلی ہے

نئی نئی خوبصورت طبعزاد اور غیر طبع زاد زمینوں میں جوہر کی خالص جمالیاتی اور متغزلانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی غزلیں ندرت خیال اور جدت اسلوب کا حسین اور معنی خیز امتزاج پیش کرتی ہیں۔ یہاں غم جاناں اور غمِ دوراں مخلوط نظر آتے ہیں۔

پائی نہیں ہے سایۂ گیسو کی حد ہنوز
سنجیدہ ہوسکا نہ مزاجِ خرد ہنوز

کب سے ملی ہے مجھ سے نگاہِ صنم مگر
ہے برہمن کو حوصلۂ رد و کد ہنوز
اب تو انھیں بھی تاب تبسم نہیں رہی
عرضِ غمِ حیات ہے کیوں مسترد ہنوز

کیسے بتائے پھولوں کو یہ بے زبان اوس
پڑتی ہے قہقہوں پہ اُداسی کی زد ہنوز
مجھ کو تو گھر لٹائے زمانہ ہوا مگر
دنیا لٹارہی ہے متاعِ حسد ہنوز
نذرِ کرم تبسم شکرانہ کیا کروں
بربادیاں ہیں حُسن وفا کی سند ہنوز

☆..........☆

کیا ہے کب کوئی شکوہ حقیقتاً میں نے
سلام کردیا ساقی کو عادتاً میں نے
نگاہ ملتے ہی شکرانہ بن گیا ہر لفظ
شروع میں بات تو کی تھی شکایتاً میں نے
غضب خدا کا وہ کہتے ہیں کورفہم مجھے
دیا جواب نہ جن کا مروتاً میں نے

☆..........☆

باتوں باتوں میں وہ اس طرح سے روٹھا ہے کہ بس
دل پہ وہ یورش آلام تمنا ہے کہ بس
تلخی درد بھی شامل تھی ہنسی میں لیکن
حوصلہ یوں غمِ حالات کا ٹوٹا ہے کہ بس
ٹھوکریں بھی جہاں کل ہم کو دکھاتی تھیں چراغ
آج ان راہوں میں اس درجہ اندھیرا ہے کہ بس

نارسائی پہ یہ عالم ہے مری آہوں کا
نگہ حسنِ تغافل کا اشارہ ہے کہ بس
پوچھتے رہ گئے فتنے مرے ساقی کا مزاج
لغزشوں نے مجھے اس طرح سنبھالا ہے کہ بس
کیوں نہ اٹھ جائے غمِ عشق کے چہرے سے نقاب
اتنا واضح غمِ ہستی کا اشارا ہے کہ بس
میں ہی کیا آج قیامت بھی ہے افسردہ نگاہ
سامنے فتنۂ دوراں کا وہ نقشا ہے کہ بس
پیر میخانہ سمجھنے لگے مے نوش مجھے
میں نے یوں توبہ کو شیشے میں اتارا ہے کہ بس
ڈگمگانے لگا ہمت کا سفینہ جوہرؔ
ایسا طوفان کنارے ہی سے اٹھا ہے کہ بس

☆............☆

اپنی کج خرامی پر ہو کوئی پشیماں بھی
ہے یہاں ہر اک ٹھوکر خضرِ راہِ جاناں بھی
حُسن دل کو چاہا تھا ہم نے دیکھنا لیکن
بن سکا نہ آئینہ ان کا روئے تاباں بھی
ہائے برہمی ان کی ہائے خامشی میری
فتنہ ساز ہے کتنی احتیاطِ ارماں بھی

پوچھیے ذرا جاکر بوئے گل کے محرم سے
ہے خزاں کا ہر جھونکا گلستاں بداماں بھی
مجھ کو غم کی رسوائی کچھ گراں نہیں لیکن
چارہ گر نہ لے ڈوبے آبروئے داماں بھی
آگیا ہمیں جینا دل شکن اندھیروں میں
رہ گیا ہمارے شرشام غم کا احساں بھی
شام ہجر تو جوہر ہوگئی حسیں لیکن
آنسوں کے سر آئی تہمتِ چراغاں بھی

☆..........☆

آشنا نکلے رہِ غم میں جو انجان ملے
ہمسفر کتنے ہی بپھرے طوفان ملے
کچھ فرشتے نظر آئے کئی شیطان ملے
اس تجسس میں چلے تھے کوئی انسان ملے
آج غیروں میں ہم آئے ہیں بایں حُسن خیال
دل کو سمجھانے کا شاید کوئی عنوان ملے
ایک ٹھوکر کو سمجھ بیٹھے جنوں کی منزل
راہِ ہستی میں مجھے ایسے بھی نادان ملے
مجھ کو یہ فکر کہ دھڑکن دل یزداں کی سنوں
تم کو حسرت کہ تمہیں خلد کا ایوان ملے

رب کے ملزم کو سمجھتے ہو تم اپنا ملزم
ہم دعا گو ہیں کہ واعظ تمھیں ایمان ملے

☆………☆

جو ویرانے پہ گذری ہے کسی گلشن پہ کیوں گزرے
جو غم میں نے اُٹھایا ہے میرے دشمن پہ کیوں گزرے
خدائے عشق رکھے آبرو حُسن تغافل کی
گریباں کی قیامت آپ کے دامن پہ کیوں گزرے
بھلا کیا تابِ حسرت لائیں گے در پردہ نظارے
نگاہِ شوق کا عالم تری چلمن پہ کیوں گزرے
وقارِ عشق کا معیار تھی موسیٰ کی ضد ورنہ
حریم دل کا فتنہ وادیٔ ایمن پہ کیوں گزرے

جوہرؔ صدیقی کی غزل اس لحاظ سے بھی امتیاز رکھتی ہے کہ اُنھیں سیدھی سادی باتوں کو بھی تشبیہ اور استعارے کے پیرائے میں بیان کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔ یہ اندازِ بیان ان کی غزلیات کو بھی جدت اور تازگی بخشتا ہے اور ان کے دلکش رومانی قطعات کو بھی۔ ان کی زبان کا ماحول کلاسکی بھی ہے اور جدید بھی۔ اساتذہ کی زمینوں میں ان کا کلام محض مشاعرے کی ضروریات کو سامنے رکھ کر نہیں لکھا گیا۔ غالبؔ کی زمین میں شعر کہتے وقت انھیں یہ احساس بھی رہتا ہے کہ یہ چیز فقط غالبؔ کا منہ چڑانے کے لیے نہیں لکھی جا رہی۔ ایسے مقامات پر جوہرؔ صرف شاعرانہ مشق سے کام نہیں لیتے اگر مزاج مصرع طرح کی فضا اسے ہم آہنگ ہو جائے اور دل حوادث روزگار اور رخِ یار کا عکس منعکس کرنے کے موڈ میں ہو تو جوہرؔ کی غزل سوز و ساز اور حیات

وکائنات کی مختلف کیفیتوں کی تصویر بن کر سننے والے کے شعور کے افق پر انوکھی ادا سے جلوہ گر ہوگی۔

ہے چمن اک نگہہ برق و شرر ہونے تک
دیکھیے کیا ہو کلی کے گل تر ہونے تک

کس سے پوچھیں گے وہ عالم مری بیتابی کا
ڈوب جائیں گے ستارے بھی سحر ہونے تک

کوئی کانٹا کسی دامن سے نہ اُلجھا اے دوست
تیرے دیوانے کا صحرا میں گذر ہونے تک

آج تک داغِ دل لالۂ گیتی نہ گیا
جانے کیا گزری ہے مٹی پہ بشر ہونے تک

اتنا دشوار نہ تھا مرحلۂ وحشت دل
سایۂ زلف میں اک لمحہ بسر ہونے تک

جنبش پردہ سے پیدا ہوئیں لہریں کیا کیا
جذبۂ دل کے گنہگارِ نظر ہونے تک

ان کے دامن پہ یہی حرمتِ غم تھے لیکن
اشک پانی ہوئے دامن مرا تر ہونے تک

اے غمِ دوست تری ہمسفری کی سوگند
منزلیں گزری ہیں اک گام سفر ہونے تک

شمعِ محفل کا دھواں ڈھونڈے ہے ان کو جوہر
کاش پروانے ٹھہر سکتے سحر ہونے تک

سیاست میں عملی طور پر حصہ لینے کے باعث جوہرؔ بعض اوقات سیاسی غزلیں بھی کہتے ہیں اس قسم کی مسلسل نظم نما غزلوں میں وہ طنز و ظرافت کے پردے میں ملک کے سیاسی ماحول کا خندہ آور تجزیہ بھی پیش کرتے جاتے ہیں۔ ایسی چیزوں میں ضیافت طبع کا سامان موجود ہے۔

اپنی خود ساختہ آفات پہ رونا آیا
کہیے کس منہ سے کہ کس بات پہ رونا آیا
رہزنی آج بعنوان نگہبانی ہے
رہبروں کی گزر اوقات پہ رونا آیا
قحطِ یک جہتی ہے اس دیش کی قسمت شاید
انتشارِ نظریات پہ رونا آیا
کانگریس نے کچھ اس انداز سے کروٹ بدلی
دیش بھگتی کی روایات پہ رونا آیا
اٹھتی جاتی ہے زمانے سے تمیز بد و نیک
کمیونسٹوں کی مساوات پہ رونا آیا
”ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق“
سوشلسٹوں کی حکایات پہ رونا آیا
نام جن سنگھ ہے جن کشٹ کے منصوبے ہیں
اس نفی کاریٔ اثبات پہ رونا آیا
لیگ کا لاشۂ بے روح بھی ہے گرم خرام
اس سیاست کے طلسمات پہ رونا آیا

فکر سنجیدہ سے محروم ہے دامانِ سوتنتر
آپ کی شورشِ جذبات پہ رونا آیا
شانتی کے لیے لازم ہے تشدد کا عروج
آر. ایس. ایس. کے خیالات پہ رونا آیا
ارتقا شاہدِ رجعت سے گلے ملتا ہے
سازشِ جلوہ و ظلمات پہ رونا آیا
ہائے اس ملک میں یہ فرقہ پرستی کا ہجوم
سیکولرازم کی سوغات پہ رونا آیا
کچھ سوالات جو ہنس ہنس کے کیے تھے ہم نے
ان سوالوں کے جوابات پہ رونا آیا
کر کے نہروں پر بھروسہ ہے دعا بارش کی
جوہؔر اس طرزِ مناجات پہ رونا آیا

زمانے کی بات جوہؔر نے غزل سے زیادہ نظم میں بیان کی ہے۔ سپاٹ واقعہ نگاری کی بجائے یہاں بھی انھوں نے رمز و کنایہ کے لباس میں اپنا مافی الضمیر ادا کیا ہے۔ وہ جدید ہندوستانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوے اشاروں اشاروں میں علل و نتائج بھی ظاہر کرتے جاتے ہیں۔ اگر چہ ان کا سیاسی شعور اتنا پختہ دکھائی نہیں دیتا کہ وہ کھل کر کسی خاص نتیجے پر پہنچ سکیں تاہم یہ شعور ان کی باتوں کو موثر ضرور بنا دیتا ہے۔ اس قسم کی نظموں میں ''نہ چھیڑ میرے ہم نشین''۔ ان کی نمائندہ نظم ہے۔ شاعر اپنے ماحول سے آسودہ نہیں ہے۔ اس کے

باوجود اس کے لہجے میں تلخی اور تھکن کا احساس نہیں ہے۔

ابھی مذاقِ عاشقی ستم کا ناسپاس ہے
ابھی شعور زندگی بنام غم اداس ہے
ابھی تو ذوق بندگی کو جنتوں کی آس ہے
ابھی دلوں کی انجمن خلوص ناشناس ہے
ابھی نشاطِ درد سے زمانہ آشنا نہیں
ابھی فسانۂ طرب نہ چھیڑ میرے ہم نشیں
گلوں میں ہیں یہ سازشیں کہ خار ہوں چمن بدر
ہیں بلبلوں میں تذکرے جلادیں باغباں کا گھر
ہے باغباں کی ضد مگر کہ ہو نہ کوئی شکوہ گر
انہی کشاکشوں میں ہے بہار ابھی خزاں اثر
ابھی متاعِ رنگ و بو لُٹی ہے ہر کہیں
ابھی فسانۂ طرب نہ چھیڑ میرے ہم نشیں
یہ شام یہ میکدہ زمیں پہ خلد کا نشاں
فروغ آفتاب خود اسیر جام ہے یہاں
مگر ہے پھر بھی ظلمت حیات کا عجب سماں
ہر اک طرف چھڑی ہوئی ہے بیش وکم کی داستاں
ابھی ہیں اپنی لغزشیں ہی میکشوں کی نکتہ چیں
ابھی فسانۂ طرب نہ چھیڑ میرے ہم نشیں

یہ یادگارِ حسن بھی عجیب تر عجیب ہے
جو خوش نصیب آ گیا یہاں وہ بدنصیب ہے
جو کائنات کی ہر ایک چیز سے نجیب ہے
یہاں حقیر دو جہاں وہی دلِ غریب ہے
ابھی ہے سنگ آستاں حریف عظمت جبیں
ابھی فسانۂ طرب نہ چھیڑ میرے ہم نشیں

ہیں واعظانِ حق بیاں کہ قصہ گوئے ماوتو
نہ حسن فکر ہی رہا نہ احتیاطِ گفتگو
رگوں میں سرد ہوگا یقین و علم کا لہو
عجیب مشکلوں میں ہے دل ونظر کی آبرو
ابھی نفاق آفریں ہے مدرسوں کی سرزمیں
ابھی فسانۂ طرب نہ چھیڑ میرے ہم نشیں

جناب برہمن کی بھی ہے کیا ہی طرف تر ادا
جو سنگ سے کرے وفا وہ آدمی کا بے وفا
اک ایسے بت کدہ کی بھی کسی طرح پڑے بنا
جہاں صنم کے روپ میں محبتیں ہوں رونما
ابھی تو اس دیار میں وہ بت تراش ہی نہیں
ابھی فسانۂ طرب نہ چھیڑ میرے ہم نشیں

یہ شاعران خوش نوا ادب نواز انجمن
ہزار کے شمار میں ہے ایک نکتہ دانِ فن

لگی ہوئی ہے بھیڑ سی ہے نام محفل سخن
خروشِ زندگی ہے گم بہ شورِ ذکر سیم تن
ابھی جنوں کے دل میں آگہی دھڑکنیں نہیں
ابھی فسانۂ طرب نہ چھیڑ میرے ہم نشیں

جوہؔر نے قطعات میں بھی اکثر پتے کی باتیں کہی ہیں۔ کچھ کہنے کو ہو تو جوہؔر قلم اٹھاتے ہیں۔ اسی لیے ان کے کلام میں پڑھنے والے کو مضمون پیدا نہیں کرنا پڑتے۔ ان کے قطعات میں زندگی بھی ہے اور زندگی کی رعنائیاں بھی۔ رومانی اور جمالیاتی رنگ میں ڈوبے ہوئے ان قطعات میں لفظی حسن بھی ہے اور معنوی خوبیاں بھی ہیں۔

جہد پیہم سے بات بنتی ہے　　زندگی کیا یونہی مزا دے گی
غمِ دوراں سے بھاگنے والے　　زلفِ جاناں اسیر کر لے گی

☆..........☆

ازل ہی میں گنوا بیٹھے تھے تمیز سکوں دونوں
خراب شوخیٔ یک جلوہ ہیں عقل و جنوں دونوں
عروجِ فکر خسرو ہو کہ اوجِ جرأت تیشہ
حضورِ آرزو دیکھے گئے ہیں سرنگوں دونوں

☆..........☆

اللہ رے آستان مغاں کی کرامتیں
واعظ بھی آ گیا تو یہاں آدمی ہوا
بزم مے خلوص کا عالم نہ پوچھیے
جو بھی شریکِ جام ہوا جنتی ہوا

☆..........☆

وجدان کے گلزار میں پھیلی ہوئی خوشبو
احساس کی وادی میں فسونِ رمِ آہو
تخیل بنا پائی نہ اب تک تری تصویر
اے رونقِ دل تو ہی بتا دے کہ ہے کیا تو

☆..........☆

بتاؤ ساتھ بھی دے گی یہ مے فروش نظر
ہمارا کام ہی کیا ہم تو صبح و شام پئیں
ہمارے سامنے بیٹھو اور اپنے ہاتھ سے دو
یہ بات کیا ہے کہ لے کر تمہارا نام پئیں

☆..........☆

بہشت آفریں زلفوں کے سائے جس پہ نثار　　وہ دھوپ درد کی میرے دلِ تباہ میں ہے
کئی حسینوں کی دلکش جوانیوں کا نچوڑ　　بنامِ مستیٔ صہبا میری نگاہ میں ہے

☆..........☆

جس کو کہتے ہیں اہل فن سرقہ　　ہے مقدر تلامذہ کے لیے
اور توارد کی اصطلاح بلیغ　　ایک تمغہ اساتذہ کے لیے

☆..........☆

جوؔہر بنارس کے مقبول شعرا میں سے ہیں۔ میلادالنبیؐ کا جلسہ ہو یا شام غالبؔ ہر جگہ اہل بنارس کی ایک کثیر تعداد ان کا کلام سننے کی مشتاق رہتی ہے۔ ان کے مشکل سے مشکل شعر پر بھی محفل میں سناٹا نہیں ہو جاتا۔ ان کے مداحوں کو یقین ہے کہ جوؔہر اپنے شعر میں عامیانہ باتیں

نہیں کہتے اور یہ بات ٹھیک بھی ہے۔ جوؔہر کی مقبولیت کا باعث ان کا تخلیقی جوہر ہے۔ فکر و خلوص نے ان کی شاعری کو خلوص فکر بخشا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود میری رائے میں ان کی شاعری ابھی تجرباتی دور سے گزر رہی ہے۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں رومانی، غنائی اور فکری تجربوں سے اپنے کلام کو متنوع ضرور بنالیا ہے لیکن ابھی ان کی شان سخنوری انھیں اس منزل پر نہیں لائی جہاں اہل سخن کا لب ولہجہ ایک مستقل منفرد صورت اختیار کرلیتا ہے۔ سیکڑوں تخلیقی مراحل طے کرنے کے بعد شاعر اس مقام سے نغمہ پرداز ہوتا ہے۔ جہاں اس کی قوت ابلاغ اپنے افکار و مشاہدات کی مہک سے چشم زدن میں سننے والے کی روح کو تھکا دیتی ہے۔ اگر مسلسل ریاض اور سازگار ادبی ماحول نے جوؔہر صاحب کو اِسی طرح شعری سرگرمیوں میں مشغول رکھا تو یہ منزل بہت دور نہیں ہے۔

ختم شد